خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اکیسویں صدی کا منفرد ماہنامہ

ردا ڈائجسٹ

FEBRUARY
2016

ماڈل: ماریہ رضوی
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی: موسیٰ رضا

انٹرویو

سلسلے وار ناول

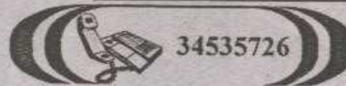
مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

فروری 2016ء
جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 2
قیمت 60 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
720 روپے



مستقل سلسلے







قارئین! آپ سب کا بے حد شکریہ۔ سال نو نمبر پر ردا کی پذیرائی اچھی لگی۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں سال کے آغاز میں ہمت و توانائی عطا کر دی ہے۔ فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہو گا تب جنوری کی ہواؤں کا زور ٹوٹ چکا ہو گا۔ ٹوٹنے اور جوڑنے کا عمل صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے لمحوں کے فیصلے زندگی کے فاصلے کبھی کم اور کبھی اتنے طویل ہوتے ہیں کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا اس آنے والے کل کا جس کا ہمیں ادراک نہیں۔

قارئین! فروری موسم بہار کا آغاز زندگی کی وہی رفتار، کبھی ہم کبھی تم، خوب صورت لمحوں کے سائے زندگی کی یہ ادا من کو بھائی، وقت کی آنکھ مچولی، خوب صورت لمحوں کا ساتھ۔ رب کائنات کی ٹھنڈی ٹھنڈی بارشیں اور سرد ہواؤں کے جھونکے پورے ملک کو حسین بنا رہے ہیں۔ وہیں تھر کی بیماریوں پر آنکھیں بند نہیں ہو سکتیں۔ یہ نرم اور گرم جھونکے زندگی کے ساتھ ساتھ موسم بہار میں زندگی خوشگوار لگتی ہے وہیں کہیں گرم لہریں ہمیں سرد کر دیتی ہیں۔ زندگی رب کائنات میں یکساں رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر عمل پر ہم بے بس اور وہ بااختیار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا یا ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک یک ذرے کا عمل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ اس ذات باری تعالیٰ کو ڈھونڈیں یا قریب جائیں اتنے ہی اس کے قرب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ وہی ایک راز ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ فروری میں آپ سرد ہواؤں سے محفوظ رہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔ اپنا خیال رکھیے سندیسہ ضرور لکھیے۔ تو اس ماہ کا ردا آپ کو کیسا لگا، سندیسہ ضرور لکھیے۔ نئے لکھنے والے ردا کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیے اپنی تحاریر اس امید کے ساتھ بھیجیں کہ ہم انہیں موقع ضرور دیں گے۔

آپی



مریض کی بیمار پرسی اور بیماری کے ثواب کا بیان

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان کسی مسلمان کی صبح کے وقت بیمار پرسی کرتا ہے اس کے حق میں شام تک 70 ہزار فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کے وقت بیمار پرسی کرتا ہے تو صبح تک اس کے حق میں فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں اور جنت میں اس کے لیے باغ (تیار کر دیا جاتا) ہے۔'' (ترمذی، ابو داؤد، عن علیؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان کسی مسلمان کی بیمار پرسی کرتا ہے اور 7 بار یہ دعا پڑھتا ہے:

اَسْاَلُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَنْ یَّشْفِیَکَ

(ترجمہ) ''میں اللہ عظمت والے سے سوال کرتا ہوں جو عرش عظیم کا رب ہے کہ وہ آپ کو شفا عطا فرمائے۔'' اگر اس کی موت کا وقت نہ آ پہنچا ہو تو اس مریض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ (ابو داؤد، ترمذی، عن عبداللہ بن عباسؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بیمار پرسی کے لیے جاؤ تو بیمار کے پاس یہ دعا پڑھو:

اَللّٰھُمَّ اشْفِ عَبْدَکَ

(ترجمہ) ''اے اللہ اپنے بندے کو شفا عطا فرمائیے۔'' (ابو داؤد۔ عن عبداللہ بن عمروؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے والے شہید کے علاوہ شہادت کی موت 7 قسم کی ہوتی ہے۔ (1) طاعون سے مرنے والا۔ (2) پانی میں ڈوب کر مرنے والا۔ (3) پہلو کے درد میں مرنے والا۔ (4) پیٹ کی بیماری میں مرنے والا۔ (5) کسی چیز کے نیچے دب کر مرنے والا۔ (6) آگ میں جل کر مرنے والا۔ (7) بچہ جنتے وقت فوت ہونے والی عورت۔'' (ابو داؤد، نسائی، عن جابر بن عتیکؓ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ''سب سے زیادہ آزمائشوں سے دوچار ہونے والے کون لوگ ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انبیاء ہیں۔ ان کے بعد فضیلت والے لوگ ہیں پس صاحب فضیلت لوگوں میں سے ہر آدمی کو اس کے ایمان کے لحاظ سے آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اگر وہ دین (کے امور) میں سخت (پابند) ہے تو اس کے لیے آزمائش بھی سخت ہے اور اگر وہ دین کے (امور) میں کمزور ہے تو اس کے لیے آزمائش بھی معمولی ہے۔ اسی طرح وہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ گناہوں سے پاک ہو کر زمین پر چلنے پھرنے لگتا ہے۔'' (ترمذی، ابن ماجہ، عن سعدؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ اپنے (نیک) بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنے (گناہ گار) بندہ کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا کو اس سے دور رکھتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے اس کے گناہوں کا بدلہ ملے گا۔'' (ترمذی، عن انسؓ)

(وضاحت: اس لیے بیماری، نقصان، خوف اور غربت سے گھبرانا نہیں چاہیے)۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کثرت ثواب کا تعلق مصائب کی سختی سے ہے۔ بلاشبہ اللہ عزوجل جب کسی جماعت کو محبوب جانتے ہیں تو اسے آزمائشوں میں ڈالتے ہیں پس جو آدمی آزمائش پر راضی رہے اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور جس آدمی نے رونے پیٹنے کا اظہار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہوتی ہے۔'' (ترمذی، ابن ماجہ، عن انسؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن مرد اور مومنہ عورت کے جسم اس کے مال اور اس کی اولاد پر مسلسل مصائب نازل ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کی ملاقات اللہ سے ہوتی ہے تو وہ گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔'' (ترمذی، عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیمار کی عیادت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس سے) فرمایا: ''خوش ہو جاؤ۔'' اس لیے کہ اللہ کا فرمان ہے: ''بخار میری آگ ہے میں دنیا میں اپنے مومن بندہ کو اس میں مبتلا کرتا ہوں تا کہ قیامت کے دن یہ اس کے لیے جہنم کا بدلہ ہو جائے۔'' (احمد، ابن ماجہ، بیہقی، عن ابی ہریرہؓ)

ایک آدمی جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوا، مدینہ میں ہی فوت ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد فرمایا: ''کاش، یہ پیدائش کی جگہ کے سوا کسی اور مقام میں فوت ہوتا۔'' صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس لیے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی آدمی جب پیدا ہونے کے مقام کے علاوہ کسی دوسرے مقام میں فوت ہوتا ہے تو اس کے پیدا ہونے کے مقام سے لے کر اس کی موت کی جگہ تک کے برابر اس کو جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔'' (نسائی، ابن ماجہ، عن عبداللہ بن عمروؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''شہداء اور (طویل بیماری کی وجہ سے) بستر پر فوت ہونے والے ان لوگوں کے بارے میں اپنے رب عزوجل سے جھگڑیں گے جو طاعون (کی بیماری) سے فوت ہوئے۔ شہداء کہیں گے کہ (یہ) ہمارے ساتھی ہیں جیسے ہم قتل ہوئے (یہ بھی) قتل ہوئے (جبکہ) بستر پر فوت ہونے والے کہیں گے یہ ہمارے بھائی ہیں جیسے ہم فوت ہوئے یہ بھی بستر پر فوت ہوئے۔ ہمارا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے زخم دیکھو اگر ان کے زخم مقتولوں کے زخموں کے مشابہ ہیں تو یہ ان میں سے ہیں اور ان کے ساتھی ہیں۔ جب دیکھا جائے گا تو ان کے زخم شہداء کے زخموں کے مشابہ ہوں گے۔'' (احمد، نسائی، عن عرباض بن ساریہؓ)

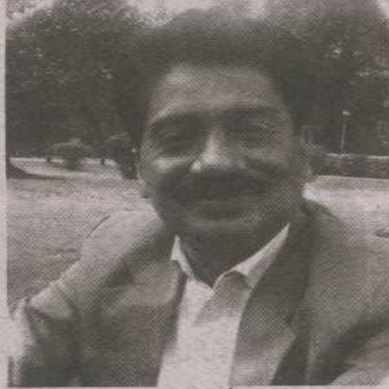
......☆......

انٹرویو: نگہت اکرم

ملاقات

ایف ایم 100 کے معروف پریزنٹر

سعید واثق



رات کی تاریکی جب دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہوتی ہے تو ایف ایم 100 لاہور سے سعید واثق اپنے خوب صورت اور منفرد انداز سے اپنی محفل کا آغاز کرتے ہیں۔ جس میں شاعری گیت ہوتے ہیں۔ سعید واثق کا یہ خوب صورت انداز لسنرز کو بے حد پسند ہے۔ راتوں کو جاگنے والے ان کے شوز کا انتظار کرتے ہیں۔ تقریباً 16 سال سے ایف ایم 100 پر غزل ٹائم کر رہے ہیں۔

سعید واثق بطور شاعر بھی نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہیں ان کے 5 شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سعید واثق سے خصوصی ملاقات روداڈائجسٹ کے قارئین کے لیے۔

☆ السلام علیکم، سعید واثق کیسے ہیں؟

❀ وعلیکم السلام، میں خیریت سے ہوں۔

☆ ایف ایم میں کس نام سے منسلک ہیں۔

❀ سعید واثق کے نام سے۔

☆ ایف ایم پر کس نے متعارف کروایا؟

❀ متعارف کسی نے نہیں کروایا۔ اپنے ہی تو تعلقات تھے شوکت اقبال صاحب ہوتے تھے اس وقت ان سے تعلق تھا انہوں نے ایڈریس دیا اور ایف ایم کا آڈیشن دیا۔

☆ آپ نے آڈیشن میں کیا پڑھا؟

❀ شاعری کا پروگرام تھا۔ اپنی غزل ''کہاں ہوتے ہو'' پیش کی۔

☆ ایف ایم پر پروگرام کرنا شوق تھا؟

❀ ایف ایم پر پروگرام کرنا شوق نہیں جنون ہے۔ روح کو تسکین ملتی ہے۔

☆ پہلا پروگرام کون سا تھا اور کہاں سے کیا؟

❀ پہلا پروگرام غزل ٹائم تھا 30 مئی 1999ء میں کیا۔

☆ آج کل کون سے شوز کر رہے ہیں؟

❀ آج کل ایف ایم 100 سے رات کے شوز کرتا ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں ایک پریزنٹر دوسرے پریزنٹر کی نقل کرتا ہے؟

❀ بہت سے لوگ کرتے ہیں نقل، آئیڈیاز لیتے ہیں تو پھر اسی طرح کرتے ہیں۔ اچھا پریزنٹر تو وہ ہے جو اپنے اسٹائل میں پروگرام کرتا ہے نقل اتارنے کا۔ ہر کسی کی اپنی ہی شناخت ہوتی ہے۔

☆کس ساتھی پریزینٹر کے ساتھ شو کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے؟
✤کمبائنڈ سبھی کے ساتھ مزہ آتا ہے۔ سب بہت اچھے ہیں۔ شو میں ایک دوسرے کے ذہنی سطح پر آجاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ کس طرح بات آگے بڑھانی ہے۔
☆جب پہلا پروگرام کیا تو کیا کیفیت تھی؟
✤پریشان نہیں تھا۔ عمدہ طریقے سے کیا۔
☆لسنرز کی طرف سے آپ کے پروگرام کا کیسا فیڈ بیک ملتا ہے؟
✤بہت اچھا۔ 17 سال سے اچھا فیڈ بیک نہ ملتا، اتنا پیار نہ ملتا تو میں یہ پروگرام نہیں کر سکتا تھا۔ آج کل تو یہ دور آگیا ہے کہ اتنے زیادہ ایف ایم چینل آگئے۔ اچھا پروگرام ہو تو لوگ پسند کرتے ہیں اور پسند کرنے کے لیے غزلوں اور گیتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ رات کو جاگنے والے لوگوں کی اپنی ہی پسند ہوتی ہے۔ اس میں میوزک کا بہت عمل دخل ہے۔ ہر ایک کی پسند کا میوزک ہو ہائی لیول پر جا کر بات کرنی پڑتی ہے۔
☆کیا کبھی ایسا ہوا پروگرام کرتے ہوئے نیند آگئی ہو؟
✤کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جتنا زیادہ فریش ہوتا ہوں اتنا ہی زیادہ فٹ ہو جاتا ہوں۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ نیند آنے کی بجائے نیند اڑ جاتی ہے۔
☆کیسا میوزک پسند ہے؟
✤میڈیم نور جہاں، لتا کے سونگ یا پھر موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔
☆پروگرام کی بہتری کے لیے کیا کرتے ہیں؟
✤بہت زیادہ پڑھتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ علم، نئے لوگوں کی پسند، اب اور 15 سال پہلے کا دور چینج ہو گیا۔ میڈیا بھی چینج ہو گیا ہے۔ پروگرام کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔
☆فیملی کے بارے میں بتائیں؟
✤والد، سسٹر، بیگم، بیٹا۔
☆چاندنی راتیں کیا پیغام دیتی ہیں؟
✤انسان کو اچھی امید رکھنی چاہیے۔ اندھیری رات کے بعد روشنی بھی آتی ہے۔
☆مزاجاً کیسے ہیں؟
✤دھیمے مزاج کا ہوں۔
☆وہ لمحہ جس نے قوس قزح کے رنگ بکھیر دیئے؟
✤میرے بیٹے عبداللہ کی پیدائش کا دن۔
☆جب بارش برستی ہے؟
✤سوتے ہوئے اٹھ جاتا ہوں کہ آج بارش ہے۔
☆غصہ آئے تو کیا کرتے ہیں؟
✤صبر کرتا ہوں۔
☆کیا اچھا لگتا ہے دن یا رات؟
✤میرے حصے میں رات آتی ہے۔
☆دوستوں کو SMS کرنا اچھا لگتا ہے یا فون کال کرنا؟
✤مجھے فون کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔
☆جب بور ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟
✤کوئی نہ کوئی کام یا پھر شاعری کرتا ہوں۔
☆کیا کبھی ایسا ہوا کہ پروگرام نہ کرنے کو دل چاہ رہا ہو لیکن پروگرام کیا؟
✤ایسا بہت کم ہوا لیکن تھکاوٹ، طوفانی بارش میں بھی نہیں رکتا، چلا جاتا ہوں پروگرام کرنے۔
☆وہ کون سے لسنرز ہیں جو آپ کے پروگرام میں نہ آئیں تو آپ پریشان ہو جاتے ہیں؟
✤کوئی اسپیشل لوگ نہیں ہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔
☆بچپن کیسا گزرا؟ بچپن کی کوئی یاد؟
✤میں بچپن میں شرارتیں خوب کیا کرتا تھا لیکن پڑھائی بھی بہت کرتا تھا۔
☆زندگی کے بارے میں آپ کی رائے؟
✤ہر لمحہ امتحان، ہر لمحہ آزمائش۔

☆کیا پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں؟
✤محبت تو نام ہی پہلی نظر میں کسی پر مرمٹنے کا ہے تاہم انجام الگ بات ہے۔
☆سیرت سے متاثر ہوتے ہیں یا صورت سے؟
✤پہلے صورت سے اگر سیرت بھی اچھی ہو تو تعلق قائم ہو جاتا ہے۔
☆کوئی ایسی عادت جو آپ کے دوستوں اور گھر والوں کو ناپسند ہے؟
✤میں من موجی ہوں اس وجہ سے بعض اوقات دوست احباب ناراض ہو جاتے ہیں۔
☆قسمت یا کوشش پر بھروسا کرتے ہیں؟
✤میں ہر کام اللہ پر کامل یقین کے ساتھ کرتا ہوں۔ کوشش ایک لازمی امر ہے کامیابی، ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو قسمت کہتے ہیں۔
☆آپ کی کتنی کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کے نام؟
✤میری اب تک 5 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (1) کہاں ہوتے ہو (2) سب بھول چکا (3) تمہارا عکس ہوں (4) دل میں تم رہتے ہو (5) ہر طرف محبت ہے۔ کلیات واثق میں پہلی چار کتابیں ایک ساتھ دستیاب ہیں۔
☆آپ کی سالگرہ کا دن، سالگرہ یاد رکھتے ہیں؟
✤بالکل یاد رہتی ہے۔ یکم اپریل جو ہوئی اور دھوم دھام سے مناتا بھی ہوں۔
☆حقیقت پسند ہیں یا خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں؟
✤صورت حال پر منحصر ہے ہر وقت خیالات میں تو نہیں رہتا لیکن خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے۔
☆لوگ آپ کو چاہتے ہیں، یہ احساس کیسا لگتا ہے؟
✤یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ میں انتہائی عاجز سا بندہ ہوں پیار اور چاہت ملنے پر زیادہ جھک جاتا ہوں۔
☆کیا راستے کی دشواریاں کامیابی کی دلیل ہوتی ہیں؟
✤ہمارا تو ایمان ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ مشکلات کے بغیر کامیابی کا تصور ہی ممکن نہیں۔
☆ریڈیو کی اہمیت کے بارے میں کیا کہیں گے؟
✤ایف ایم ریڈیو کی لسنرز شپ زیادہ ہو گئی ہے۔ ایف ایم پر بھی اب نیوز اپ ڈیٹ میوزک نئے پرانے گلوکار نئے گلوکاروں کو ایف ایم چینل بہت زیادہ پروموٹ کرتے ہیں۔
☆اسٹاف کے ساتھ آپ کا رویہ؟
✤بہت زیادہ اچھا ہے۔ سب لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اعتماد کرتے ہیں ایک دوسرے پر۔
☆کوئی ایسی شخصیت جو بہت یاد آئے؟
✤ماں باپ۔
☆دل پسند منظر؟
✤بادل چھائے ہوئے ہوں، بارش ہو رہی ہو۔
☆پاکستان کے لوگوں کے بارے میں آپ کی رائے؟
✤بہت اچھے ہیں، محنتی ہیں، جس کو موقع ملتا ہے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔
☆جو لوگ ریڈیو کی فیلڈ میں آنا چاہیں ان کے نام پیغام؟
✤ان کو یہ کہنا چاہوں گا کہ پہلے تو آپ سنیے، دیکھیں پھر اس فیلڈ میں آئیں۔ اپنی تعلیم مکمل کریں اور یہ بھی ہو کہ وہ اپنے آپ کو شناخت کر سکتا ہو۔ بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔
☆آپ شاعری بھی کرتے ہیں آپ کا پہلا شعر کون سا تھا؟
✤میرا پہلا شعر

جو شخص مری آنکھ کی پتلی میں چھپا تھا
میں شہر کی گلیوں میں اسے ڈھونڈ رہا تھا

☆دولت، محبت، شہرت، صحت ان چاروں میں سے آپ کا انتخاب؟
✤صحت اور محبت ہو تو تمام باقی چیزیں خود بخود دل

جاتی ہیں۔

☆ پسندیدہ ملک کون سا ہے؟

● پاکستان۔

☆ پسندیدہ خوشبو؟

● گلاب کی خوشبو۔

☆ پسندیدہ لباس؟

● شلوار قمیص۔

☆ چھپی ہوئی خواہش؟

● لیاری میں بہت بڑا اسپتال بنا سکوں۔

☆ رداڈائجسٹ کے بارے میں آپ کی رائے؟

● رداڈائجسٹ کے بارے میں یہی کہوں گا کہ سماجی معاشرتی لحاظ سے اچھا ڈائجسٹ ہے۔ اس میں ہر ایک کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی ترقی اور بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ قارئین کے نام کوئی پیغام؟

● زیادہ سے زیادہ اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔ جلدی فیصلہ نہ کریں۔ دوسروں کے کام آئیں اس سے پہلے کہ آپ کسی کے کام آنے کے قابل نہ رہیں۔

☆ اپنی شاعری سے کچھ اشعار؟

● تو مجھ کو جان سے پیارا ہے محبت خود بتا دے گی
کہ میرا عشق سچا ہے محبت خود بتا دے گی

☆

ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو

☆

اسی عشق سے اسی چاہ سے اسی پیار سے
میرے ہاتھ میں ایک گلاب دو میں بہت دنوں سے اداس ہوں

☆

ہجر میں خون رُلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
یاد آتی ہیں اکیلے میں تمہاری نیندیں
کس طرح خود کو سُلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوبِ نظر ہو کس کے
آجکل کس کو مناتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
شب کی تنہائی میں اکثر یہ خیال آتا ہے
اپنے دُکھ کس کو سناتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
سرد راتوں میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟
آگ سی دل میں لگاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
شہر کے لوگ بھی واثق یہی کرتے ہیں سوال
اب بہت کم نظر آتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟

☆

وہ ہمارا کہاں ہمارا تھا؟
جاں سے پیارا کہاں ہمارا تھا؟
وہ جو لگتا تھا آشنا ہم کو
وہ نظارہ کہاں ہمارا تھا؟
ہم اندھیروں میں بسنے والے لوگ!
شب کا تارا کہاں ہمارا تھا
ہاں! گزر تو گئی شب فرقت
پر گزارا کہاں ہمارا تھا؟
ناؤ اپنی جہاں اُتاری تھی
وہ کنارہ کہاں ہمارا تھا؟
ہم نے جانی یہ بات تیرے بعد
شہر سارا کہاں ہمارا تھا؟
تیری مرضی سے ہی یہ بہتا رہا
دِل کا دھارا کہاں ہمارا تھا؟
ہم ہی کچھ خوش گمان تھے واثق
ہر ستارہ کہاں ہمارا تھا؟

☆ بہت شکریہ سعید واثق آپ کا۔ آپ نے ردا ڈائجسٹ کے لیے ٹائم نکالا۔

● آپ کا بھی بہت شکریہ۔ رداڈائجسٹ کا بھی بہت شکریہ

☆......

افشاں علی

مکمل ناول

محبت ہوئی مہرباں

''یار! تجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جو تو سوچ رہا ہے وہ صحیح ہے؟'' آفاق نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے سوال کیا۔



''کیونکہ یہ واقعی صحیح ہے اور ایسا سوچنے پر مجھے اس کی حرکتوں اور باتوں نے ہی مجبور کیا ہے۔'' اس نے اضطراری انداز میں پہلو بدلتے ہوئے اپنی بات پر زور دیا۔

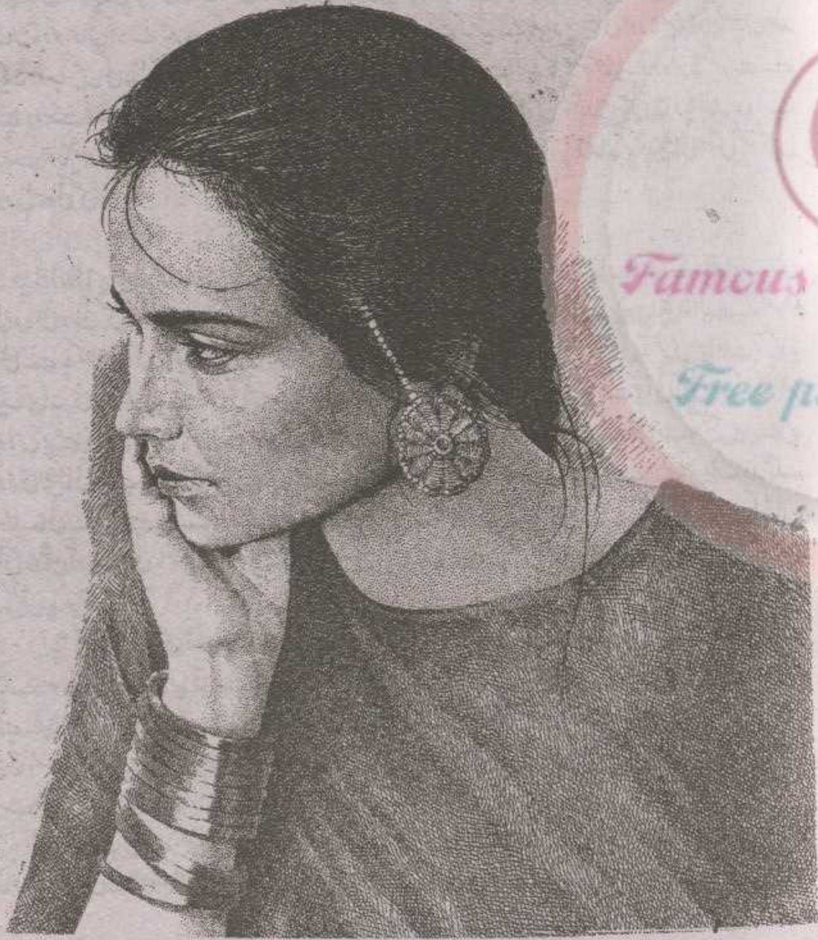
آفاق نے اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا جس کی پریشان آنکھیں اور پیشانی پر پھیلی تشویش کی لکیریں صاف ظاہر کرتی تھیں کہ گزشتہ کئی روز سے وہ مضطرب ہے۔

''انہیں کوئی پریشانی ہے؟'' آفاق نے اس الجھے بکھرے شخص سے دریافت کیا۔

''اچھی جاب، روپیہ پیسا گھر اور گھر کے تمام اختیارات اس کے حوالے ہیں۔ اس کے باوجود اس کا رویہ اس کی پریشانی سمجھ سے باہر ہے۔'' اس نے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔

''مثلاً کیسا رویہ؟'' آفاق نے استفسار کیا۔

''اس کا بیٹھے بٹھائے گم صم ہو جانا، پہروں خاموش یک ٹک غیر مرئی نقطے کو گھورتے رہنا، راتوں کو بے زبان رونا۔'' وہ متذبذب انداز میں سب بتانے لگا۔





''ہوں!'' آفاق نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔
''ہمارا بیتا ماضی ہمارے حال پر کافی گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ بعض اوقات بیتے ماضی کے گہرے اٹوٹ نشان ہمارے لاشعور میں کوئی گرہ سی باندھ دیتے ہیں پھر حال میں ملنے والی محبت، توجہ اور نشان کو مٹانے کا باعث بنتی ہے۔'' آفاق دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔
''مطلب؟''
''مطلب یہ کہ ان کی پریشانی کا سبب جاننے کے لیے ان کے ماضی کو جاننا ضروری ہے۔'' آفاق نے سمجھایا۔
''پر اس کا ماضی تو سب ٹھیک ہی ہے۔'' سامنے بیٹھے شخص نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''ہو سکتا ہے سب ٹھیک ہوتے ہوئے بھی کہیں کچھ ٹھیک نہ ہو۔ میری بات مان انہیں میرے پاس یا کسی اور مشہور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے کے بجائے بذات خود تو ان کی کونسلنگ کر باتوں باتوں میں ان کا ماضی جان اور پوری کوشش کر کہ تو اس گرہ کی تہہ تک پہنچ پائے کیونکہ تیرا اپنائیت بھرا لہجہ تیرا پیار اور تیرا ساتھ ان کے اعتماد کو بحال کرنے میں مدد کرے گا اور مجھے پوری امید ہے کہ یہ بے بنیاد پریشانی اور نام نہاد الجھنیں جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' آفاق نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے امید کا جگنو تھمایا۔ تو وہ فرط مسرت سے اپنے دوست ڈاکٹر آفاق کے گلے لگ گیا۔ جس نے اس کی پریشانی کا حل چٹکیوں میں بتا دیا تھا۔ وہ اپنے دوست اور مشہور سائیکاٹرسٹ کی کیبن سے نکلنے کے بعد کچھ حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ پر پریشانی ابھی ختم نہیں شروع ہوئی تھی۔

☆......☆

یہ 1988ء کا دور تھا۔ جب پاکستانی فلم انڈسٹری میں ندیم اور شمیمہ پیرزادہ چھائے ہوئے تھے اور یہ وہی کی وہ دہائی تھی جب ضیاء الحق کی آمریت کا اختتام ہوا۔ اس دور میں وہ وزٹ ویزہ پر اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی سے پاکستان آئی، جہاں کراچی میں اس کی بیمار نانی بستر مرگ پر تھی۔ بیمار نانی کی آخری عیادت تو گویا ایک بہانہ بنی۔ اصل میں تو اس کی قسمت اسے پاکستان کھینچ لائی تھی۔ نانی کی عیادت کو آئی سلمٰی بھابی کی نظر جو اس پر ٹھہری تو پلٹنا ہی بھول گئی۔ وہ تھی بھی خوب صورت، گورا چٹا رنگ، دراز قد و قامت، صبیح چہرے پر چوڑی پیشانی، لمبے سیاہ بال، سلمٰی بھابی سمیت بہت سی خواتین کی نظروں میں اس کے لیے تعریف و رشک ہوتا۔ نانی کے چالیسویں کے ہوتے ہی سلمٰی بھابی تو اس کی ماں کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ سلمٰی بھابی اس کی ماں یعنی روشن آرا بیگم کی ماموں زاد ہوتیں جو خود تو کراچی میں ہی رہتی تھیں مگر اس کا سسرال میر پور خاص میں رہائش پذیر تھا۔
''آپا! آپ نے ابھی دو بیٹیاں اور بیاہنی ہیں۔ نازو کی آج نہیں تو کل شادی تو کرنی ہی ہے تو پھر میرے بتائے ہوئے رشتے میں کیا قباحت ہے۔ دیکھا بھالا لڑکا ہے نہ کوئی آگے نہ پیچھے میرے سسرال میں آنا جانا رہتا ہے۔ اپنا ذاتی گھر بھی ہے اور سرکاری نوکری کے ساتھ ایک درزی کی دکان بھی۔ اب اور کیا چاہیے۔''
''سب تو ٹھیک ہے سلمٰی بھابی مگر میں یوں اچانک یہاں اپنی بیٹی کی شادی کیسے کر سکتی ہوں؟ یہ شہر، یہ دیس سب انجان......!'' روشن آرا نے انکار کیا۔
''یہ دیس انجان ہے، ہم تو انجان نہیں نا؟ ہم سب بھی تو ہیں یہاں تو پھر نازو کی فکر کیسی؟ ماشاء اللہ سے اس کی خالہ ہے یہاں۔ دو دو ممانیاں ہیں تو پھر نازو کہاں سے اکیلی ہوئی۔ بس آپ سارے وہم وسوسے دل سے نکالو

اور ہاں کر دو۔'' سلمٰی نے حتی الامکان قائل کرنے کی پوری کوشش کی۔
''بات تو آپ کی بھی صحیح ہے پر میں اپنے بھائی بھابی اور اس کے ابو وغیرہ سے مشورہ کروں پھر بتاؤں گی لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا۔'' وہ مطمئن نہ تھیں۔
''ہاں ہاں آپ آرام سے سب سے مشورہ کر لو، آپ ماں ہو نا بیٹی کی ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ بھائی صاحب سے بھی بات کر لو پھر جب کہو گی میں لڑکے سے ملوا دوں گی۔ نیک سیرت ہے لڑکا، اچھی نوکری اپنا گھر اوپر سے تن تنہا اس بارے میں زیادہ نا ہی سوچیں بلکہ ہاں ہی کر دیں تو اچھا ہی ہے۔ ویسے بھی لڑکے کو میں نے اپنا منہ بولا بھائی بنایا ہے تو اس کی ذمہ داری تو میری ہی ہے اور نازو بھی میری اپنی ہے اس کے لیے میں کچھ غلط تھوڑی نا فیصلہ کروں گی۔ آپا ٹھنڈے دماغ سے بیٹی کی ماں بن کر نہیں بیٹیوں کی ماں بن کر سوچنا دو اور بیٹیاں بھی موجود ہیں ایک کی قسمت کھلی تو باقی بھی جلد اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ آپ جواب ہاں میں ہی دینا۔'' روشن آرا بیگم کو سوچوں میں گم دیکھ کر سلمٰی نے جھٹ سے ان پر اس رشتے کے لیے دباؤ بڑھایا تھا۔

☆......☆

میرج ہال کے لان میں ولیمے کی تقریب عروج پر تھی۔ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، معطر خوشبوئیں، زرق برق آنچل اور شوخ سی لٹوں کو اڑائے پھر رہی تھی۔ پرپل اور گولڈن کامبی نیشن کا انارکلی طرز کا لانگ فراک پہنے صبیح پیشانی پر ماتھا پٹی سجائے بنی سنوری دلہن اور ساتھ میں تھری پیس سوٹ زیب تن کیے خوبرو و ہینڈسم سا دولہا اس وقت ساری محفل کی توجہ کا مرکز تھا۔ میں یعنی مسز عقیدت علوی اس شاندار تقریب کی میزبان بھی۔ کیونکہ اسٹیج پر بیٹھی چاند سورج جیسی جوڑی میرے بیٹے اور بہو کی تھی۔ ضحاک علوی نا صرف ہمارا اکلوتا بیٹا بلکہ اپنی بہن صباعنہ کا اکلوتا بھائی بھی تھا، اکلوتا ہونے کے باوجود ضحاک عام لڑکوں سے قدرے مختلف تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے بچپن میں نہ کبھی کوئی بے وجہ ضد کی نہ فضول فرمائش۔ لڑکپن سے جوانی تک اس نے پڑھائی کے علاوہ کسی اور طرف آنکھ نہ اٹھا کر دیکھا۔ اس لیے تو آج کامیاب بزنس مین بھی ہے اور ہمارا فرمانبردار و تابعدار بیٹا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ضحاک ہمارا یعنی اپنے ممی پاپا کا دلارا تو تھا ہی پر اپنی بہن صباعنہ کی بھی آنکھوں کا تارا تھا۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے جب ہم نے شادی کے حوالے سے اس کی رائے مانگی تو اس نے ہماری پسند سے ہی اپنی پسند کو منسوب جانتے ہوئے جھٹ سے یہ ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی۔ اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے کوہ نور ڈھونڈنا گو کہ مشکل کام تھا پر یہ مرحلہ جتنا مشکل لگ رہا تھا اتنی ہی خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوا اور درنجف کی صورت مجھے وہ کوہ نور مل گیا۔ درنجف کو میں نے کسی شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہی مدعو تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ عام لڑکیوں سے مختلف لگی کیونکہ باقی لڑکیوں کی طرح اوٹ پٹانگ فیشن و شوخ میک اپ کے بجائے وہ بہت سادگی سے تیار ہوئی تھی۔ سی گرین فراک پر ہم رنگ بڑا سا دوپٹہ اوڑھے وہ اس کی تقریب میں سب سے منفرد لگ رہی تھی۔ باقی کے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے اور نتیجہ ولیمے کی صورت میرج ہال کے لان میں موجود تھا۔
یکدم اسٹیج کی جانب سے شور اٹھا تو میں ماضی سے خوب صورت حال میں لوٹی اور اسٹیج کی جانب نظریں پھیریں، جہاں میرا راج دلارا بیٹا ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا خوب صورت سا بکے لیے اپنی رانی بیوی کو پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر سب ینگ جنریشن خوب ہو ہا کا شور مچا رہے تھے۔ شرمائی شرمائی سی درنجف اور مسکراتا ہوا ضحاک میری ممتا نے

یکدم نظروں ہی نظروں میں ان کی نظریں اتاریں۔ کیونکہ اب ان دونوں ہی کی صورت آنے والے دنوں میں میرے گھر خوشیاں ہی خوشیاں آنی تھیں۔

☆......☆

ان لوگوں کے لیے یہ شہر، یہ ملک بالکل نیا تھا یہاں کے لوگ رواج پہناوا یہاں تک کے زبان بھی سب الگ، یہاں خالص اردو بولی جاتی تھی۔ جب کہ وہاں وہ لوگ ہندی بولتے تھے۔ ہاں مگر ایک بات ضرور تھی ان دونوں ماں بیٹی کو اس دیس میں بہت عزت دی جارہی تھی۔ ہر کوئی بہت اچھے اور پیار سے پیش آرہا تھا۔ نازو کو بھی اپنے ننھیال والوں سے مل کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پر یہاں مستقل رہنا وہ بھی اپنے ماں باپ اور بہنوں سے دور اس بات کے لیے اس کا دل راضی نہ تھا مگر اسے اطمینان بھی تھا کہ اس کے ماں باپ جو فیصلہ کریں گے سب کچھ مدنظر رکھتے ہوئے کریں گے اور بالآخر فیصلہ ہوگیا۔ پاکستان سے دہلی میں جب خالہ اور ماموں کے بیٹوں کی غیر برادری میں شادی ہونے کی خبر پہنچتی تو اس کے ماں باپ تھوڑے پریشان و رنجیدہ سے ہوجاتے کہ نہ جانے کیوں انہیں اپنی سگی بھانجیاں نظر نہیں آتیں۔ نازو کی عمر پچیس سال ہوچکی تھی۔ جب کہ اس سے چھوٹی دو بہنیں بائیس اور انیس سال کی تھیں گویا تینوں ہی جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھیں۔ اس کے ماں باپ کی پریشانی گھر کی اداس سی فضا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شرمندہ شرمندہ گھر کے کاموں میں خود کو مگن رکھتی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی سب کی زبانوں سے ایک ہی نوعیت کے سوال سننے کو ملے۔

''نازو کی کہیں نسبت طے ہوئی؟'' اور وہ یہاں وہاں خود کو چھپانے کی سعی کرنے لگتی۔ اب بھی وہ ممانی کے بچوں کے کپڑے استری کررہی تھی مگر الجھے ذہن کے ساتھ اس کا دھیان کسی اور ہی سمت اڑے جارہا تھا۔ وہ استری کیے ہوئے کپڑے ممانی کے کمرے میں رکھنے آئی تو تھوڑی حیران سی ہوئی کیونکہ یہاں سب بڑوں کی محفل لگی ہوئی تھی۔ خالہ، ماموں، ممانی سمیت تھوڑی مضطرب سی اس کی ماں بھی موجود تھیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' وہ ان کی پریشان صورت دیکھ کر یونہی بے چین ہوجایا کرتی تھی۔ انہوں نے جواب میں کچھ نہ کہا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''اماں! کیا بات ہے۔ اس سے آپ سب لوگ یہاں جمع ہیں، کوئی پریشانی ہے؟'' اس کی نگاہ باری باری سب کے چہروں سے ہوتی اپنی ماں کے چہرے پر ٹکی تھی۔

''نہیں بیٹا! کوئی پریشانی نہیں بلکہ اب تو آپ کی ماں کی پریشانی ختم ہوئی ہے۔'' ممانی نے شوخی سے کہا۔ تبھی ماموں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا وہ خاموشی سے ماموں کے سامنے بیڈ کے کنارے ٹک گئی جہاں کچھ ہی فاصلے پر اس کی خالہ بھی موجود تھیں۔

''بیٹا! آپ کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے آپ کی ماں سمیت ہم سب نے اس رشتے کو آپ کے لیے مناسب سمجھا ہے پھر بھی اگر آپ نہیں چاہتی ہوں یا کوئی بھی بات ہو تو اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کیجیے۔'' ماموں نے نازو کے سر پر ہاتھ رکھے پیار سے اصل بات بلکہ اصل دھماکا کیا اور ساتھ ہی اس کی رائے پوچھی۔ جس کا اختیار اسے سونپ کر بھی گویا چھین ہی لیا تھا۔ کیونکہ باقی سب نے تو رشتے کو پسندیدگی کی سند دے ہی دی تھی۔

''بیٹا! رشتے کی مجبوری نہ ہوتی تو میں پرائے ملک میں رشتہ کرتی ہی نا، مجبوری بھی ایسی ہے تمہارے بعد باقی دو کا بھی سوچنا ہے۔ چلو خیر سے اللہ نے نیک سبب بنایا ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے۔ اللہ پر توکل کرکے بھائی بھابی کی اپنائیت اور بھروسے پر میرا دل مانا ہے باقی اب تم بتاؤ تو ہم ہاں کریں۔'' اس کی ماں سمیت سب اس کی

رائے کے منتظر تھے رائے بھی کیا گویا ہاں سننے کے ہی منتظر تھے اس کا سر بھی خود بہ خود جھک گیا۔ نہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا اور ہاں کرنا گویا والدین کی پریشانیوں کو قدرے کم کرنا اس کی ہاں سنتے ہی ماموں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چل دیئے۔ جب کہ اس کی ماں نے آسودگی سے اسے گلے لگالیا مگر وہ رو بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کی پریشانی وہ مجبوری کا طوق اسے مجبوراً اٹھانا ہی تھا۔

☆......☆

نکاح کی نسبت درنجف ولیمہ ریسیپشن میں زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ نوخیز حسن کھل کر گلاب ہوا تھا۔ ضحاک علوی کمرے میں آنے کو بے تاب ہورہا تھا تاکہ وہ اس کے حسن کو خراج پیش کرسکے پر اسے دوستوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ نتیجتاً جب تک وہ گھر آیا تب تک گھر کے کونے کونے میں رات اتر چکی تھی۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ درنجف شاید اس کا انتظار کرتے کرتے نیند کی مہربان دیوی کی گود میں جا سوئی تھی۔ وہ بنا آہٹ کیے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ چینج کرنے کے بعد ضحاک خاموشی سے بیڈ پر آلیٹا جہاں درنجف اپنے ہوش ربا حسن کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت کسی معصوم سے بچے جیسی دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی جب کہ کروٹ کے بل لیٹنے کی بنا پر اس کے بال چہرے و گردن کے اطراف بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے آگے بڑھ کر درنجف کے گرد اپنی بانہوں کا دائرہ بنایا اور پیار سے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ درنجف ہلکا سا کسمسائی تھی پر اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتی یا کچھ مزاحمت کرتی ضحاک کے لبوں نے ایک میٹھی سی شرارت کردی درنجف نے یکدم اپنی آنکھیں کھولیں تو ضحاک کو اپنے قریب پایا۔ وہ فاصلہ بڑھاتے ہوئے پیچھے ہٹنے کو ہی تھی کہ ضحاک نے اسے خود سے اور قریب تر کرتے ہوئے اس کے ارادے پر پانی پھیر دیا۔

''مجھے آج تک محبت نہیں ہوئی پر تمہیں دیکھ کر تمہیں پاکر مجھے عشق ہوچلا۔'' درنجف کو اپنے کانوں کے پاس خمار آلود و مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ دھڑکنوں کی دھک دھک اور وال کلاک کی ٹک ٹک کی تال پر ضحاک کے لب اس کے وجود پر داستان عشق کا رقص کرتے رہے اور دھیرے دھیرے رات بیت چلی۔

☆......☆

اگلے دن ناشتے کے وقت ڈائننگ ٹیبل پر ہیپی فیملی کا منظر نمایاں تھا۔ سب کچھ کتنا مکمل اور اچھا لگ رہا تھا۔ ساس کے رتبے پر فائز ہونے کے باوجود مسز عقیدت کو یوں لگ رہا تھا گویا وہ اب ماں بنی ہوں۔ درنجف کے چہرے پر پھیلی شرمگیں مسکان، ضحاک کی آنکھوں سے جھلکتی محبت کی چمک ان کا سیروں خون بڑھا رہی تھی۔ وہ بھی نہ روایتی سی بہو رہی تھیں اور نہ ہی اب روایتی ساس بننا چاہتی تھیں۔ بلکہ وہ پرامید تھیں کہ ان کی بہو بھی روایتی بہوؤں جیسی نہ ہوگی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد مسز عقیدت کے نہ نہ کرنے کے باوجود درنجف اپنی ساس اور نند کی مدد کرنے کے لیے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

''بیٹا! یہ سب کام تم نے ہی کرنے ہیں، پر ابھی نہیں ابھی تو تمہارے ہاتھوں کی نہ مہندی چھوٹی ہے نہ دلہناپے کے دن۔'' مسز عقیدت نے پیار سے اپنی بہو کو کاموں سے روکتے ہوئے کہا۔

''آنٹی جی! بعد میں بھی تو یہ سب کام کرنے ہی ہیں۔ پھر ابھی کیوں نہیں؟'' درنجف کی بات کے جواب میں

وہ کیا کہتیں وہ تو بس اس کے لبوں سے ادا ہوئے لفظ آنٹی میں ہی الجھ کر رہ گئی تھیں۔ شاید نئی جگہ نیا رشتہ نئے لوگ ہیں ایڈجسٹ ہونے میں رفتہ رفتہ ٹائم لگے گا اسے اگلے پل مسز عقیدت کے اندر موجود ممتا نے اس الجھن کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! پر تم ان سب کاموں کو چھوڑو اور اپنے گھر...... مطلب میکے جانے کی تیاری کرو۔"

"گھر تین حروف سے مل کر بنا یہ لفظ یہ محفوظ ٹھکانہ ہی اگر اجنبی ہو تو پھر پناہ گاہ ہی اگر قید گاہ بن جائے تو...... جہاں کے در و دیوار باہر سے آتے گرم تھپیڑوں اور منہ زور آندھیوں کو روکنے کے بجائے ڈھ سے گئے ہوں وہ گھر بھلا کیسا گھر ہوگا؟ ایسے گھر کی پناہ گاہ بھی کیسی پناہ گاہ؟ جو پناہ گاہ کے بجائے سزا گاہ بن جائے۔"

"ارے بیٹا! تم اب تک یہیں کھڑی ہو، جاؤ تیار ہو جاؤ۔ ضحاک تمہیں میکے چھوڑ آئے گا۔" درنجف کو سوچوں میں گم کچن کے دروازے پر ایستادہ دیکھ مسز عقیدت نے کہا۔

"وہ دراصل آنٹی میں سوچ رہی تھی کہ میکے پھر آرام سے چلی جاؤں گی تاکہ کچھ دن رک بھی سکوں اور پھر کچھ دنوں بعد صباعنہ آپی بھی تو واپس جانے والی ہیں پھر کہاں مجھے ان کے ساتھ وقت بیتانے کو ملے گا۔" بہو کی بات پر مسز عقیدت کو حیرانی کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ کچھ کہتیں اس سے پہلے ان کی باتیں سنتی صباعنہ جھٹ سے آگے بڑھ کر بھابی کے گلے لگی۔

"آئی ایم سو ہیپی۔ دیکھیے ممی پاپا بھابی نے میری وجہ سے فی الحال میکے جانے سے انکار کر دیا۔" صباعنہ نے لاؤنج میں بیٹھے اپنے پاپا کو بھی پرجوش لہجے میں مخاطب کیا۔ جن کے پاس بیٹھا ضحاک بھی سن کر مسکرا دیا۔ جب کہ مسز عقیدت بھی پھیکی سی ہنسی ہنس دیں کیوں کہ درنجف کی بات نے انہیں ان دیکھے اندیشوں میں گھیر لیا تھا۔ پر مسز عقیدت کی سوئی ہوئی الجھن اس وقت جاگ اٹھی جب درنجف نے نہ صرف اپنے میکے والوں کو بھی کال کر کے اپنے نہ آنے کی وہی وجہ بتائی بلکہ اسی موقف پر ڈٹتے ہوئے وہ اگلے تین چار روز تک بھی میکے نہ گئی۔

☆......☆

بالآخر پھر فیصلہ ہو گیا۔ روشن آرا بیگم کے سارے وہم اور وسوسے سلمٰی بھابی کی سونے جیسی چمکیلی باتوں تلے دب گئے۔ انہوں نے سوچا شادی تو کرنی ہے پھر یہاں کیوں نہیں؟ جب کہ لڑکا بھی پڑھا لکھا نہیں تو کیا ہوا کماؤ تو ہے ہی۔ ویسے بھی اس دور میں پڑھائی نہیں کمائی دیکھی جاتی تھی۔ شروعات میں تو نازو کا خیال تھا کہ یوں بات بننا ممکن ہی نہ ہو کیونکہ ان کی واپسی میں اب صرف ڈیڑھ ماہ ہی تو بچے تھے۔ اتنے کم وقت میں شادی کیسے ممکن تھی جب کہ اس کے ابو اور بہنیں بھی یہاں موجود نہ تھیں مگر سب باتیں دھری کی دھری رہ گئیں اور اس کی قسمت کا فیصلہ طے ہو گیا۔ سلمٰی بھابی کا بتایا ہوا رشتہ نازو کے لیے قبول کر لیا گیا۔ وقت کی کمی کے باعث بس صرف نکاح کی ہی تقریب رکھی گئی تھی۔ ابھی ابھی نکاح کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ لاؤنج میں مٹھائی کا ٹوکرا دھرا تھا جو سلمٰی بھابی لائیں تھیں۔ اس نے سر گھما کر اپنی ماں کی جانب دیکھا جو بڑے مگن سے انداز میں ٹوکرے میں سے مٹھائی نکال رہی تھیں۔ نازو کتنی دیر تک اپنی ماں کے منہمک چہرے کو تکتی رہی۔

شادی کے بعد سب لڑکیوں کو اپنا گھر ماں باپ کا ساتھ چھوڑنا پڑتا ہی ہے مگر یہاں اتنی دور پردیس میں رہنا یہ ہی باتیں اس کے اندر توڑ پھوڑ کر رہی تھیں۔ اب بھی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی بے شمار خواب تھے۔ بہت ارمان تھے اس کے ہاتھوں پر مہندی ہو۔ شگن کا پیلا جوڑا پہنے، چنری اوڑھے وہ بھی سکھیوں کے سنگ بیٹھی ہو۔ پر یہاں نہ سکھیوں کے گیت ہونے تھے۔ نہ بہنوں کے سنگ ڈھولکی، یہاں تو

خاموشی تھی۔ اس کے خواب ادھورے سے رہ گئے کتنا بے رحم فیصلہ تھا تقدیر کا۔

باہر تو ہر اک سمیت تھا ہنگامہ محشر
سناٹے کا پہرہ تو فقط دل پر لگا تھا

☆......☆

آج کل دعوتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ آج بھی ضحاک کے ایک دوست کے ہاں دعوت تھی جہاں سے کچھ دیر پہلے ہی ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔

صباعنہ کچن سمیٹ رہی تھی جب کہ ضحاک، صباعنہ کی بیٹی عیہا کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھا اور مغیث علوی صاحب نیوز دیکھنے میں مصروف تھے۔ تبھی مسز عقیدت نے دھیرے سے درنجف کو پکارا۔

"بیٹا! ذرا میرے ساتھ آنا۔" مسز عقیدت کہہ کر اپنے روم کی جانب چل دیں تو وہ بھی ان کے پیچھے روم میں داخل ہوئی۔

"جی ممی! آپ نے بلایا۔ کچھ کام تھا؟" مسز عقیدت کے ہی کہنے پر وہ انہیں ممی کہنے لگی تھی۔

"بیٹا! کچھ کام نہیں بلکہ ضروری بات کرنی تھی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے درنجف کو بھی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ وہیں ان کے پاس ٹک سی گئی۔

"بیٹا! جب سے تم اس گھر میں آئی ہو اس دن سے تمہیں بہو نہیں بیٹی ہی مانا ہے۔ شادی کر کے رخصت ہو کر جب ایک بیٹی اپنے سسرال اپنے نئے گھر آتی ہے تو پرانے گھر سے اس کے تعلقات ٹوٹتے نہیں بلکہ بیتی یادوں کے سہارے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ پر تم واقعی انوکھی ہو جسے اپنے میکے جانے کی طلب نہیں۔ میں نہیں جانتی اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے یا یہ سب میرا وہم، پر اصل بات تو یہ ہے کہ کیا واقعی تمہیں اپنا گھر یاد نہیں آتا، اپنا میکہ؟"

مسز عقیدت کی باتیں سن کر ایک لمحے کو تو درنجف کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

"ممی! ایسی کوئی بات نہیں۔ یادیں تو ہمیشہ ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ پر آپ تو جانتی ہی ہیں کہ صباعنہ آپی نے کچھ ہی ٹائم بعد چلے جانا ہے پھر کہاں روز روز ان کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع مل پائے گا میکہ تو یہیں ہی ہے ابھی نہیں تو بعد میں سہی اور آج کل دعوتوں کی وجہ سے بھی فراغت نہیں مل پا رہی۔ بعد میں آرام سے چلی جاؤں گی۔" درنجف نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"بیٹا! تم چاہے سب کو تسلی دو پر نہ جانے کیوں میں مطمئن نہیں کیونکہ میں بھی ایک ماں ہوں۔ بیٹا ہر بات اپنی جگہ مگر ایک بات ایک سچ جو کبھی نہیں بدلتا وہ ماں بیٹی کا پیار ہے۔ ایک ماں کا دل اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے ہمہ وقت تڑپتا اور بے چین رہتا ہے۔" ان کے لہجے میں ممتا بول رہی تھی۔

"چلو بیٹا! جاؤ اب تم آرام کرو، ہاں مگر کل تم اپنے گھر جا رہی ہو۔"

"ممی! یہ گھر بھی تو میرا ہی ہے جب وہ گھر چھوڑا مطلب رخصت ہو رہی تھی تبھی طے کیا تھا اب اصلی گھر تو پیا کا ہی گھر ہے۔" درنجف نے نظریں جھکائے دھیرے سے کہا۔

"نہیں بیٹا! سسرال چاہے کیسا بھی ہو بھلے کتنا ہی پیار مل جائے اور اپنا پن بھی پر سسرال کا نام سسرال ہی رہتا ہے۔ بس تو اب کل تم میکے جا رہی ہو۔ خوشی خوشی جاؤ وہاں بھی سب کو انتظار ہوگا تمہارا اور اگر رکنے کا دل ہو تو ایک دو دن رک بھی جانا۔" بہو کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے تاکید کی تو درنجف ہولے سے اپنا

سر ہلا گئی۔

☆......☆

دہلی سے اس کے ابو کا تار آ گیا جس میں واضح لفظوں میں سارے اختیارات روشن آراء بیگم کو سونپ دیئے تھے، ویسے بھی ان کے سر پر دو اور جوان بیٹیوں کا بار تھا۔ اس لیے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ''آج کل اچھے رشتے آسانی سے ملتے نہیں۔ اللہ نے نیک سبب بنا دیا آگے بھی وہ بہتر کرے گا، میں نے اللہ پر توکل کرلیا ہے۔ آج نہیں تو کل شادی تو کرنی ہی تھی اب رشتہ اچھا ہے تو انکار کی گنجائش نہیں۔ میں تو شامل نہ ہو سکوں گا مگر تم ماں ہو وہاں موجود ہو پھر تمہارے میکے والے بھی ہیں اچھے سے دیکھ بھال کر بسم اللہ کردو۔'' تار کے ساتھ بھیجے گئے پیسوں سے نازو کا جہیز تیار ہونے لگا۔ دوسری جانب اس کی خالہ وممانیوں نے بھی مل ملا کر اچھا خاصا جہیز اتنے کم میں بھی جمع کرلیا۔ قسمت کیا ہے؟ آج محض وقت کے پلٹنے نے اسے قسمت کی حقیقت بتا دی تھی۔ آنکھوں نے ساون کی جھڑی سے گٹھ جوڑ کرلیا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر کتنی بار رو چکی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے دن بیتتے چلے گئے اور ایک عجب وانوکھا دن آ چلا۔ اس دنیا کا کارخانہ بھی عجب تر ہے تدبیر کچھ ہوتی ہے اور تقدیر کچھ ہوتی ہے۔ یوں ایک دوسرے کی ضد اور ٹکراؤ سے دنیا میں عجیب تماشے رونما ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ یہاں بھی ہو رہا تھا۔ ایک انوکھی شادی ہونے چلی تھی جس میں نہ باپ کا دعائیہ ہاتھ سر پر تھا، نہ بہنوں کی چھیڑ خانیاں اور نہ ہی اپنے گھر کی چوکھٹ تھی۔ ایک ایسا رشتہ بننے چلا تھا جس میں دو الگ الگ ذات اور ملک سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک بندھن میں بندھنے چلے تھے۔ یونہی اگست 1988ء میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئی۔ وہ نازو جو نیا شہر نیا ملک گھومنے آئی تھی اپنے رشتے داروں سے ملنے اور ساتھ ہی اپنی بیمار نانی کا آخری دیدار کرنے آئی تھی۔ اسے قسمت نے یہیں کا باسی بنا دیا اور واپسی کے در بند کردیئے۔ وہ حیران تھی۔ اگر سفر میں آپ کے ہمراہ موجود مسافر آپ سے متضاد طبیعت کا مالک ہو تو سفر سمیت اسے برداشت کرنا مشکل سا ہو جاتا ہے۔ پر زندگی کا ہمسفر ہی ان دیکھا اجنبی بن جائے تو اس کے ساتھ زندگی کا سفر طویل تر و مشکل ترین بن جاتا ہے۔

☆......☆

اس کی شادی جو مکمل ارینج تھی جس میں اب تک نہ دولہا نے دلہن کو دیکھا تھا نہ دلہن نے دولہا کو پر قسمت نے انہیں ایک راہ کا ہمسفر بنا دیا۔ برأت میر پور خاص سے آئی تھی جس میں دولہا کے کچھ دوست اور سلمٰی بھابی کا پورا سسرال شامل تھا اور پھر وہ رخصت ہو کر میر پور خاص کے لیے روانہ ہوئی مگر سوئے قسمت بارات کراچی سے نکلی ہی تھی کہ وہ چھاجوں چھاج مینہ برسا کہ بارات کی کوچ جب میر پور خاص میں رکی تو یہاں گوڈوں تک پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ شاید اس دن آسمان کا سینہ بھی بوجھل ہو کر چھلک پڑا تھا۔ اس بہتی ندی کو عبور کر کے نازو کو وقتی طور سلمٰی بھابی کے سسرال میں ہی پہنچایا گیا۔ وہیں اس کے جہیز کا سامان بھی رکھا گیا تھا اور پھر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا جسے آناً فاناً اس کی زندگی میں شامل کیا جا چکا تھا۔ شکل وصورت تو واقعی ٹھیک ٹھاک تھی۔ البتہ عمر کے لحاظ سے وہ دو سال چھوٹا تھا۔ اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہ تھا ویسے بھی سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ اس نے تو اب سب کچھ وقت کے حوالے کردیا۔ اگلے دو تین دنوں تک وقفے وقفے سے بارش برستی رہی جس کے سبب وہ اپنے گھر نہ جا سکی۔ وہ ہی گھر جو اب اس کا ٹھکانا اور نیا آشیانہ تھا۔ اس لیے وہ فی الحال سلمٰی بھابی کے سسرال میں ہی موجود تھی۔ اس کی شادی کے چوتھے دن کی بات تھی جب اچانک اس کے میکے والے چلے آئے

وہ سب سے مل کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔

''کل تمہارا ولیمہ ہے نا، اس لیے ہم سب کچھ دیر میں گاؤں کے لیے نکلیں گے۔'' سلمٰی بھابی نے نازو کو حیران دیکھ کر اس کی لاعلمی دور کرنا چاہی۔

''گاؤں، ولیمہ......'' نازو اب بھی ناسمجھی سے سب کو دیکھے جا رہی تھی۔ تبھی اس کی ممانی نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

''تمہارا ولیمہ گاؤں میں رکھا گیا ہے تمہارے شوہر کے آبائی گاؤں میں، وہاں اس کے رشتے دار بھی ہیں، چلو اب تم بھی تیار ہو جاؤ ہمیں کچھ دیر میں گاؤں کے لیے نکلنا ہے۔'' وہ ان سب کے کہنے اور ٹوکنے پر تیار ہونے کمرے میں تو چلی آئی مگر اس کا ذہن اب بھی گاؤں رشتے دار، ان ہی الفاظوں میں الجھا ہوا تھا۔

☆......☆

وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی چہرے پر مسکراہٹوں کا ہالہ بنائے وہ ایک قسمت والی بیٹی کی طرح گھر یعنی اپنے میکے آئی تھی۔ وہ گھر جو اب اس کا نہ تھا۔ اس کی شادی کے بعد جو پرایا ہو چکا تھا یوں تو پتا نہیں کب سے وہ خود کو ہی پرایا کر چکی تھی اور اب تو دنیا کی نظر میں بھی یہ گھر اس کے لیے پرایا ہو چکا تھا۔

وہ اپنی بہن کے ساتھ باتوں میں مگن تھی تبھی ڈور بیل بجی۔ دروازے پر اس کے ابو تھے جن کی نماز ظہر سے واپسی ہوئی تھی۔

''ارے میری بیٹی آئی ہے۔'' ابو کی پرجوش سی آواز سنائی دی وہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ ماں باپ کا لمس انمول ہی ہوتا ہے۔

''پرائی ہی ہوگئی ہے۔'' وہ اسے گلے لگائے پیار سے بولے تو دو آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''بیٹا تم خوش ہو نا؟ سب ٹھیک ہے نا؟'' ابو کی آواز میں فکر تھی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اس کے ابو کی پیشانی پر وہم، فکر، پریشانی کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ایسی لکیریں جو ہر ماں باپ کے چہرے پر نمودار ہوتی ہیں جب وہ اپنی بیٹی بیاہتے ہیں پھر جب پہلی بار بیاہی بیٹی گھر آتی ہے تو یہ لکیریں پیشانی پر سج سی جاتی ہیں اور جب تک بیٹی کی مسکراہٹ اور اس کی آواز وآنکھوں سے جھلکتی خوشی نہ دیکھ لی جائے یہ لکیریں مٹتی نہیں۔

''جی ابو! بہت خوش ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا مگر یہ مختصر جواب بھی گویا امرت کی طرح کام کر گیا۔ ایک لمحہ ہی لگا تھا اس کے ابو کے چہرے سے وہم وفکر وسوسے کو دور ہونے میں۔ اب اس کی جگہ آسودگی و اطمینان بھری مسکراہٹ سجی تھی۔ وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔ کھانے پر زیادہ اہتمام تو نہ تھا۔ ہاں مگر ان سب نے اسے خاصا پروٹوکول دیا تھا۔ جیسے وہ کوئی مہمان ہو۔ مہمان کیسا لفظ تھا یہ بھی اتنے سال جس گھر میں رہی اب کچھ ہی دنوں میں وہ مہمان ہو چکی تھی۔ یہ رشتے بھی کتنے عجیب سے ہوتے ہیں پل میں جڑتے ہیں تو پل میں ٹوٹتے ہیں۔

''جس کلی کو پیار سے سینچتے آئے
وہی پھول بن کر کسی اور کے باغ کی رونق بن چلی

اگلے دن بہت ساری دعاؤں وہدایتوں اور نصیحتوں کے ہمراہ ایک بار پھر وہ میکے کی دہلیز چھوڑ چکی تھی۔

☆......☆

مسز عقیدت اور معیث علوی صاحب کی جنت ایک بیٹی اور بیٹے پر مشتمل تھی۔ سب سے بڑی صباعنہ تھی۔

گریجویشن کے بعد ہی اس کی شادی کردی گئی۔ وہ آسٹریلیا میں رہائش پذیر تھی۔ کیونکہ اس کے شوہر کی جاب وہیں پر تھی۔ اس کی ڈھائی سالہ ایک بیٹی نیہا بھی تھی۔ اس کے بعد ضحاک علوی تھا جس نے مارکیٹنگ میں ایم بی اے کیا ہوا تھا اور ایکسپورٹ آٹو موبائل پارٹس کا بزنس کرتا تھا جس کے سلسلے میں وہ اکثر آؤٹ آف کنٹری بھی جاتا رہتا۔ علوی فیملی پوش علاقے میں ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ چار کمروں اور ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ جسے مسز عقیدت نے بہت خوب صورتی و سمجھداری سے سجایا تھا۔ معیث علوی صاحب بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سپروائزر کی جاب کرتے تھے۔ علوی فیملی کے ہاں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ضحاک اور درنجف کی شادی کو ایک ہفتہ بیت چلا تھا۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی اب تھم چکا تھا۔ تبھی ضحاک نے ہنی مون پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا پر اس سے پہلے صباعنہ آسٹریلیا کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ اس کے چلے جانے سے علوی فیملی تو اداس تھی ہی پر درنجف کو نیہا کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی؟ کیونکہ بہت کم عرصے میں ہی وہ اس کے قریب آچکی تھی جب کہ صباعنہ کی شکل میں اسے ایک اچھی دوست ملی تھی۔ ضحاک اور درنجف بھی ناردرن ایریا ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆

اس کی الجھن گاؤں جا کر ہی دور ہوئی تھی۔ گاؤں واقعی گاؤں ہی نکلا۔ یہ گاؤں ٹمیاری کے قریب تھا۔ مٹی کا اٹھتا طوفان، مویشیوں کی بھرمال، کچے کچے سے مکان، گھاس پھوس کا ڈھیر، اوپلے تھاپی ہوئی دیواریں، بھینسوں کی بھاں بھاں اور بکریوں کی میں میں...... وہ حیران نظروں سے آس پاس کے ماحول عجیب سی بولی اور بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب کہ اس کے میکے کے نام پر ساتھ آئیں اس کی خالہ ان کے بچے ممانیاں اور ان کے بچے یہ سب لوگ تو گاؤں کو دیکھ کر اور یہاں آ کر یوں خوش ہو رہے تھے جیسے کوئی الگ ہی جہاں نظر کے سامنے ہو۔ لڑکے بالے کھیتوں پر ٹیوب ویل، فصلوں اور نہروں کو دیکھ کر تو لڑکیاں بکری کے چھوٹے چھوٹے میمنے، چوزوں، کچے گھروں اور پانی کے نلکے (ہینڈ پمپ) کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ جب کہ وہ اس انجانے سے ماحول میں اکیلی سی پڑ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے اور تعارف کا تبادلہ ہونا شروع ہوا جو سلمیٰ بھابی نے ہی کروانا شروع کیا۔

''نازو! یہ تمہاری ساس ہیں یہ سسر......'' ایک ضعیف جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا۔

''یہ تینوں تمہاری نندیں ہیں۔'' بالوں میں پراندے لگائے بغل میں بچے دبائے وہ تینوں تقریباً ایک جیسی ہی لگیں۔

''اور یہ کونے والی چارپائی پر جو بیٹھے ہیں۔ یہ چاروں تمہارے دیور ہیں۔'' اس نے باری باری چاروں کی جانب دیکھا۔ کندھوں پر رومال رکھے۔ بڑھی ہوئی مونچھیں لیے ان سب کی عمروں میں زیادہ سے زیادہ دو تین سالوں کا ہی فرق تھا۔ وہ حیران و پریشان نظروں سے سب کو تکے جا رہی تھی۔ اگلے لمحے سلمیٰ بھابی کی چرب زبان حرکت میں آچکی تھی۔

''بھئی! لڑکا اکلوتا ہی کہلائے گا نا کیونکہ تن تنہا ہی رہتا تو شہر میں ہی ہے۔ یہاں نہ آتا ہے اور نہ ہی رہتا ہے۔'' اپنی طرف سے گویا انہوں نے تسلی کروائی، پر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ میکے والے بھی خاموش ہی تھے کیونکہ شادی تو ہو چکی تھی۔ اب وقت واپس تو آ ہی نہیں سکتا کہ مصداق وہ سب سمجھوتا کرنے لگے۔ نہ جانے کون سی زبان تھی جس میں اسے دعائیں دی جاتی رہیں اور نہ جانے کیا کیا بولا جا رہا تھا، وہ اس زبان سے انجانی تھی۔ بس

صدمے سے چپ چاپ وہ ٹکر ٹکر سب کو دیکھے جا رہی تھی اور پھر ولیمے کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے سسرال والوں نے مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ سب کو چارپائیوں پر ہی کھانا دیا گیا۔ فرش تو تھا ہی نہیں بس نیچے دھول سے اٹی زمین ہی تھی۔ اس لیے اٹھنا بیٹھنا کھانا سونا سب چارپائیوں پر ہی ہوتا۔ ہر چارپائی پر ایک ایک بندہ کسی جن کی مانند ہاتھ باندھے یوں کھڑا ہوتا۔ گویا مانگی جانے والی چیز وہ پلک جھپکے مہمانوں کو حاضر کر دے یہاں تک کہ ان سب کو کھانا کھلانے کے بعد ہاتھ بھی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی دھلائے گئے نازو کے میکے والے اس کے سسرال والوں سے کافی مرعوب ہو چکے تھے۔ وہ دو دن وہاں رہے اور ان دو دنوں میں اس کی سسرال والوں نے سب کے دلوں میں اتنا اچھا تاثر چھوڑا کہ نازو کے میکے والے نازو کی قسمت کو سراہنے لگے۔ دو دن بعد اس کے میکے والے تو سلمیٰ بھابی کے ساتھ واپس چلے گئے جب کہ وہ کچھ دن اور ٹھہری اور ان دنوں میں اسے بھی کافی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ البتہ وہ ان کی نئی نویلی زبان سے انجان ہی تھی ان کی باتوں کا ترجمہ اس کا شوہر کر کے اسے سمجھاتا۔ جب تک ان کی واپسی پھر سے میرپور خاص ہوئی تب تک اس کی امی (روشن آرا بیگم) کے دہلی جانے کا دن بھی آگیا اور یوں وہ بہت سی ہدایتیں، نصیحتیں اور دعائیں دے کر نم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سوچا اب اس کی زندگی کی نئی شروعات ہو چکی ہے مگر وہ انجان تھی زندگی دور کھڑی اس پر ہنس رہی تھی اور آنے والے طوفان کی اطلاع دے رہی تھی۔ جس سے وہ بے خبر اب اپنے نئے آشیانے کو بسانے کے بارے میں سوچنے میں مگن تھی۔

☆......☆

ٹھنڈی ہوائیں، اونچے نیچے سرسبز راستے، پرسکون ماحول، ٹھنڈے ٹھار پانی کے اڑتے چھینٹے، شفاف پانی کا پتھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والا شور، سر کے اوپر تیرتے روئی کے گالے، اردگرد بکھری روئی کی سفید چاند اور ساتھ میں نرم مزاج اور خیال رکھنے والے شریک سفر کا ہاتھ۔ ان کا ہنی مون حقیقتاً شہد کی طرح میٹھا اور چاند کی ٹھنڈی مسرور کر دینے والی روشنی کی طرح روح کو اندر تک سرشار کر دینے کی حد تک خوب صورت تھا۔ سارا دن قدرت کے حسین نظاروں سے آنکھوں کو سیراب کرنا اور رات اپنے ہمسفر کی مضبوط بانہوں کے حصار میں گزارنا، بہت خوشگوار و رومینٹک سا لگتا۔ ایسے حسین ماحول میں سب کچھ پرفیکٹ تھا اگر کچھ مس فٹ تھا تو درنجف کی آنکھیں ہاں! وہی آنکھیں جن میں ضحاک کو اپنے لیے محبت پسندیدگی اعتبار اور چاہت کے رنگ دیکھنے چاہیے تھے ان آنکھوں سے ایک اداسی، گہری جامد سی خاموشی بنا چاند جیسی اندھیری رات اور بے چینی چھلکتی تھی۔ ضحاک نے بارہا اس سے وجہ جاننی چاہی اپنے پیار و چاہت کے بادلوں کی برسات کر دی پر درنجف کے ہونٹوں کا قفل نہ کھلا۔ وقت تیزی سے بیت چلا اور پھر ان لوگوں کی بھی واپسی کا دن آگیا۔ آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ درنجف علوی فیملی کا حصہ بن گئی۔ وقت کا پہیہ چلتا گیا۔ وہ خاص سے عام ہو گئی۔ معیث علوی صبح کے گئے شام کو آتے جب کہ ضحاک کی واپسی اکثر رات تک ہوتی۔ اپارٹمنٹ میں سارا دن ساس بہو ہوتیں اور ان کی ملازمہ جو کچن کے تمام کاموں کو چھوڑ باقی کاموں کے لیے ہوتی۔ درنجف نے گھر کی تمام ذمہ داری اٹھالی تھی۔ مسز عقیدت یوں تو خوش تھیں مگر پھر بھی کہیں کچھ بے سکونی تھی۔

☆......☆

میرپور خاص کے سب سے ویران علاقے میں موجود بیری کے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کے بیچوں بیچ چار کچی دیواروں پر مشتمل ایک کمرے کا یہ مکان نازو کو گاؤں کے کچے گھروں کی یاد دلا گیا۔ یہ ایک ایسا مکان

تھا۔ جس کا فرش تک موجود نہ تھا یا یوں کہا جائے کہ مٹی سے اٹی زمین کو ہی بس فرش بنا دیا گیا تھا۔ ایک کمرے اور چھوٹے سے باتھ روم اور کھلے صحن پر مشتمل یہ مکان باہر سے دیکھنے والے کو بالکل اجاڑ اور ویران سا لگتا جس کی دیواروں پر رنگ و روغن تو دور پلستر تک نہ تھا۔ باقاعدہ گنا جا سکتا تھا کہ دیوار بنانے میں کتنی اینٹیں صرف ہوئی ہیں۔ چھت البتہ اتنی پکی ضرور تھی کہ سوائے بارش کے پانی کے اور کچھ اوپر سے نہ گرتا، کھلے صحن میں نلکا موجود تھا۔ یعنی استعمال کے لیے سارا پانی نلکے سے ہی حاصل ہوتا۔ باورچی خانہ سرے سے ہی غائب تھا۔ البتہ کھلے صحن میں بکھرے بیری کے پتے اور مٹی کا فرش تھا وہیں ایک جانب مٹی سے بنا چولہا اوپن کچن کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ایسے اجاڑ سے مکان نامی گھر میں تن تنہا رہنا جہاں گیس تھی نا بجلی، نا ہی ضروریات زندگی کا مکمل سامان ایسے مکان کو گھر بنانا اور یہاں رہنے کا تصور ہی سوہان روح سا تھا۔ یہ تھا نازو کا نیا گھر۔ اس کے جہیز کا سارا سامان اب تک سلمٰی بھابی کے سسرال میں ہی رکھا گیا تھا۔ ویسے بھی اس گھر میں ایسی جگہ ہی کہاں تھی جو اس کا جہیز یہاں رکھا جاتا۔ اس کے کپڑوں کا صندوق تک وہیں رکھا تھا۔ تو یہ تھی وہ نگری جہاں نازو کو اپنی دنیا بسانی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں ماں باپ سکھی سہیلیوں اپنے دیس سے دور۔ وہ کوئی محلوں کی رہنے والی نہ تھی مگر وہ ایسے کچے گھروں کی بھی مکین نہ تھی۔ پر قسمت!!

ہاں! یہ قسمت ہی کا تو کھیل ہے جس پر کسی کا نا بس چلتا ہے نا اختیار، نا کوئی داؤ نا کوئی پیچ۔ یہ وہ واحد کھیل ہے جس میں ہوتی ہار یا جیت کو نہ وہ بدل سکتا ہے اور نہ ہی روک سکتا ہے۔

☆......☆

وہ نائنتھ اسٹینڈرڈ میں تھی اور کل ان کا پہلا پریکٹیکل ہونا تھا۔ وہ بہت زیادہ ایکسائیٹڈ تھی اور کیوں نہ ہوتی آخر کو وہ ذہین بچی تھی۔

''امی! کل ہمارا پریکٹیکل ہے اور ہمیں یونیفارم نہیں گھر کے عام سے کپڑے ہی پہن کر جانا ہے۔'' اس نے اپنی امی کو پر جوش لہجے میں بتایا۔

''کل اتوار ہے اور اتوار کو کون سا اسکول کھلتا ہے بھلا؟'' سب چونچلے ہیں اور کچھ نہیں۔'' کھانا بناتی نزہت بیگم نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں امی! اتوار ہے تبھی پرنسپل نے ہماری کلاس کو کل بلایا ہے تاکہ سکون و آرام سے وہ پریکٹیکل کروا سکیں۔'' اس نے اپنی ماں کو کل اسکول جانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ اب کل کون سے کپڑے پہن کر جاؤں؟ وہ خود سے مخاطب ہوتی اپنی اور اپنی بہن کی مشترکہ الماری کی جانب بڑھی۔ جہاں ان کے کپڑے موجود تھے۔ فیشن ایبل، نت نئے اسٹائلش سے نہیں بلکہ ڈھیلے ڈھالے گاؤن ٹائپ جن میں سے زیادہ تر اس کی امی نے ہی سیئے تھے بلکہ سیٹنگ کیے تھے یہ کہنا بجا ہوگا کیونکہ وہ کپڑے اس کی امی ہی کے تھے جن کو کانٹ چھانٹ کے اس کے ناپ کا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف کوشش۔ وہ اداس اور پریشان سی اپنے کپڑوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ آج سے پہلے اسے کبھی ان کپڑوں سے اعتراض نہ ہوا تھا۔ پر کل مسئلہ کچھ اور تھا۔ 34,35 اسٹوڈنٹس جن میں زیادہ تر بوائے بھی تھے اور پرنسپل و پریکٹیکل سر کی موجودگی میں یہ اول جھول سا حلیہ۔ ''اف! کیا کروں؟'' وہ حقیقتاً پیشان تھی۔

''الماری کھول کر کیا ڈھونڈ رہی ہے؟'' تبھی پیچھے سے اس کی امی کی پاٹ دار آواز آئی۔

''وہ امی! کل کے لیے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کیا پہنوں کوئی بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''کچھ بھی پہننے کی ضرورت نہیں، کل تم کہیں نہیں جا رہی ہو، پڑھائی کرنے بھیجتے ہیں جو چھ دن ہو جاتی ہے۔ اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں یہ اسکول والے تو بہانے بہانے سے بس پیسے اینٹھنے کے چکروں میں رہتے ہیں۔''

''پر امی کل پریکٹیکل ہے جانا ضروری ہے ورنہ میں پریکٹیکل لکھوں گی کیسے؟'' وہ اب رو دینے کو تھی۔

''کسی دوست وغیرہ سے لے کر لکھ لینا، بس کہہ دیا جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر چل دیں تو نہ جانے کب سے رکے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، پر وہ بھی ان کی ہی بیٹی تھی۔ رات تک ابو کو پریکٹیکل کی اہمیت و ضرورت سمجھا کر وہ راضی کر چکی تھی۔ اسے پریکٹیکل میں جانے کی پرمیشن تو ملی پر اسکول یونیفارم میں ہی۔ اگلے دن وہ اسکول اور اپنی کلاس کی واحد اسٹوڈنٹ تھی جو اسکول کے آف ہونے کے باوجود اسکول یونیفارم میں تھی۔ بہت سے اسٹوڈنٹ نے مذاق بھی اڑایا تو کسی نے کئی سوال بھی کیے پر وہ خاموش رہی اور یہیں سے اس کی زندگی کی نئی شروعات ہوئی۔

☆......☆

وہ ایک عام سا ہی دن تھا۔ گھر کے مرد اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ درنجف نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ جب کہ مسز عقیدت لاؤنج میں بیٹھیں ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ سبزی کاٹ رہی تھیں۔ تبھی وہیں پاس رکھے ٹیلی فون سیٹ کی بیل نے ماحول میں ارتکاز سا پیدا کیا۔ مسز عقیدت نے ریسیور اٹھایا تو معلوم پڑا فون درنجف کے لیے تھا، دوسری جانب اس کی کوئی اسکول فرینڈ تھی جو اس سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ مسز عقیدت نے اسے ہولڈ کروا کر درنجف کو پکارا، گیلے ہاتھوں کو پونچھتی ہوئی درنجف لاؤنج میں چلی آئی۔

''جی ممی! آپ نے بلایا؟''

''ہاں بیٹا! یہ تمہاری کسی اسکول فرینڈ کی کال آئی ہے بات کر لو اس سے۔'' مسز عقیدت نے اسے بلانے کی وجہ بتائی پر اگلے ہی لمحے وہ چونکیں تھیں کیونکہ درنجف کا چہرہ یکدم پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ اس پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

''ممی! کہہ دیجیے میں گھر پر نہیں ہوں۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں جب کہ حیران حیران سی مسز عقیدت جاتی ہوئی درنجف کو دیکھتیں رہیں۔

''اس لڑکی کی حرکتیں میری سمجھ سے باہر ہیں پل میں تولہ پل میں ماشہ مجھے ضحاک سے بات کرنی ہی ہوگی۔'' ریسیور کو پھر سے کریڈل پر رکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا۔ شام کو برابر والے اپارٹمنٹ میں سے قرآن خوانی کا بلاوا آنے پر مسز عقیدت نے درنجف کو بھیج دیا اور خود رات کے ڈنر کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ تبھی اچانک ان کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو کال ملائی۔

''خیریت ممی! اس طرح اس وقت اچانک سے کال؟'' سلام دعا کے بعد ضحاک نے اپنی حیرانی ظاہر کی۔

''ہاں بیٹا! دراصل مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔'' مسز عقیدت کی بات سن کر وہ اور بھی حیران ہوا تھا ایسی بھی کیا ضروری بات ہو سکتی ہے جس کے لیے کال کی رات تک ویٹ نہیں کیا، وہ سوچنے لگا تبھی مسز عقیدت نے اسے آج کے واقعے سے لے کر اور بھی چھوٹی و معمولی باتیں جو نوٹ کرتی آئیں تھیں سے متعلق بتایا۔ ضحاک یکدم مضطرب سا ہو گیا۔ گویا اس نے جو درنجف کی اداسی و خاموشی نوٹ کی تھی وہ وہم نہیں حقیقت تھی

کیونکہ وہی سب اس کی ممی نے بھی نوٹ کیا تھا۔

''ممی! آپ پریشان نہ ہوں میں درنجف سے بات کروں گا اگر اسے کوئی پرابلم ہے کوئی ٹینشن ہے تو میں وہ بھی جاننے کی کوشش کروں گا۔'' ضحاک نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں بیٹا! ضرور پتا کرنا اور ذرا جلدی پتا نہیں کیا بات ہے۔ جو بچی کو پریشان کر رہی ہے اور وہ اندر ہی اندر سب برداشت کر رہی ہے۔'' مسز عقیدت کے لہجے میں ممتا کی مٹھاس تھی جو ضحاک کو اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

☆......☆

وہ کیا تھی؟ کیا سوچتی تھی؟ کیا چاہتی تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ یہ سب باتیں پس پردہ چلی گئی تھیں۔ اسے رشتہ نبھانا تھا اسے یہ گھر بسانا تھا۔ بس یہ ہی بات اسے ازبر رہی۔ کہتے ہیں کہ وقت جیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے مگر یہ کہنا آسان ہے اس وقت کو گزارنا دل گردے کا کام ہے۔ ان کے گھر سے کچھ میل دور موجود گھر سے بجلی کا کنکشن لے لیا گیا تھا۔ وہ بھی شام چھ بجے سے صبح کے چھ بجے تک کے لیے یہ کنکشن بھی اس لیے کیا گیا کیونکہ اس ویرانے میں ان کا گھر اکلوتا ہی تھا۔ ایسے میں کئی آوارہ نشئی سے لڑکے چوری کی غرض سے بارہا ان کے گھر کے آس پاس منڈلاتے، تبھی شاہنواز لغاری نے یہ نام نہاد کنکشن لگایا اور ساتھ میں ڈیوٹی بھی کسی چوکیدار کی نہیں بلکہ خود کی اور اپنی بیوی کی۔ اس کے جہیز کا سامان اب تک سلمٰی بھابی کے سسرال ہی میں موجود تھا حالانکہ اب تو ان کی شادی کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔ وہ جب بھی اپنے جہیز کے سامان میں سے کوئی جوڑا یا کچھ بھی لینے جاتی ہر بار اسے اس میں سے کسی نہ کسی چیز کی غیر موجودگی کا احساس ہوتا، پر اس بار تو اس کے صندوق سے پورے پندرہ جوڑے کم تھے۔ اسے بہت دھچکا لگا اور جب اس نے شاہنواز سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس کے جواب نے اسے خاموش ہی کروا دیا۔

''ہاں! وہ جوڑے میں نے سلمٰی باجی کو دیئے ہیں۔ انہوں نے شادی میں مجھے کچھ پیسے ادھار دیئے تھے جو لوٹانے کے لیے فی الحال میرے پاس نہیں تو میں نے انہیں کہا اپنی پسند کے صندوق میں سے جوڑے لے لو جوڑے آپ کے کام آجائیں گے اور میرا بھی قرض معاف ہو جائے گا۔'' یہ تھا اس کا شوہر اس کا ساتھی اس کا ہمسفر، جس کے لیے اسے یوں پردیس لا پٹخا تھا۔ اپنوں سے دور اور جب وہ کچھ کہنے کو کب کھولتی تو اس کا اٹھتا ہاتھ نازو کے لب سی دیتا ''سمجھوتہ'' یہ لفظ جب کسی رشتے میں آجائے تو رشتہ جیسا بھی ہو بس نبھ ہی جاتا ہے۔ اس نے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا کیونکہ اسے سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ پندرہ دنوں میں ایک بار وہ کراچی لے جاتا تو وہ اپنے رشتے داروں سے مل لیتی، ورنہ چپ کر کے اس ویرانے میں پڑی رہتی۔ یہ سلسلہ بھی بس دو چار مہینے چلا اور پھر پچھلی بار جب وہ کراچی اپنی ممانی کے گھر رکنے آئی تو انہوں نے آگے سے مہنگائی اپنے بچوں کے خرچے و گھر کے اخراجات کا وہ علی الاعلان نقشہ کھینچا کہ نازو نے طے کر لیا اب وہ صرف عید یا کسی خاص تہوار یا تقریب کے علاوہ یہاں نہیں آئے گی۔ حالانکہ یہ وہی نام نہاد رشتے دار تھے جنہوں نے اس کی ماں کو بہت یقین سے بہت مان سے کہا تھا کہ ''نازو یہاں اکیلی کبھی نہیں ہوگی ہم سب ہیں نا۔'' اب وہ کہتی بھی تو کس سے اس کے اپنے پردیس میں تھے اور جو نام کے اپنے تھے، انہوں نے ہاتھ جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ ہاں وقتاً فوقتاً اس کے ماں باپ کا اس کی خیر خیریت پوچھنے کا تار آجاتا کیونکہ اس زمانے میں فون تو عام تھا ہی نہیں، اس لیے وہ بھی بدلے میں چھٹی لکھ کر ٹکٹیں لگا کر لال ڈبے میں ڈال دیتی کہ ہاں یہاں سب خیریت ہے اور وہ بہت خوش ہے حالانکہ خوش اور خوشی

کے دونوں لفظ تو اجنبی بن کر اس کی ذات اور زندگی سے نکل ہی چکے تھے۔

☆......☆

نائنتھ کلاس بہت اچھے نمبرز سے پاس کر کے وہ اب 10th میں آچکی تھی۔ پر 10th میں آتے ہی کچھ وجوہات کی بنا پر اسے پرائیویٹ اسکول سے اٹھوا کر سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ صرف گرلز اسکول تھا۔ نیا اسکول، نیا ماحول، نئی کلاس اسے ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا کیونکہ ایک تو وہ ذہین تھی۔ جس کا ثبوت اس کا 9th کا رزلٹ بتاتا اور دوسرا وہ نیچر کی بہت اچھی تھی اس لیے جلد ہی وہ اپنی کلاس سمیت باقی کلاس یہاں تک کہ اپنی ٹیچرز میں بھی مقبول ہوگئی۔ سب اس کی ذہانت سے متاثر تھے اگر کوئی لاپرواہ تھے تو اس کے گھر والے۔ جنہیں اس کی پڑھائی اس کی ذہانت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی ذات سے بھی۔ وہ اپنی ماں کی پہلوٹھی کی اولاد تھی سگی اولاد اس نے جب سے ہوش سنبھالا اپنی ماں کو اور اپنے گھر کے حالات کو ہمیشہ الجھا ہوا ہی پایا۔ اس نے کبھی اپنی ماں کو خوش نہیں دیکھا۔ کبھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی تیار، اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کی ماں کی تیوری پر ہمیشہ بل پڑے رہتے اور ناک پر ہمہ وقت غصہ دھرا رہتا۔ انہوں نے کبھی بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کبھی کسی بات پر نہ سراہا تھا۔ ان کا انداز ہمیشہ روکھا پھیکا اور سرد سا رہتا اب تو خیر وہ سب عادی ہی ہو چکے تھے۔ ہاں تو یہ اس کے 10th اسٹینڈر کی بات تھی جب C سیکشن کی لائبہ سے اس کی دوستی ہوئی اتفاقاً لائبہ کا گھر اسی کے محلے میں تھا۔ ان کا اسکول 8 منٹ کے ہی فاصلے پر تھا۔ اس لیے وہ اپنی بہن کے ہمراہ پیدل ہی اسکول جاتی۔ اس دن بھی وہ اسکول کی جانب رواں دواں تھی جب راستے میں اس کی نظر لائبہ کے گھر کے گیٹ پر پڑی۔

''شاہی! تم اسکول جاؤ میں ذرا لائبہ کو بلا لیتی ہوں اور اسی کے ساتھ اسکول آجاؤں گی۔'' اس نے اپنی بہن سے کہا۔

''پر آپی! اگر امی کو پتا چلا تو وہ بہت غصہ ہوں گی۔'' اس سے تین سال چھوٹی اس کی بہن شاہی کے لہجے میں ڈر تھا۔

''اف...... امی کو مت بتانا نا پلیز۔ میں ابھی لائبہ کو لے کر اسکول ہی تو روانہ ہوں گی۔'' اس نے اپنی بہن کو سمجھایا اور پھر لائبہ کے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ لائبہ کو اپنے ہمراہ اسکول لے جانے کی غرض سے ہی آئی تھی پر لائبہ کے گھر داخل ہو کر وہ حیران رہ گئی کیونکہ لائبہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اس کی باجی اسے اٹھانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ جب کہ اس کی امی ناشتہ بنا رہی تھیں کہنے کو تو وہ لائبہ کے گھر پہلی بار آئی تھی پر اسے لائبہ کی پوری فیملی نے بہت وی آئی پی والی عزت دی تھی۔ لائبہ اٹھ کر اب اسکول جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی اور اب ناشتہ کرنے کے موڈ میں تھی جبھی اس کی امی چائے کے دو کپ اور پراٹھوں و آملیٹ کی پلیٹ لیے کمرے میں ہی چلی آئیں اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگیں۔ ایک نوالہ لائبہ کو کھلا کر ان کا ہاتھ اس کی جانب بڑھا تو وہ چونکی۔

''نہیں آنٹی! میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔''

''بیٹا! تم بھی میری لائبہ جیسی ہو، اس لیے آنٹی نہیں مجھے امی ہی کہو اور امی کی بات کبھی نہیں ٹالتے۔'' انہوں نے پیار سے کہہ کر نوالہ اس کے منہ میں ڈالا تو اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اس نے ماں دیکھی تھی پر ممتا نہیں، ماں دیکھی تھی پر پیار نہیں۔ وہ لائبہ کی فیملی خاص کر اس کی امی سے بہت متاثر ہوئی

تھی۔ان کی ممتا کی کشش ہی اس ممتا کی پیاسی کو لائبہ کے گھر کھینچ لاتی۔اب وہ صبح تیار ہو کر اسکول کے لیے نکلتی، شاہی کو اسکول اکیلے بھیج کر خود لائبہ کے گھر چلی جاتی اور پھر لائبہ کے ہمراہ ہی اسکول روانہ ہوتی۔ وہ اب خوش رہنے لگی تھی۔لائبہ کے گھر ملنے والی اپنائیت نے اس کی بے رنگ زندگی میں رنگ سے بھر دیئے تھے۔

☆......☆

پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنی طبیعت میں بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔اب بھی وہ فریش ہو کر سونے کی تیاری میں تھی جب کہ ضحاک کمپیوٹر پر شاید کچھ کام کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے نیند آرہی ہے جو اتنی جلدی سو رہی ہو؟'' ضحاک نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں بس تھکن سی ہو رہی ہے۔'' اس نے آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''درنجف! ایک بات پوچھوں؟'' ضحاک کے لہجے کی سنجیدگی نے اسے چونکایا۔اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تو ضحاک کو بیڈ پر بیٹھا پایا۔وہ جھٹ سے لیٹے سے اٹھی۔

''جی پوچھیں۔''

''عام لڑکیوں کی طرح تمہارے بھی کئی سپنے ہوں گے۔تمہارا بھی کوئی آئیڈیل کا امیج ہوگا پر تمہاری زندگی میں، میں شامل ہو گیا تو کیا میں تمہارے آئیڈیل جیسا ہوں؟ یا تمہارا آئیڈیل کیسا تھا؟'' اس نے کبھی آئیڈیل نہیں تراشا تھا بلکہ اس نے سرے سے شادی کے بارے میں بھی کبھی کچھ نہیں سوچا یا چاہا تھا۔وہ تو بس اپنی پڑھائی میں ہی محو رہتی اسے زیادہ پڑھنے کا اور پوزیشن حاصل کرنے کا کریز تھا۔ پر سب ادھورا رہ گیا۔وہ ہولے سے مسکرائی۔ضحاک کو اس کی مسکراہٹ مصنوعی لگی۔

''میں نے کبھی آئیڈیل کے بارے میں نہیں سوچا، زندگی نے آپ کو میرا ہمسفر بنایا ہے تو آپ ہی آئیڈیل ہیں بس۔''

وہ درنجف کے جواب سے مطمئن نہ ہو پایا تبھی اس کے قریب آبیٹھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

''پر پھر بھی کوئی تو تمہارا طلب گار رہا ہوگا۔ کسی کی تم پسند یا کوئی تمہاری پسند تو ہوگا ہی۔'' درنجف نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالا۔اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمایاں تھیں۔

''مجھے نہیں معلوم کسی کے دل و دماغ میں میرے بارے میں کیا تھا پر میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھے تو کوئی چیز پسند کرنے کا بھی اختیار حاصل نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اور لہجے کے اتار چڑھاؤ ضحاک کو واضح محسوس ہو رہے تھے پر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج تو وہ اس کی پریشانی جان کر ہی رہے گا۔

''اچھا کوئی دوست تو ہوگا؟ بلکہ یہ بتاؤ تمہاری سہیلیاں کتنی ہیں؟ اسکول کی، کالج کی، محلے کی، کیونکہ آج تک تمہارے منہ سے تمہاری کسی سہیلی کا نہیں سنا۔'' ضحاک کی نگاہیں اس پر ٹکی تھیں جس کے چہرے پر عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

''چھوڑیں بھی یہ باتیں مجھے سونا ہے۔'' درنجف نے جان چھڑانی چاہی مگر ضحاک کا ارادہ آج اٹل تھا۔

''سو جانا، جانم پر ابھی تھوڑی باتیں تو کر لو۔اچھا یہ بتاؤ تم نے کبھی اسکول یا کالج جان بوجھ کر Bunk کیا ہے مطلب جھوٹ بول کر؟''

''آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟'' درنجف کی تیوری پر غصے سے بل پڑ گئے۔

''میں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا؟'' ضحاک کا لہجہ تشویش ناک تھا۔کچھ بھی جواب دیئے بغیر درنجف خاموشی سے

لیٹ گئی۔ضحاک کو لگا وہ ہار گیا ہے۔وہ کچھ جاننے کی جستجو میں تھا پر یہاں تو قفل کھل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ اس کے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔

''اچھا تمہیں پتا ہے میں بچپن میں ممی کا بہت لاڈلا تھا۔جب کہ آپی پاپا کی گڑیا تھی۔میں نے سنا ہے بیٹیاں باپ کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔تم بھی انکل کی لاڈلی رہی ہوگی نا یا پھر آنٹی کی؟ ویسے تمہیں بچپن میں کس نک نیم سے پکارتے تھے؟'' درنجف جو منہ موڑے چپ چاپ رونے میں مگن تھی ضحاک نے جھٹ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا تو چونک پڑا، مسلسل بے آواز رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں جب کہ سانس بھی اکھڑ رہا تھا۔اس نے درنجف کو سہارا دے کر بٹھایا اور سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ گلاس کو تھامتی وہ خود ہی ضحاک کی بانہوں میں کسی کٹے شہتیر کی طرح گر پڑی۔ ضحاک حیران پریشان اپنی گود میں بے ہوش پڑی درنجف کو تکتا رہا، جب حواس قابو میں آئے تو اس نے ممی پاپا کو آوازیں دے کر جگایا اور پھر درنجف کو اسپتال لے کر چلا آیا۔

''ان کی یہ حالت اسٹریس کی وجہ سے ہوئی ہے ایسی کنڈیشن میں جب کہ وہ پریگنینٹ ہوں ان کے لیے اسٹریس فل رہنا یا انہیں اسٹریس دینا مدر اور بے بی دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' ضحاک علوی حیران سا ڈاکٹر کی بات سنتا رہا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ خوشی کا اظہار کرے بھی تو کیسے؟ اتنی بڑی بات انہیں پتا چلی بھی تو ایسے۔درنجف کے ہوش میں آتے ہی ضحاک نے اس سے سوری کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا درنجف کی طبیعت خرابی کا باعث اس کی باتیں ہی بنی تھیں۔ سب بہت خوش تھے آخر کو علوی فیملی میں نئے مہمان کی آمد ہونے والی تھی۔مسز عقیدت نے اس کی بلائیں لیں۔صدقے اتارے اور پھر کسی بھی طرح کا اسٹریس نہ لینے اور کوئی بھی کام نہ کرنے کی سخت گیر ہدایت بھی جاری کر دی تھی۔ سب خوش تھے مطمئن تھے پر ایسے میں ایک ذہن ایسا بھی تھا جو بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر بھی خوشی تھی۔ مسکراہٹ بھی تھی پر اندرونی طور پر وہ مضطرب سا تھا۔اس کا ذہن منتشر و الجھا ہوا تھا۔

☆......☆

گیس بجلی کی سہولیات کے ساتھ پختہ مکان میں رہنے کی عادی ہونے کے باوجود اسے یہاں اس سنسان بستی کے ویران سے گھر میں کھلے صحن جس کی چھت کی جگہ تپتا سورج آگ برساتا سایہ فگن موجود تھا۔رہنا پڑ رہا تھا۔کیوں کہ یہ ٹوٹی کچی دیواروں سے بنا گھر ہی اس کا واحد ٹھکانا تھا۔اس انجان شہر بلکہ اس دیس میں اس نے لکڑی و کوئلے کبھی جلائے نہیں تھے اور ان پر کھانا پکانا تو دور مگر اسے یہاں یہ سب کرنا پڑا۔کیونکہ یہاں نہ کوئی اپنا تھا جس سے فریاد کرتی نہ لاڈ اٹھانے والا۔جلتی و برستی آنکھوں پر صبر کے چھینٹے گرائے کھانستے گلے کے ساتھ وہ بہ مشکل کھانا بنا ہی لیتی۔آخر اب یہ سب تا عمر کرنا ہی تھا۔وہ تن تنہا سارا دن اس ویرانے میں پڑی رہتی۔ شاہنواز صبح اپنے کام پر جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا جاتا۔ یہ چوروں سے بچنے کی احتیاط تھی یا اسے قید میں رکھنے کی تدبیر وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔شاہنواز صبح کا گیا شام کو ہی لوٹتا اس نے کبھی اپنی مصروفیات کا نہ بتایا اور نہ ہی نازو نے پوچھا۔وہ دونوں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔گھر سے راشن سے متعلق کوئی بات کرنا ہوتی تو کر لی۔ ورنہ دونوں چپ کی بکل مارے یوں بیٹھے ہوتے جیسے ان کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا وجود موجود ہی نہیں۔یہ تھی اس کی زندگی بلکہ شادی شدہ زندگی اپنوں سے دور، انجان شہر میں، انجان جگہ، انجان آدمی کے ساتھ جسے دنیا کی نظر میں شوہر ہمسفر کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کی شادی کو چھ ماہ بیت چلے۔ اس عرصے میں بارہا اس کے سسرال والے گاؤں سے آتے رہے وہ اپنی ساس نندوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھی پر کچھ کچھ الفاظ وہ سمجھ لیتی رفتہ رفتہ وہ جان گئی کہ اس شادی کو لے کر شاہنواز کے گھر والے خوش نہیں وہ اس کی شادی اپنے رشتے داروں میں کروانے کے خواہش مند تھے جب کہ شاہنواز کو بھی اپنی ہوئی اس شادی میں کوئی انٹرسٹ نہ تھا۔ جیسے پیٹرول ختم ہوجانے کے بعد کچھ دیر تک گاڑی کو دھکا مار کر چلایا جاتا ہے۔ یونہی ان کی شادی شدہ زندگی دھکا مار کر بس گزر رہی تھی۔ دن، رات، ہفتے، مہینے اور پھر سال آگے پیچھے دوڑتے آگے نکل پڑے۔ ان ڈھائی سالوں میں وہ کسی حد تک سمجھوتا کر چکی تھی۔ ماں باپ پھر پلٹ کر پاکستان نہ آئے۔ نہ وہ جا سکی البتہ آنے والے خطوں سے اسے خیر خیریت کے ساتھ یہ بھی پتا چل گیا کہ اس کی بہن فرحت کی شادی رشتے داروں میں ہوچکی جب کہ مدحت کی بھی عنقریب شادی ہونے کو تھی اس کی پھپھو کے بیٹے سے۔ وہ خوش تو ہوئی پر اداس بھی کہ وہ شریک نہیں ہوسکی پر اس سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا رہا کہ اس کی شادی بھی تو وہیں کہیں کسی بھی رشتے دار میں ہوسکتی تھی پھر اتنی جلدی کیا تھی اسے یہاں ویرانے میں پٹخنے کی۔ یہ دکھ اول روز سے اندر ہی اندر دیمک کی طرح اسے کھوکھلا کرتا جا رہا تھا۔

☆......☆

رواج کے مطابق آخری ماہ سے لے کر بچے کی پیدائش اور باقی کا سوا مہینہ لڑکی اپنے میکے میں گزارتی ہے۔ پر درنجف نے میکے جانے سے انکار کردیا اور سونے پر سہاگا اس کے میکے والوں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ بس کبھی کبھار اس کے والد ہمراہ اس کی بہن کے چلے آتے، حال احوال لیتے کچھ فروٹ یا جوس وغیرہ دے جاتے، مسز عقیدت کو یہ سب دیکھ کر اچنبھا ہوتا، پر وہ خاموش تھیں کہ جس میں بہو کی خوشی۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے اسے کسی بھی قسم کا اسٹریس لینے سے صاف منع کیا تھا۔ مسز عقیدت نے سارے کام ملازمہ اور اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ یہاں تک کہ ضحاک کو بھی ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ درنجف سے کسی بھی ایسے ٹاپک پر بات نہ کرے جس سے اس کی صحت پر اثر پڑے۔ اسی لیے ضحاک نے اپنی الجھنیں اپنے تک ہی محدود کرلی تھیں۔ زندگی یکدم مصروفیت کی پگڈنڈی پر دوڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک دن آتا اور گزرتا چلا جا رہا تھا اور پھر وہ دن بھی چلا آیا، جب درنجف ماں کے عہدے پر فائز ہوگئی اس نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ علوی فیملی میں تو خوشی کا سماں تھا سبھی خوب چہک رہے تھے یہاں تک کہ اسکائپ پر بات کرتیں صباعنہ آپی بھی بہت خوش اور پر جوش سی نظر آتیں آخر کو وہ پھپھو جو بن گئی تھیں۔ درنجف کے میکے والے بھی تحفے تحائف و مٹھائی لے کر آئے تھے۔ اس کے بہن بھائی سمیت سبھی خوش نظر آرہے تھے۔ صباعنہ نے اپنے لاڈلے بھتیجے کا نام ضرغام اور بھتیجی کا نام ضحیٰ رکھا تھا۔ درنجف کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ جانتی تھی علوی فیملی میں بچوں کے نام یونیک ہی رکھے جاتے تھے۔ دونوں ہی بچے دادا، دادی، پاپا سمیت نانا، نانی الغرض سبھی کے بے حد لاڈلے تھے۔ مسز عقیدت کو تو ضرغام میں ضحاک کا بچپن دیکھتا جب کہ معیث علوی صاحب کو ضرغام علوی خاندان کا چشم و چراغ نظر آتا۔ جب کہ درنجف کے ساتھ معاملہ الٹا تھا۔ وہ دونوں بچوں کے ہر کام میں پہلے ضحیٰ کے کام کو ترجیح دیتی۔ دونوں روتے تو ضحیٰ کے کام کو ترجیح دیتی۔ دونوں روتے تو ضحیٰ کو پہلے اٹھا کر چپ کرواتی، فیڈ کروانا ہوتا تو پہلے ضحیٰ کو کرواتی۔ پھر ضرغام کو گود میں لیتی۔ یہ بات مسز عقیدت نے بھی نوٹ کی تھی اور ضحاک نے بھی نوٹ کی تھی کہ درنجف کا جھکاؤ بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کی طرف زیادہ تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو فی الحال اگنور کیا جا رہا تھا پر آخر کب تک۔ اس دن تو حد ہی ہوگئی جب پانچ ماہ کی ضحیٰ کے رونے کی آواز سن کر کچن میں کام کرتی درنجف چولہے پر پکتی آلو گوشت کی ہانڈی یونہی چھوڑ کر

ضحیٰ کو سنبھالنے میں مصروف ہوگئی۔ پورے گھر میں جلنے کی بو پھیلی تو اپنے کمرے میں آرام کرتیں مسز عقیدت باہر آئیں جہاں آلو گوشت دیگچی میں چپک کر کالا ہوچکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ درنجف کے کمرے میں تھیں۔ جہاں ضرغام تو سو رہا تھا جب کہ ضحیٰ بھی شاید سو چکی تھی پر درنجف اسے گود میں لیے تھپک رہی تھی۔

''بہو بچے ہم نے بھی جنم دیئے پر اردگرد سے بے نیاز ہوکر بچوں کو لے کر نہیں بیٹھے رہے۔'' ڈھائی سال میں پہلی بار مسز عقیدت کا لہجہ غصیلا ہوا تھا۔ ایک پل کو درنجف بھی چونکی پھر اپنی گود میں سوئی ضحیٰ کو کاٹ میں لٹایا اور مسز عقیدت کے ہمراہ روم سے باہر چلی آئی اور خاموشی سے کچن کی طرف چل دی۔ درنجف نے ساس کی بات کا جواب دیئے بغیر اسے سنا ان سنا کردیا۔ مسز عقیدت بھی کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہیں پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ درنجف کی حرکتوں سے تنگ آچکی تھیں کبھی کپڑے دھوتے نل کھلا چھوڑ بچوں کے پیچھے بھاگتی تو کبھی چولہا کھلا چھوڑ کر۔ الغرض وہ بچوں خاص کر ضحیٰ کے لیے حساس ہوتی جا رہی تھی۔ مسز عقیدت بھی ماں تھیں وہ ممتا کو سمجھ سکتی تھیں۔ پر اب وہ پریشان تھیں کہ درنجف کی ممتا جنون کی حد اختیار کرتی جا رہی ہے اور جنون کسی بھی چیز کے لیے ہو خطرناک ہی ہوتا ہے وہ اس چیز اور انسان کو اس حد پر لے جا کر کھڑا کردیتا ہے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔

☆......☆

ان کے سنسان علاقے میں موجود بیری کے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹ کر اب پلاٹ فروخت و زیر تعمیر ہو رہے تھے اس لیے شاہنواز لغاری نے اندرون شہر کے ایک بہتر علاقے میں کرائے پر گھر لے لیا۔ یہاں گیس، بجلی کی بھی سہولت دستیاب تھی۔ یوں وہ لوگ یہاں رہنے لگے۔ ویسے بھی اس کی مثال روبوٹ کی طرح تھی۔ جہاں چلنے کو ساتھ کہہ دیا وہ ساتھ ہولی اسے کہا جاتا اٹھو وہ اٹھ بیٹھتی وہ اسے بلاتا تو وہ پاس چلی جاتی۔ گویا وہ ایک مشینی زندگی گزار رہی تھی جس کا ریموٹ شاہنواز کے ہاتھ میں تھا۔ ایسے میں پے در پے سسرال سے ملنے والے طعنے ''بانجھ'' یہ لفظ کتنا بھاری ہے اس کا ادراک صرف وہی عورت کرسکتی ہے جسے یہ طعنے شوہر کے سامنے ملتے ہوں حالانکہ بانجھ بننا عورت کے اختیار میں نہیں اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے مگر لب خاموشی لیے ہوتے۔ وہ شکوہ شکایت سے کنارہ کشی کرچکی تھی۔ انہی دنوں جب وہ بانجھ لفظ کی تکراروں میں الجھی ہوئی تھی قدرت اس پر تین سال بعد مہربان ہو ہی گئی۔ وہ جوان تین سالوں میں اپنوں کو بھلائے غیر و اجنبی شہر اور لوگوں میں اپنوں کو ڈھونڈتی رہی تھی تخلیق کے عمل سے گزرتے اسے شدت سے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ درد کی حالت میں بھی اس کی زبان پر اپنی ماں ہی کی پکار تھی۔ ان کی مالک مکان کافی ہمدرد اور اچھی خاتون تھیں۔ اس نے بخوبی ایک بڑی بہن ہونے کا فرض نبھایا تھا۔ نازو کو مالک مکان خاتون کی صورت ایک سہارا سا مل گیا تھا۔ تکلیف میں درد سے کراہتے اپنی ماں کو پکارتے وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی، مصروفیت یکدم بڑھ گئی تھی وہ گھر اور بچی کے کاموں میں سہارا دن لگی رہتی۔ بیٹی کی ہی سہی ماں بن جانے پر اس کے سسرال والوں نے بانجھ ہونے کا طعنہ اور شاہنواز کی دوسری شادی کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ جب کہ شاہنواز کی زندگی میں بھی ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ بچی ہی کے سبب وہ معتبر تو ہونے لگی تھی۔ اپنی بیٹی ہی کی خاطر وہ نازو کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ اپنی بیٹی کے لیے کچھ لاتا تو اس کی ماں کے لیے بھی ضرور لاتا۔ نازو کی بیٹی بمشکل ڈیڑھ سال کی ہی ہوئی تھی کہ اس نے ایک بیٹے کو جنم دے کر سسرالیوں کی زبان کو تالا لگادیا۔ انہی دنوں وہ گنجان علاقہ جہاں شاہنواز کا گھر تھا آباد ہونے لگا تو شاہنواز نے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس گھر کے فرش و دیواروں پر پلستر کروانا

شروع کردیا۔ ساتھ ہی چھت ڈال کر صحن کے ایک کونے میں باورچی خانہ بھی بنوالیا۔ دو سال کی بیٹی اور کچھ ماہ کے بیٹے کو گود میں اٹھائے وہ ایک بار پھر اسی گھر میں چلی آئی جواب قدرے بہتر تھا۔ وقت بیتتا چلا گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال آگے پیچھے وقت کے کشکول میں گرتے رہے۔ نازو اب چار بچوں کی ماں بن چکی تھی کہنے کو تو وہ چار بچوں کی ماں کہلائی پر ان چار بچوں کی ماں نہ بن پائی کیونکہ وہ شاہنواز کے جو بچے تھے اندرونی طور پر ایک سرد سی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور جنگ چاہے جیسی بھی ہو ہمیشہ تباہی پھیلاتی ہے۔

☆......☆

انسان کے اندر اداسی ہو تو اس کا اثر آنکھوں کے راستے ہوتا ہوا کائنات کے ایک ایک عنصر و منظر میں پھیل جاتا ہے۔ گویا آنکھیں اندر کے موسم کی عکاسی کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح درنجف کی آنکھوں میں بھی اداسی، افسردگی اور عجیب سا خالی پن نمایاں ہوتا اس کے وجود کو ڈھانپ لیتا۔ دسمبر کی اس صبح میں خاصی دھند تھی اور دھند میں اپارٹمنٹ کے قریبی پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرہ نم ہو جاتا۔ عجیب سی خشک سردی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو رگڑ کر حرارت پیدا کرتے ہوئے درختوں کی اوٹ سے جھانکتی سورج کی کرنوں کو دیکھا۔ دھوپ میں حدت نہیں تھی اور ابھی سورج کو نکلے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وقت گویا رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ تند و تیز ہواؤں کی طرح تیزی سے سوچوں میں مگن تھا۔ دھند میں لپٹے ہوئے موسم کی طرح جیسے سارے ہی منظر دھندلائے ہوئے تھے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا وہ جتنا بھی سوچتا جس طرف بھی دیکھتا۔ کوئی سرا کوئی جواب نہ مل پاتا۔ گویا ہر طرف دھند ہی دھند تھی اور اسے اس گرداب سے درنجف کو نکالنے کی کوئی صورت کوئی راہ نظر ہی نہ آتی۔

سورج چاچا بھی کبھی بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے سوچوں میں گم ضحاک کو تکتے اور پھر سے بادلوں کی گود میں جا سوتے۔ کہتے ہیں غم اور زبان کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ غم میں جتنی شدت اور گہرائی ہوتی ہے زبان اتنی ہی زیادہ بند اور خاموش رہتی ہے اور ڈھائی سال سے درنجف کی بند زبان اور خاموش آنکھیں ضحاک کو واضح کر چکی تھیں کہ غم میں کتنی شدت اور گہرائی ہے۔ ان ڈھائی سالوں میں سب کچھ ویسا ہی تھا کہیں کچھ نہیں بدلا تھا سوائے ایک بات کے کہ درنجف کبھی کبھار کچھ گھنٹوں کے لیے ہی سہی بچوں کے ہمراہ اپنے میکے چلی جاتی یا پھر اس کے ابو چلے آتے اور بچوں کو ہمراہ لے جاتے کچھ دیر گھما پھرا کر بچوں کی چیزیں دلوا کر واپس چھوڑ جاتے۔ ضحاک اپنی سی تمام کوششیں کر کے اب تھکنے لگا تھا۔ پر درنجف کی جامد خاموشی ٹوٹ کر ہی نہ دے رہی تھی۔ مسز عقیدت نے بھی تھک کر بہو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ پر اب ضحاک نہیں چاہتا تھا کہ درنجف کی خاموشی کا اثر اس کے بڑے ہوتے بچوں اور گھر پر پڑے تبھی اسے اپنے ایک دوست (آفاق) کا خیال آیا وہ نا صرف ایک مشہور سائیکاٹرسٹ تھا بلکہ اس کا دوست بھی تھا۔ دونوں نے ایک ہی اسکول اور پھر کوچنگ سے پڑھا تھا گو کہ یہ پرسنل باتیں ہر کسی سے شیئر کرنے کی نہیں ہوتیں پر اگر ان باتوں کی تہہ تک نہ پہنچا جائے تو زندگی میں مضبوط رشتے کی مضبوط دیواریں کھوکھلی سی پڑ جاتی ہیں اسی لیے ضحاک کے قدم اس وقت مشہور سائیکاٹرسٹ، دوست کے کلینک کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر آفاق نے اس مسئلے کو بہت گہرائی سے جانچنے کے بعد ضحاک کو ہی اس معاملے کی گہرائی میں اترنے کا راستہ دکھلایا تھا۔ بقول آفاق کہ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جنہیں اس راز سے واقفیت ہو جائے کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں تھیں۔ ضحاک کو بھی اب پرانی بنیادوں کو دریافت کر کے پر اعتماد و مضبوط نئی بنیادوں کو تعمیر کرنا تھا۔

☆......☆

وقت کا سرپٹ گھوڑا بہت تیزی سے دوڑنے میں مصروف تھا۔ کبھی دن پر رات حاوی ہو جاتی تو کبھی رات کی چادر کی اوٹ سے دن کی روشنی چھلک پڑتی۔ اس دن و رات کی ہیر پھیر میں گھڑی کی سوئیاں اور کیلنڈر کی تاریخ بدلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ علوی فیملی ناشتے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ممی، ضرغام کو تو درنجف، ضحیٰ کو سریلیک کھلا رہی تھی۔ پاپا نیوز پیپر پڑھنے کے ساتھ ساتھ چائے کا کپ بھی ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔ جب کہ ضحاک آفس جا چکا تھا۔ ماحول ایک دم پرسکون سا تھا، پر اس پرسکون سے ماحول میں ارتکاز ضحاک کی اچانک آمد کی وجہ سے پھیلا۔ درنجف کے بھائی (حذیفہ) کو پولیس نے اریسٹ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ حذیفہ کی عادتیں بگڑی ہوئی تھیں وہ اسموکنگ بھی کرتا تھا۔ پر چوری جیسے فعل میں پکڑا جانا ضحاک سمیت علوی فیملی دونوں کو ہی دھچکا لگا تھا۔ معیث علوی تو ناشتہ کرتے ہی آفس کے لیے نکل گئے تھے پر جانے سے پہلے انہوں نے اپنی بیگم کو بہو کے میکے جانے کی بھی خاص تاکید کی تھی۔

"بیٹا! تم ذرا بچوں کو سنبھالنا میں اور درنجف اس کے میکے ہو آتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہماری وہاں موجودگی لازمی ہے۔" انہوں نے ضحاک کو ہدایت دی۔

"اور درنجف بیٹا! آپ بھی ریڈی ہو جاؤ میں بھی ڈریس چینج کر لوں پھر چلتے ہیں۔" اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بہو کو بھی تاکید کی۔ ضحاک منتظر تھا کہ درنجف کچھ کہے کچھ نہیں تو کم از کم اس پریشانی کے موقع پر رو لے مگر وہ پرسکون سی بیٹھی بچوں کو سریلیک کھلانے میں مگن تھی۔ گویا کچھ دیر پہلے کہی جانے والی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

"درنجف! تم نے سنا نہیں ممی نے کیا کہا؟ بچوں کو چھوڑو ان کو میں سنبھال لوں گا تم جا کر ریڈی ہو جاؤ۔" ضحاک نے درنجف کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال جانا ضروری نہیں گھر میں اور بھی دس کام ہیں۔" سریلیک کا خالی باؤل اور دیگر برتن سمیٹتے ہوئے درنجف نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ "واٹ ڈو یو مین تم نہیں جا رہی، وہاں جانے سے زیادہ ضروری ہیں یہ کام......؟" ضحاک نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نرم رکھا۔ درنجف نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ شاید تبھی کچن کی راہ لی۔ اتنے میں مسز عقیدت بھی ڈریس چینج کر کے لاؤنج میں چلی آئیں۔

"ہائیں......تم ریڈی نہیں ہوئیں......؟" "آپ ہی سمجھائیں ذرا، اس بے وقوف لڑکی کو، یہ جانے سے انکاری ہے۔" ضحاک نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مسز عقیدت کو بیچ میں گھسیٹا۔

"درنجف بیٹا! کیا بات ہے؟ تمہارا بھائی مصیبت میں ہے۔ تمہاری فیملی کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔ اور تم جانے سے انکاری ہو۔ آخر کیوں؟" وہ درنجف کا ہاتھ تھامے کچن سے باہر لے آئیں۔ پیار سے، غصے سے، اصرار کر کے الغرض ہر طریقے سے دونوں ماں بیٹے نے درنجف کو سمجھایا۔ بالآخر جھنجھلا کر ضحاک اپنی ممی کو ہی درنجف کے میکے چھوڑ آیا۔ پر آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دو ٹوک بات کر کے سب کچھ جان کر ہی رہے گا۔ وہ گھر آیا تو درنجف، ضرغام کو نہلا کر اب تیار کر رہی تھی جب کہ پاس ہی بیڈ پر ضحیٰ تیار شیار ہو کر اپنے کھلونوں میں مگن تھی۔ ضرغام کے تیار ہوتے ہی ضحاک نے آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور دونوں بچوں کو اس کے حوالے کر دیا۔

''آپ کچھ دیر بچوں کو سنبھال لیں۔'' ملازمہ جب دونوں بچوں کو باہر لاؤنج میں لے گئی تو ضحاک اٹھ کر درنجف کی سمت آیا جواب بچوں کے کپڑے اور کھلونے سیٹ کر رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر درنجف کے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور اسے اپنے ہمراہ لیے بیڈ کی سمت چلا آیا۔

''کیا بات ہے؟'' درنجف نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بات کیا ہے یہ آج تم بتاؤ گی اور سب کچھ بتاؤ گی۔'' ضحاک نے پیار سے اسے اپنے برابر بٹھاتے اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ درنجف نے بہت غور سے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا گویا آج اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

''ضحاک! آپ چھوڑیں نا یہ سب میں نے ابھی کھانا بھی بنانا ہے۔'' درنجف نے جھٹ سے بات بدلنی چاہی۔

''یہ کام بھی ہو جائے گا۔ پر آج خلاصہ ہو کر رہے گا۔ اتنے سالوں میں میرا ساتھ کوئی ایک پل ایک لمحہ تمہارے لیے اپنائیت لایا ہو تو اس کی خاطر آج مجھے تم اپنا دکھ، اپنی تکلیف، اپنا احساس سونپ دو پلیز۔'' ضحاک کا انداز التجا آمیز تھا۔ کچھ ضحاک کا انداز ایسا تھا اور کچھ وقت کا تقاضا کیونکہ درنجف بھی ماضی کی یادوں کا بوجھ اٹھائے تھکنے لگی تھی اس کی اندر کی گھٹن باہر آنے کو بے تاب تھی اور وہ ماضی کے ساغر میں ضحاک کے ہمراہ اترتی چلی گئی۔

☆......☆

''میرے امی ابو کی شادی مکمل طور پر ارینج تھی۔ ارینج بھی ایسی کہ میری امی جو انڈیا سے تعلق رکھتی تھیں اور ابو اندرون سندھ سے ان دونوں کو قسمت نے اچانک سے ملا دیا۔ آخر کو قسمت کے آگے کہاں کسی کا بس چلتا ہے۔ قسمت جو دے جیسا دے سمجھداری تو اسی میں ہوتی ہے نا کہ انسان خوشی سے اسے قبول کرلے، کیونکہ دوسرا کوئی راستہ نہیں بچتا۔ پر میرے ابو شاہنواز لغاری اور امی نازو عرف نزہت بیگم دونوں نے قسمت کے اس لکھے کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ اولاد جیسی نعمت پا کر بھی دونوں نے اس بندھن سے سمجھوتا نہ کیا۔ میرے والد مذہبی تھے مگر صرف گھر کی بیٹی کے لیے ان میں غیرت ٹوٹ ٹوٹ کر بھری تھی۔ پر صرف بیٹی کے لیے ان کے لیے بیٹیوں کو سر تا پا ڈھانپ کر سات پردوں میں چھپا کر رکھنا، ان پر بے وجہ حد درجہ کی پابندی لگانا ہی۔ عزت و غیرت کی بات تھی دو بیٹیاں پا کر خوش تو تھے پر انہیں لگتا یہ ایک بوجھ ہے جو سینے پر دھرا ہے۔ انہوں نے ہمیں اسکول تو بھیجا پر بہت سی نصیحتوں کے ساتھ۔ رہی میری امی تو انہوں نے بچوں کو پیدا تو کرلیا پر پرورش کرنا بھول گئیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں انہیں چھوٹے بڑوں کی تمیز سکھلانا، آپ جناب سے بات کرنا سکھلانا یا ان بہن بھائیوں کو پیار محبت کے بندھن میں باندھنا یہ وہ یکسر فراموش کر گئیں۔ نتیجتاً ہم سب بہن بھائیوں میں باہمی محبت تو دور البتہ لڑائی جھگڑے کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔ باجی آپی یا بھائی جان کا سابقہ بھلائے ہم ایک دوسرے کو تو اور ناموں سے پکارتے۔ الغرض تربیت و پرورش میں میرے والدین نے توجہ دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھول گئے کہ ان کے بچے بھی ہیں جو بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی کچھ ضروریات بھی ہیں۔ انہیں ہمہ وقت یاد رہتا تو صرف اتنا کہ قسمت نے ان کے ساتھ یہ مذاق کر کے ان دو اجنبی کو ایک سفر کا ہمسفر و ہمقدم بنا دیا۔ اسی تکرار، اسی اختلاف اور اسی اعتراض کو لیے وہ دونوں مخالف سمت محو سفر رہے جس کا اثر ہم سب پر پڑتا رہا۔ میری امی یہ بھولتی گئیں کہ اب وہ صرف کسی کی بیٹی اور بیوی نہیں رہیں، بلکہ وہ اب دو بیٹیوں کی ماں بھی ہیں۔ ان کا چہرہ نہ کبھی کھلا ہوا دیکھا۔ نہ

مسکراتا ہوا۔ ہمیشہ سپاٹ، غصیلا اور تیوری پر بل۔ میرے والدین نے ہم پر خاص کر اپنی بیٹیوں پر نہ کبھی اعتبار کیا نہ اعتماد دیا اور یوں ہماری شخصیت ٹوٹنے اور بکھرنے لگی۔ ہماری ضرورتوں میں، ہماری کامیابی میں، ہمیں ایک ماں کی ان کی ممتا کی جب جب ضرورت پڑی اور ہم نے ارد گرد نظر دوڑائی تو نظر اور طلب خالی ہی لوٹی کیونکہ ماں باپ تو تھے ان کا نام بھی تھا وجود بھی تھا۔ پر احساس نہ تھا۔ اپنائیت نہ تھی، ممتا نہ تھی، شفقت نہ تھی اور ہم ہمیشہ تہی داماں و تشنہ ہی رہے۔'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ رک گئی۔ ضحاک کو لگا وہ آگے ایک لفظ بھی نہ بول پائے گی۔ اس کی آنکھوں میں غموں کا سیلاب یوں اتر آیا کہ ضحاک کا جی چاہا جو کچھ بھی بیتا ہے وہ بھول جائے، جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سب کچھ ذہن سے نکل جائے، اس کے تلخ ماضی کی یادوں کو کاٹ کر وہ اس کی زندگی سے دور پھینک دے۔ پر بھلا یہ کب ممکن تھا۔ اگلے پل وہ پھر سے بولنے پر اتر آئی۔

''لائبہ سے میری دوستی میٹرک میں ہوئی۔ میں اس لڑکی سے متاثر ہوئی کہ نہیں پر میں اس کے گھر، ماحول اور فیملی خاص کر اس کی امی سے مل کر گویا مکمل سی ہو گئی۔ ممتا کی ترسی کو لائبہ کی امی کے روپ میں ممتا کا پورا شجر مل گیا تھا۔ ان دنوں میں بہت خوش رہتی پر یہ خوشی بھی عارضی رہی۔ لائبہ سے دوستی اور اکثر اس کے گھر جانے کا علم میری فیملی کو کیا ہوا، گویا طوفان آچلا۔ ان کے نزدیک لائبہ اچھی لڑکی نہ تھی کیونکہ اس کی امی نے دوسری شادی کی ہوئی تھی۔ لائبہ کے والد کی ڈیتھ کے بعد یہ ان کی دوسری شادی تھی، پر ان کے دوسرے شوہر کی بھی حادثاتی طور پر ڈیتھ ہو چکی تھی۔ الغرض اس بات کو ایشو بناتے ہوئے میری دوست، اس کی والدہ سمیت مجھ پر بھی انگلی اٹھائی گئی کہ میں خود ایسی بدکردار ہوں جو مجھے ایسی ہی دوست پسند آئی۔ اس دن پہلی بار میری زبان کھلی تھی ان کے خلاف اور پھر تو سارا الزام لائبہ کی سنگت اور اس کی والدہ کے زیر سایہ رہنے پر لگ گیا۔ وقت تھوڑا اور سرکا، اب میں فرسٹ ایئر میں آچکی تھی۔ یعنی جوانی میں قدم رکھ چکی تھی پر اس کے ساتھ ہی مجھ پر پے در پے پابندیاں لگ گئیں۔ جیسے چھت پر نہ جانا، گیٹ پر نہ جانا، موبائل فون نہ اٹھانا، چاہے کسی کا بھی فون آئے، نہ کسی دوست سے دوستی رکھنا، نہ اسے گھر بلانا اور نہ ہی اس کے گھر جانا۔ کالج جو صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہی تھا۔ وہاں تک چھوڑنے اور لینے بھی امی ہی آتیں۔ گویا اتنا بھی بھروسا نہ تھا اور ساتھ ہی طعنے اس کی پڑھائی مکمل ہو تو یہ روز کے باہر کے چکر ختم ہوں۔ یہ عذاب ٹلے تو راحت ملے۔ چھوٹی شاہی تو ابھی نائنتھ میں تھی اس لیے وہ آزاد تھی جب کہ دونوں بھائیوں پر تو نہ کبھی کوئی پابندی لگی تھی نہ ہی کوئی تنقید۔ الغرض یہ رولز صرف بیٹیوں اور خاص کر میرے لیے ہی بنائے گئے اور لاگو ہوتے تھے۔ ان دنوں مجھے غصہ آتا، چڑچڑا پن مزاج پر حاوی رہتا۔ باقی دوستوں سے جب ان کی گھریلو باتیں اور والدہ کی بھرپور ممتا سے بھرے قصے سنتی تو حسرتیں سر اٹھاتیں۔ جب کسی دوست کے منہ سے فلموں گانوں کی باتیں نکلتیں تو تصور کی آنکھ سے خود کو ٹی وی کے آگے براجمان دیکھتی کیونکہ باقی پابندیوں کی طرح گانے سننے تو دور گنگنانے کی بھی پرمیشن نہ تھی کہ کہیں میں گلوکارہ ہی نہ بن جاؤں۔ چوڑی دار، ہاف سلیوف پہننے کی اجازت نہ تھی کہ کہیں میں رقاصہ نہ بن جاؤں۔ چھت یا باہر جانے پر یوں پابندی تھی گویا کسی پرندے کی طرح اڑ ہی نہ جاؤں اور ان دنوں سچ پوچھیں تو میں پرندوں کو خوش قسمت سمجھتی۔ کیونکہ وہ ہر قید و پابندی سے مبرا بہ آسانی کہیں بھی اڑ جاتے۔ جہاں دل چاہتا پہنچ جاتے۔ میں ایک جیتا جاگتا وجود تھی۔ پر مجھے بے جان پتلا سمجھ کر کسی کونے میں رکھ چھوڑا تھا۔ لڑکیاں ایسے حالات میں خود کو قیدی محسوس کرنے لگتیں ہیں جب ان پر سختی اور حد سے بڑھ کر پابندی لگ جائے۔ ایسے میں وہ باغیانہ خیالات کا شکار ہو کر کبھی کبھار ایسا قدم بھی اٹھا لیتی ہیں جو ان کو سچ مچ تباہی کے گڑھے کی جانب لے جاتا ہے۔ تاریکیوں میں گھری مجھے روشنی کی تلاش تھی

اورلائبہ کے گھر مجھے وہ روزن ملتا، وہ روشنی ملتی جس کی مجھے اندرونی طور پر ضرورت تھی اور یوں فرسٹ ایئر کی کچھ کلاس Bunk کر کے میں اس کے گھر جانے لگی۔ مجھے وہاں اپنائیت وہ پیار ملتا جس کی تشنگی مجھے برسوں سے تھی۔ لائبہ کے گھر آ کر مجھے یوں لگتا جیسے کسی قفس سے وقتی طور پر ہی سہی آزادی مل گئی ہو، پر یہ آزادی میرے لیے اور پابندیاں لے آئی۔ میری فیملی کو میری کلاسز Bunk کرنے کا پتا چل گیا اور مجھے اور میری سوچ کو باغی قرار دیتے ہوئے باہر تو آنا جانا بند کروایا ہی پر کالج بھی چھڑوا دیا۔ اعلیٰ تعلیم، کچھ بننے کا اپنی ذہانت کو ثابت کرنے کا ہر خواب ختم ہو گیا۔ ابو نے مجھ سے بات کرنا بند کر دی، میری شان میں وہ القابات دیئے گئے کہ میں اپنی غلطی ہی ڈھونڈتی رہ گئی۔ اتنا بڑا گناہ نہ تھا جس کی سزا دی گئی۔ امی تو ویسے ہی ہم سے لاتعلق سی تھیں۔ والد نے بھی منہ پھیر لیا۔ ساری پابندیاں مجھ پر لگاتے ہوئے بیٹوں کو یکسر بھولتے گئے جس کے نتیجے میں وہ خودسر آوارہ اور بدتمیز بنتے چلے گئے۔ حذیفہ نے چھوٹی موٹی چیزیں چوری کرنا بھی شروع کر دیں۔ دن بہ دن وہ بگڑتے چلے گئے۔ ہوش آیا تب جب پانی سر پر سے گزر چکا تھا۔ ہاتھوں میں سگریٹ انداز میں ہٹ دھرمی اور ہونٹوں پر گالیاں تھیں۔ ہم بہنوں سے بھی ان کا رویہ ہتک آمیز ہوتا میں جو سب سے بڑی تھی تمیز سے بات کرنا تو دور الٹا میری چوکیداری کی جانے لگی۔ کہیں موبائل فون کے پاس کھڑی کسی عاشق کو تو فون کرنے کے چکر میں نہیں، آج کاجل لگایا ہے تو کسی عاشق کو دیدار تو نہیں کروانا، ناخن بڑھائے ہیں یعنی فیشن کرنے کا شوق چڑھا ہے۔ المختصر اپنے ہی گھر میں اپنے ہی ہاتھوں میں پتھر لیے نظر آتے۔ انہی دنوں میں آپ کا رشتہ آ جانا، ایک غنیمت سا لگا۔ جب انسان طویل عرصے تک اندھیرے میں رہ کر یکایک تیز روشنی میں آئے تو اس کی آنکھیں جو اندھیرے کی عادی تھیں وہ روشنی سے مانوس نہیں ہو پاتیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ روشنی ایک حقیقت ہے یا وہم؟ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہوا۔ علوی فیملی کا حصہ بن کر بھی ان روشنیوں سے مانوس نہ ہو پائی جنہوں نے چمکتے جگنو اور ٹمٹماتے تاروں کی طرح میرے آس پاس اجالا بکھیر دیا۔ میرے اندر موجود اندھیرا، میری باہر کی دنیا پر بھی اکثر حاوی ہونے لگا۔ بارہا آپ نے، ممی نے مجھ سے پوچھنا چاہا، مجھے اندھیروں سے نکالنا چاہا پر میں تنہا ہی بھٹکتی رہی، پر اب تھک گئی ہوں میں ضحاک میرا وجود چھلنی ہے، میرے پاؤں آبلہ پائی سے زخمی ہیں۔ مجھے اب سکون چاہیے۔"

وہ بول بول کر جیسے نڈھال ہو چکی تھی یا شاید ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر تھک گئی تھی۔ اس نے ضحاک کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھیں میچ کر اپنے لب بھینچ کر وہ ضبط کی انتہا پر تھی پر ناکام ہو گئی۔ آنسو ہر بند توڑ بیٹھے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ساکن بیٹھے ضحاک نے اسے چپ کروانے کے بجائے کھل کر رونے دیا۔ وہ چاہتا تھا اسے اپنے ماضی پر جتنے آنسو بہانے ہیں سب آج ہی بہا ڈالے اور پھر آنسو کبھی اس لڑکی کا مقدر نہ بنیں۔ کیونکہ آنسوؤں کا پانی اگر بہہ جائے تو اچھا ہے ورنہ یہ من کے اندر اکٹھا ہو کر ایسی آگ لگاتا ہے کہ انسان کی روح تک جھلس کر رہ جاتی ہے۔ غبار چھٹا تو اب وہ قدرے بہتر حالت میں تھی۔ ضحاک نے پانی کا گلاس اسے تھمایا تو گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے ضحاک کی سمت دیکھا۔

"بیتا ہوا کل، بیتا ہوا لمحہ، بلکہ کوئی بھی پل واپس نہیں آتا جو بیت گیا سو بیت چلا اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ پر جو بیت رہا ہے اسے تو بہتر بنایا جا سکتا ہے نا؟" ضحاک کی بات پر اس نے بھیگی پلکوں سے سوالیہ نظریں ضحاک پر ڈالیں۔

"یوں حیران ہونا تمہارا جائز ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری باتیں سن کر میں بھی دم بخود سا رہ گیا۔ میں مانتا

ہوں جو ہوا بہت غلط ہوا۔ تمہارے ساتھ، تمہاری خواہشوں کے ساتھ زیادتی کر کے تمہارا معصوم بچپن چھن گیا۔ انہوں نے جو غلط کیا اس بات کا انہیں احساس نہیں تو تم احساس جگاؤ۔ وہ ماں باپ کا فرض اگر نہیں نبھا سکے تو تم بیٹی کا فرض نبھاؤ کیونکہ تم ان کی طرح نہیں سوچتیں یہ ثابت کر کے دکھلاؤ انہیں۔" ضحاک دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ جو بھیگی پلکوں کو اٹھائے یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں غلط ہوں اور میں ان کے پاس جاؤں سب کچھ بھلا کر ہر زیادتی کو بھول کر۔" درنجف کا لہجہ کرچی کرچی ہو چکا تھا اور اب تک وہ ان کرچیوں کو سمیٹتے جیتی آئی تھی۔ پر آج صبر کا جام چھلکا تو کرچیاں بھی بکھر چلیں۔

"نہیں میری جان! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم غلط ہو۔ غلط ان کا رویہ رہا ہے پر غلط کو غلط کہتے رہنے کے بجائے اسے صحیح کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے نا......" ضحاک نے اس سے تائید چاہی وہ خاموش نظروں سے زمین پر نہ جانے کیا تلاش کرتی رہی۔ تبھی ضرغام کے رونے کی آواز سنائی دی۔

"اچھا چلو فی الحال یہ سب فکریں، یادیں اور ساری باتیں چھوڑ دو، وقتی طور پر ان سب کو بھول جاؤ کیونکہ اس وقت تمہارا یہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔" ضحاک نے اس کے چہرے کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تو وہ مدھم سی مسکراہٹ لیے کھڑی ہو گئی کیونکہ اب ضرغام باقاعدہ گلا پھاڑ کر رونے کا شغل کر رہا تھا۔ جب کہ پیچھے موجود ضحاک اس اداس جاتی ہوئی لڑکی کو دیکھتا سوچوں کے دریا میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔

☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آواز سن کر بغل میں سویا ضحاک بھی جاگ اٹھا اور چونک کر درنجف کی جانب دیکھا جس کا وجود پسینہ پسینہ تھا اور ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"درنجف...... جان...... کیا ہوا......؟" اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا۔

"وہ...... وہ...... وہ میں اکیلی......" اس کے لہجے میں انجانا سا ڈر خوف تھا۔ تنہائی کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔ ضحاک نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گئی۔

"بری چیزیں، تلخ یادیں بھول جانے کے لیے ہوتی ہیں اور اچھے پل ہمیشہ یاد رکھنے کے لیے۔ تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں تمہارے ساتھ، ہمارے بچے اور پھر ممی پاپا بھی تو ہیں تم اکیلی نہیں ہو بس یہ یاد رکھو۔" وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنے لگا۔ درنجف نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں نیند ٹوٹنے کے سبب بوجھل تھیں۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"میری وجہ سے آپ پریشان ہوتے ہیں نا؟" درنجف یونہی لیٹے لیٹے بولی۔

"یہ تو سچ کہا۔" اس کی آواز میں شرارت نمایاں تھی۔ درنجف نے چہرہ اٹھا کر ضحاک کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر ہلکے سے مسکرا دی تو ضحاک نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر اسے میں قید کر لیا۔ درنجف نے بھی آنکھیں موند لیں۔

☆......☆

یاسیت بھری راتیں اور مصروفیت بھرے دن گزر رہے تھے۔ درنجف حال میں جیتے ہوئے بھی ماضی میں سانس لیتی تھی۔ ضحاک نے اپنی ممی کو بھی سب حقیقت بتا دی تھی۔ وہ اب پہلے سے بڑھ کر درنجف کا خیال رکھتیں۔ وہ ماضی کا ازالہ تو نہ کر سکتیں تھیں پر وہ اس کے حال میں کوئی کمی رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹے

سمیت معیث علوی بھی ہمہ وقت اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ کبھی کبھار اسے لگتا کہ اس کی ماں شاید سوتیلی ہیں۔ تبھی تو وہ اور ماؤں کی طرح اپنی بیٹی کی پسند ناپسند اس کی خواہش اس کے خواب کچھ بھی نہ سمجھتی ہیں نہ جانتی ہیں اور نہ ہی اہمیت دیتی ہیں۔ کبھی کبھار اس کا دل چاہتا وہ دنیا کو ہی آگ لگا دے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ نہ بولنا تھا۔ پر جب وہ بولتی اپنی صفائی میں تو اسے منہ پھٹ اور بدزبان کہہ دیا جاتا، ایسے میں اس کے گلے سے آواز نکلنا بند اور آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو جاتے۔ ایک چیز اس کے اندر گھر کر چکی تھی کہ اس گھر اور یہاں کے لوگوں کے لیے وہ ایک خالی بوجھ اور بے جان سی چیز ہے، جس کی نہ کوئی اہمیت ہے، نہ کوئی اوقات اور نہ ہی اس کا اعتبار۔ اس کے دل میں پھوٹتا لاوا۔ آتش فشاں بن چکا تھا۔ بغاوت کا ننھا سا پودا تناور درخت بنتا چلا گیا۔ سارے خواب پورے ہونے کے لیے نہیں ہوتے پر ساری خواہشات بھی ادھوری رہنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ اس نے جلنا کڑھنا چھوڑ کر بس آنسو بہانا شروع کر دیا تھا اور انہی آنسوؤں سے اپنے دل میں لگے بغاوت، نفرت، بے اعتباری، احساس کمتری کے پودوں کی آبیاری کرتی رہتی۔ وہ ہمہ وقت ایک خول میں قید رہنے لگی تھی۔ بے اعتباری، بے سکونی، بدگمانی اور احساس کمتری کے خول میں خاموش، تنہائی، اداسی، بے اعتباری سبھی مل کر بے تحاشا تھکن، دکھ اور یاس سے دل کو رنجور کر رکھ دیتی۔

☆......☆

حذیفہ جیل سے فرار ہو گیا تھا اور اب پولیس اسے جگہ جگہ تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے گھر کے حالات کیسے تھے۔ وہ وہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی بہ خوبی جانتی تھی۔ ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ عجیب سی بے بسی و اداسی کا شکار تھی۔ بات بہ بات چڑچڑا پن عود آتا۔ آج کل تو وہ بچوں پر بھی ٹھیک سے توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ الغرض وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی۔ یہاں تک کہ راتوں کی نیند بھی اس سے منہ موڑ چکی تھی۔

”تمہیں آرام کی نہیں، بلکہ منہ کھولنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی ضرورت ہے کیونکہ سب کچھ اتنی جلدی و آسانی سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“ ضحاک کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ درنجف جو آنکھوں پر بازو رکھے سونے کی کوشش کر رہی تھی بغیر کچھ کہے یونہی لیٹی رہی۔

”زخم دل پر لگے ہوں یا جسم و روح پر، اسے بھرنے میں ٹائم لگتا ہے۔ پر ان کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو زخم بھرتے نہیں۔ بلکہ بگڑ جاتے ہیں۔“ وہ نیم دراز بیٹھا اس پر نظریں جمائے دھیما دھیما بول رہا تھا۔

”ذرا خود پر غور کرو۔ آج کل تم خود بھی اس راستے پر گامزن ہو گئی ہو جس پر تمہاری امی چلی تھیں۔ انہوں نے قسمت کے لکھے کو قبول نہ کیا اور ہمیشہ اپنے درد کا بدلہ تم لوگوں سے لیا۔ اگر اس وقت وہ بجائے خاموش رہنے کے اپنے دل کی بھڑاس نکال دیتیں تو نفرت کی آگ اتنا نہ بھڑکتی اور اب تم بھی خاموش رہ کر وہی سب کچھ دہرا رہی ہو۔ کیا تمہیں بھی مجھ سے میری فیملی سے ہماری شادی اور اب بچوں سے شکایت ہے۔“ ضحاک کی بات پر وہ سوتے سے اٹھ بیٹھی۔

”آپ ایسا...... میرا مطلب ہے آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا؟“ اس کے اندر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی وہ تو ضحاک کے منہ سے ایسی بات سن کر چونک ہی پڑی تھی۔

”میں اب تک اپنے وجود سے نفرت کرتی آئی تھی لیکن آپ کے آنے سے ہی تو مجھے جینے کے لیے آکسیجن ملی۔ تاریکی سے دور بھاگنے کے لیے محبت کے جگنو ملے۔ ابھی تو میں نیند سے جاگی ہوں ابھی تو آپ کے ساتھ نے مجھے دنیا کی رنگینیاں دکھلائی ہیں۔ میں بیتے وقت کو بری یادوں کو تلخ باتوں کو بھول جانا چاہتی ہوں مگر ناکام ہو

جاتی ہوں۔

درنجف نے درد سے پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میری جان!“ ضحاک نے درنجف کو بانہوں میں جکڑ لیا۔

”میری ایک بات مانو گی؟“ ضحاک کے سوالیہ انداز پر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔

”میں تمہیں یوں روتے تڑپتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ماضی کا تمہارے حال کے رونے کا اثر ہمارے کل پر پڑے۔ اس لیے اپنی انا، اپنی خودداری سب بھول بھال کر تم لب کھول ہی لو۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ انتہائی نرم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں۔

”کس کے سامنے؟“ درنجف نے استفسار کیا۔

”اپنی فیملی کے سامنے، ہاں درنجف نفرت کی آگ کو بجھانے کے لیے محبت کا نہ سہی احساس کا پانی ہی کافی ہوتا ہے پھر تمہارے ساتھ، تمہارے ہمقدم، تمہاری راہ میں، میں ہوں نا سو پلیز اب ہمت دکھلا دو اور اس لڑائی کو ختم کرنے کی پہلی کوشش تو کر کے دیکھ لو۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں امی ابو کے سامنے ہر بات ہر تلافی پر سوال رکھ دوں؟“ ضحاک کی بات پر درنجف نے پوچھا۔

”ہاں بالکل اور تمہارے ساتھ تمہارے پاس میں بھی ہوں گا تم نہ اکیلی ہو نہ تنہا۔“ اس نے اس کی پیشانی پر لب رکھ دیے تو وہ اندر تک سیراب ہو گئی۔

”اپنے لیے نہیں تو ہمارے لیے ہی سہی ایک کوشش۔“ ضحاک کی بات پر اس نے آنکھیں موندتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”میری جان!“ ضحاک نے فرطِ محبت سے اسے اپنے گلے سے لگا لیا جو
اندر سے سراپا آگ تھی
اور باہر سے جمی ہوئی برف

”وہی بیٹی اپنے سسرال میں خوش و سر اٹھا کر جیتی ہے جسے اپنے پیچھے میکے کا مضبوط سہارا حاصل ہو۔“ ضحاک کے ذہن میں مسز عقیدت کی بات گونجی مسز نزہت نے بھی اپنے سسرال میں آدھی ادھوری سی زندگی جی اور اب ان کی بیٹی بھی اپنے سسرال میں خوش ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ پا رہی تھی۔

☆......☆

موسم سرما کی بارشوں کا موسم تھا۔ صبح سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سردی کی شدت میں یکدم ہی اضافہ ہو چلا تھا۔ جنوری کا اختتام اور فروری کی شروعات تھیں۔ اس یخ بستہ شام میں درنجف کی اداسی عروج پر تھی۔ عجیب سی بے چینی و وحشت سی ہونے لگی اور دل کی ویرانیاں حد سے بڑھنے لگیں تو وہ بچوں کو مسز عقیدت کے حوالے کر کے خود باہر چلی آئی۔ باہر آنے سے پہلے تک اسے خبر نہ تھی کہ اسے کہاں جانا ہے پر اب اس کے قدم اس منزل کی طرف رواں دواں تھے جہاں سے اس کی شروعات ہوئی تھیں۔ گھر کی فضا میں ایک عجیب بوجھل پن کا احساس در آیا تھا۔ اداسی اور ویرانی در و دیوار سے لپٹتی بین کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ وہی صحن تھا جہاں اس کا بچپن بیتا تھا۔ یہ وہی گھر تھا جس کے در و دیوار جوانی میں قید گاہ لگتے۔ وہ خاموشی سے ہر چیز کو تک

رہی تھی تبھی اسے کچھ جلنے کی بو آئی اس کے قدم کچن کی سمت بڑھے جہاں کھانا بناتے کتنی بار کبھی ہاتھ جلا تھا۔ تو کبھی گرم تیل کے چھینٹے اسے درد دے گئے تھے اور کتنی بار اس نے اپنے آنسو یہیں بہائے تھے۔ چولہے پر رکھی چائے کی کیتلی کا پانی جوش پر جوش کھا کر ابل ابل کر نیچے بہہ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا تبھی اس کی بہن درشہوار چلی آئی۔

''ارے آپی! آپ اور یہاں...... آپ کب آئیں؟'' وہ اس کے گلے لگتی خوشی سے بولی۔

''چلیے اندر چلیے۔'' وہ اپنی آپی کا جواب سنے بغیر اس کا ہاتھ پکڑے اسے روم میں لے آئی۔ وہی مشترکہ روم جہاں سب بیٹھ کر کھانا بھی کھاتے اور تبصرے بھی کرتے، جہاں فیصلے بھی کیے جاتے اور وہیں سزائیں بھی نامزد کی جاتیں۔ آج بھی سبھی موجود تھے۔ وہ حیران ہوتے ہوئے سب کو دیکھے گئی۔ اس کے ساتھ کھڑی درشہوار۔ کارپیٹ پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھا ہریرہ۔

بیڈ پر بیٹھے اس کے ابو شاہنواز لغاری اور الماری کھولے اپنے اردگرد کپڑوں کا ڈھیر پھیلائے انہیں تہہ کرتیں اس کی امی یعنی نزہت بیگم۔ سب کچھ ویسا ہی تھا پر پھر بھی نہ جانے کیوں درنجف کو کچھ انوکھا، کچھ نیا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اندر کا موسم باہر کے مناظر پر حاوی تھا اس لیے یا پھر واقعی کچھ الگ تھا۔

''آؤ...... آؤ بیٹا۔''

اس کے ابو نے اسے پکارا تھا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پاس رکھے صوفے پر ٹک سی گئی۔ ایک پل کو تو وہ بھول ہی گئی وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ اسے کیا کہنا تھا؟ تبھی اس کے ذہن میں ضحاک کی باتیں ابھریں تب اس کا ذہن ان لفظوں کو ترتیب دینے لگا جو اس کے لبوں سے ادا ہونے تھے۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' شاہنواز لغاری نے خاموش بیٹھی درنجف سے پوچھا۔

''آپی؟'' تبھی درشہوار نے اسے جھنجھوڑا۔

''آپی! کوئی بات کہنی تھی؟'' درشہوار کے سوال پر اس نے باری باری سب کی جانب دیکھا۔

''ہاں مجھے کچھ کہنا تھا۔ کچھ بہت ضروری اتنا ضروری جو بہت پہلے کہہ دینا چاہیے تھا پر میں خاموش رہی اور خاموشی لے ڈوبی۔'' درنجف کے لب ہلے تھے اور سب ساکن ہو چلے تھے۔

''کہتے ہیں کہ عورت اور مرد ازدواجی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم اور برابر۔ ازدواجی زندگی کی گاڑی خوشی خوشی چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہو، تبھی تو وہ اپنی زندگی اور آس پاس کے ماحول کو پرسکون و خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ شادی کسی جنگ کا نہیں بلکہ ایک خوشگوار تعلق کا نام ہے پر آپ لوگوں نے اسے جنگ بنا دیا۔ قسمت نے آپ دونوں کا ملن ایسے ہی لکھا تھا۔ پر آپ لوگوں نے اس لکھے کو کبھی قبول نہ کیا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کو زیر کرنے میں ہماری تربیت کو ڈھیر کر دیا۔ ہماری شخصیت کے میناروں کو گرا کر اس پر اپنی قسمتوں کا ماتم کرتے رہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا مثالی گھر موجود نہیں جس میں کوئی اونچ نیچ اور تو تکار نہ ہوتی ہو پر وہاں ایک سکون، ایک اپنا پن ایک بھروسا ہوتا ہے۔ جو ہمارے گھر میں کبھی نہ رہا اور رہتا بھی کیسے؟ آپ لوگوں نے تو کبھی گھر کو گھر جیسا بنایا ہی نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو اٹڈ رہے تھے۔ اس نے ان آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ان سب پر نظر دوڑائی جو کسی صدمے کے زیر اثر تھے اور خاموشی طاری کیے اسے دیکھ رہے تھے جو کہنے کو ان کی بیٹی تھی پر آج اس بیٹی کے روپ میں ان کے سامنے آئینہ روبرو تھا۔ جو انہیں ان کا اصل روپ دکھا رہی تھی۔

''اولاد...... ماں باپ کی پرچھائی ہوتی ہے، ان کا عکس۔ وہ جو بھی سیکھتے ہیں اپنے ماں باپ سے ہی سیکھتے ہیں پر ماں باپ ہی اگر ان پر بھروسہ نہ کریں ان پر یقین نہ کریں انہیں اعتبار نہ دیں تو پھر وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر غیروں میں سہارا اور گھر سے باہر راہ فرار ڈھونڈتے ہیں ایسے میں غلط کون وہ بچے جنہوں نے خود اعتمادی کھو کر احساس کمتری کا شکار ہو کر باہر کی راہ لی یا پھر وہ والدین جنہوں نے اپنی آپس کی لڑائی میں اپنے بچوں پر سے توجہ ہٹا دی۔ آپ دونوں نے اپنے نصیب کی غلطی کی سزا ہمیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گھر کی بے جا قید سے تنگ آ کر باہر کی دنیا میں جینا چاہا تو آپ کو گوارہ نہ ہوا۔ پھر حذیفہ نے بھی اپنے لیے دوسری راہ چن لی جس کا انجام اب سامنے ہے۔ جب ماں باپ اپنے بچوں پر اعتبار نہیں کرتے ان کی شخصیت کو سنوارنے کے بجائے بے جا تنقید بے جا پابندیاں عائد کر کے ان کی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں تو بچے بھی راہ سے بھٹک ہی جاتے ہیں۔ ہر کوئی درنجف نہیں ہوتی جو اس گھٹن میں رو دھو کر چپ ہو جائے۔ میں غلط نہیں تھی میرا اتنا بڑا قصور نہ تھا جتنی سزا دی۔ میں غلط نہیں۔'' اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی کیونکہ نمکین آنسوؤں کا گولہ اب کسی پھندے کی مانند اس کے گلے میں اٹکا تھا جب کہ آنسوؤں کی قطار در قطار لڑیاں دونوں آنکھوں سے بہہ رہی تھیں۔ تبھی اسے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا اس نے سر اٹھا کر بہتی آنکھوں سے دیکھا وہ کوئی اور نہیں اس کی اپنی ماں تھی۔

''معافی بہت ہی چھوٹا لفظ ہے۔ پر مجھے یہ لفظ کہنے میں دس بار بھی عار محسوس نہیں ہوگی، اس بیٹی کے سامنے جس کے جیتے جاگتے وجود سے ہمیشہ آنکھیں موندھے کھڑی رہی۔ حالانکہ یہ وہی وجود تھا جس نے مجھے بانجھ سے ماں کہلانے کا سکھ دیا۔ جس نے مجھے طعنہ زدہ زندگی سے تو نجات دلایا ہی پر میری گود کو بھی ہرا کر کے مجھ پر سوکن جیسا عذاب مسلط ہونے سے بچایا۔ میں ماں ہو کر بھی اپنی اولاد سے غافل رہی۔ انا کی جلتی آگ میں ہمارے بچے بھی جھلس گئے۔ مجھے معاف کر دے میری بچی۔ ہمارا گناہ معافی کے قابل نہیں پھر بھی معاف کر دے۔'' وہ اسے اپنے گلے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ہر آنکھ اشکبار ہو چلی تھی ماں بیٹی دونوں نے مل کر بے اعتباری کی آگ کو آنسوؤں کے بہتے دریا سے بجھانا شروع کر دیا۔

''ماں باپ، اولاد کو سکھاتے ہیں صحیح غلط کی تمیز بتلاتے ہیں پر ہم وہ نادان ماں باپ ہیں جنہوں نے اولاد جیسی نعمت تو پالی پر اس کی قدر نہ کر سکے۔ آج اولاد نے ماں باپ کو صحیح غلط سکھلا دیا۔'' خاموش بیٹھے شاہنواز لغاری بھی چل کر روتی ہوئی ان دونوں ماں بیٹی کے قریب آئے اور درنجف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہیں اس قدموں کے پاس بیٹھ چلے۔ 48 سالہ مرد بھی آج رو دیا۔ درنجف جھٹ سے صوفے سے اتر کر اپنے باپ کے گلے لگ گئی۔ ماضی کے اندھیرے چھٹنے لگے تھے۔ سالوں سے جمی بے اعتباری کی برف پگھلنے لگی تھی۔

''اگر دھند چھٹ گئی ہو تو ذرا ادھر بھی نظر گھما لیں۔ ہم بھی موجود ہیں۔'' درشہوار کی آواز پر ان تینوں نے روتی درشہوار اور ہریرہ کی جانب دیکھا جن کے چہروں پر بھی آنسو کے قطرے چمک رہے تھے۔ شاہنواز لغاری نے ہاتھ آگے بڑھا کر ان دونوں کو بھی اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں بھاگ کر باپ کی محبت اور ماں کی ممتا کے حلقے میں قید ہو گئے۔

''ارے واہ! یہاں تو پیار کی برسات ہو رہی ہے اگر اجازت ہو تو میں بھی چلا آؤں؟'' تبھی ضحاک کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سبھی نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ضحاک موجود تھا۔

''آؤ..... آؤ بیٹا! تم ادھر آؤ میرے گلے لگو۔'' شاہنواز لغاری نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگایا تھا جب کہ روتی ہوئی درنجف نے بھی اپنے آنسو پونچھ کر حیران حیران نظروں سے ضحاک کو دیکھا تھا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''ارے میری چندا! یہ بھی تو ہمارا بیٹا ہے ناں۔'' نزہت بیگم نے مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ وہ اب تک حیران تھی تبھی ضحاک ہی کو اپنی بیوی پر ترس آیا جس کی آنکھوں میں حیرانگی کی داستان رقم تھی۔

''ارے! کسی نے میری لاڈلی بیوی کو بتایا ہے کہ..... ضحاک نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ درنجف نے سب کی طرف گھوم کر دیکھا ہر چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی جب کہ امی کے چہرے پر خوشی۔

''کیا بات ہے کچھ بتانا تھا؟'' درنجف نے اس سے پوچھا۔

''پتا ہے آپی دولہا بھائی نے امی کو ایک گفٹ دیا ہے۔'' درشہوار نے خوشی سے ہنستے ہوئے بتایا۔

''گفٹ؟'' وہ الجھی الجھی نظروں سے ضحاک کی سمت دیکھے گئی۔

''ہاں گفٹ..... ! دولہا بھائی نے امی کو انڈیا کا ویزہ لگوا کر دیا ہے۔'' ہریرہ نے جھٹ سے اگلا۔

''کیا؟ سچ میں.....؟'' وہ حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت لیے کبھی ضحاک کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی اپنی ماں کے چہرے کی سمت جہاں خوشی پھوٹ رہی تھی اور مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

''ہاں بیٹا! سچ میں جو کام بہت پہلے مجھے کرنا چاہیے تھا وہ ضحاک نے کیا۔ میرے ذمے کا کام اس نے کر دکھایا۔ نہ صرف تمہاری ماں بلکہ ہم سب کے جانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔ یعنی ہم سب تمہارے ننھیال جا رہے ہیں اس مہینے کی 14 کو.....'' شاہنواز صاحب نے اصل حقیقت بتائی تو وہ خوشی کے مارے چیخ اٹھی اور جھٹ سے ماں کے گلے لگ گئی۔

''واؤ، امی! ہم سب انڈیا جا رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔ مسرت تھی۔ صرف اسی کے لہجے میں نہیں بلکہ وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر بھی۔ کیونکہ محبت کے دیئے کی روشن لو نے غلط فہمیوں و نفرتوں کے اندھیروں کو چاک کر دیا تھا اور یہ سب ضحاک علوی ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ درنجف کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ ضحاک کا شکریہ ادا کر سکے۔ پر آج ہی تو اس گھر میں خوشیاں لوٹی تھیں۔ اس لیے یہاں تو گویا جشن کا سماں تھا۔ حذیفہ کی کمی گو کہ سب کو محسوس ہوئی پر غلط صحبت کا انجام غلط ہی تو ہوتا ہے اسے اس کی غلطی کا احساس ہو جائے بس اس کے لیے یہ ہی دعا کی جا سکتی تھی۔ ایک خوشگوار یادگار سا دن گزار کر وہ ضحاک کے ہمراہ ہی رات کو لوٹی تھی۔ بچوں کی فکر کچھ اس لیے بھی نہ تھی کہ بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور دادو دادا سے مانوس ہو چکے تھے۔ وہ فیڈر بنا کر ان کی دادو مسز عقیدت کو دے کر آئی تھی اور ویسے بھی دونوں بچے سارا دن مگن رہتے، بس رات کو ہی اپنی ماں کے پاس آتے تھے۔ وہ جب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو مسز عقیدت کو دونوں بچوں کے ہمراہ لاؤنج میں ہی بیٹھے پایا۔

''سوری ممی! آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ بچوں نے تنگ تو نہیں کیا؟'' وہ ان کی جانب بڑھی۔

''ارے نہیں بیٹا! ماشاءاللہ میرے بچے بہت سمجھدار اور پیارے ہیں۔'' انہوں نے ممتا سے پر لہجے میں کہا۔

''ویسے تمہیں اتنی دیر لگ گی۔ سب خیریت تو تھی؟'' اس سوال پر درنجف نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے گال کو چوم لیا۔

''ارے واہ لگتا ہے میری بہو آج بہت خوش ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صرف آپ کی بہو نہیں۔ آج بیٹی بھی بہت خوش ہے۔ آج اسے وہ مل ہی گیا جس کی بچپن سے اسے طلب تھی۔ آج نہ صرف ماں واپس ملی۔ ان کی ممتا بلکہ ماں باپ دونوں کا اعتماد بھی۔'' درنجف کے لہجے سے چھلکتی خوشی اس کے خوش ہونے کا پتا دے رہی تھی۔

''ماشاءاللہ! میری دعا ہے میری بیٹی اور سب بچے یوں ہی خوش اور ہنستے مسکراتے رہیں۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''چلیے ممی! آپ جا کر آرام کیجیے آپ نے اور پاپا نے ڈنر تو کر لیا تھا نا؟''

درنجف نے ممی کی گود سے ضحی کو اٹھایا۔ جبکہ ضرغام پاس رکھے کاٹ میں لیٹا ہوا تھا۔

''ہاں بیٹا! ضحاک نے فون کر کے ہمیں بتا دیا تھا کہ تم لوگ ڈنر وہیں کرو گے اس لیے میں نے اور تمہارے پاپا نے ڈنر کر لیا۔ اب تم بچوں کو سلا دو یہ بھی نیند میں ہی ہیں۔'' وہ اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے بولیں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بچوں کو لیے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں ضحاک بیڈ پر لیٹا تھا۔ ایک ہاتھ آنکھوں کے اوپر رکھے شاید سونے لگا تھا یا سو چکا تھا۔ اس نے بچوں کو فیڈ کروا کر کاٹ میں سلایا اور خاموشی سے لائٹ آف کر کے ضحاک کے برابر میں آلیٹی۔

''یہ کتنے اچھے ہیں کتنے آرام سے انہوں نے مجھے میری سب سے بڑی خوشی دے دی اور امی کو ان کی ناممکن ہوتی خواہش اتنا کچھ ہمارے لیے کتنی آسانی سے ممکن بنا دیا۔ مجھے میرے میکہ مل گیا اور امی کو ان کے میکے جانے کا ٹکٹ۔'' درنجف نے سوچتے ہوئے ضحاک کی سمت دیکھا جو نا معلوم سو چکا تھا یا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

''ان کو Thanks کہنا تو بنتا ہی ہے۔ آخر اتنا سب انہوں نے میرے لیے ہی میری خوشی ہی کی خاطر تو کیا۔'' وہ سوچتے ہوئے ضحاک کے قریب کھسک آئی۔

''ضحاک سنیے۔'' اس نے اسے پکارا پر جواب ندارد۔

''کہیں سو تو نہیں گئے۔'' اپنے جواب کی تصدیق کے لیے وہ بیڈ پر سہارا لیے ذرا ترچھی ہو کر ضحاک کے چہرے کی جانب جھکی۔ مخصوص کلون کی خوشبو درنجف کو اپنی سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ضحاک۔'' اس نے پھر ہولے سے پکارا۔

''جی میری جان۔'' اس نے آنکھیں کھول کر اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

''آپ جاگے ہوئے تھے؟''

''ہاں! کسی کے منہ سے کچھ پیار بھری باتیں جو سننی تھیں۔'' ضحاک نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے یکدم شرمندگی نے آگھیرا۔ پورا دن بیت چلا تھا اور اس نے اب تک اس کا شکریہ ادا نہ کیا تھا جس کے سبب اس کی زندگی مکمل ہوئی تھی۔

''ضحاک! میں آپ کا شکریہ.....''

''ہش..... ش..... پلیز میری جان! اب تم شکریہ اور سوری جیسی فارمیلٹی میں تو نہ پڑو، تم سے شادی کی تمہیں اپنی شریک سفر بنایا تم میری نصف بہتر ہو پھر بھلا تمہاری خوشی اور دکھ کا خیال مجھے نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔

ویسے ایک بات بتاؤں۔'' ضحاک لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

''یہ سچ ہے کہ تمہاری ڈسٹربنس کا اثر پہلے گھر اور پھر بچوں پر پڑنا اسٹارٹ ہو چکا تھا اور جیسے ہی مجھے تمہاری ڈسٹربنس کی وجہ پتہ چلی اسی دن سے میں کوششوں میں لگ گیا کہ یا تو تمہارے ماضی کا وہ مفلوج حصہ الگ کردوں یا پھر اسے ٹھیک کردوں مگر سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو اور تمہاری زندگی میں خالی پن برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور پھر میں نے تمہیں مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی جس کا رزلٹ تمہاری اداس آنکھوں میں خوشیوں کا چمکنا ہے۔'' ضحاک نے اپنے پاس بیٹھی درنجف کا ہاتھ تھامتے ہوئے لبوں سے لگایا۔

''ضحاک! آپ بہت اچھے ہیں۔'' درنجف نے فرطِ جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔

تشکر آمیز دو ننھے ننھے آنسو اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر گال پر بہہ نکلے جسے ضحاک نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے سمیٹ لیا۔

''دھوپ کی ہوائیں ہو یا کانٹوں کی راہیں۔ پانی کی دیواریں ہوں یا نفرتوں کی فضائیں۔ تمہارے لیے میری محبت کی دنیا ساغر سے بھی گہری اور فلک سے بھی وسیع ہے۔'' محبت کی شدتوں سے چور لہجے میں کہتے ہوئے ضحاک نے اپنے دونوں بازو وا کردیئے تو درنجف نے خود کو ان مضبوط و محفوظ حصار میں سونپنے میں لحہ بھی نہ لگایا۔

''آئی رئیلی لو یو۔'' ضحاک نے اس کے بالوں پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس مدھری سرگوشی کی۔

''می ٹو۔'' درنجف نے جھکی نظروں سے آہستہ سے کہا۔

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں میرے دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں میری دھڑکنیں میری چاہتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں، میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی، میری سانسیں تیری امانتیں

ضحاک نے آہستہ سے اس کی گردن کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کردی۔

''آج کے بعد تم کبھی نہیں روؤ گی۔ نہ کبھی اداس ہوگی۔ مجھ سے وعدہ کرو آئندہ کوئی پریشانی ہو کوئی بھی مسئلہ ہو تم مجھ سے شیئر کرو گی۔'' ضحاک نے اپنی ہتھیلی پھیلائی جس پر درنجف نے اپنا نازک سا ہاتھ رکھ کر گویا حامی بھرلی ضحاک نے بے خودی سرشاری و محبت سے اس کے نازک ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط کردی۔ درنجف کے ہونٹوں پر شوخ مسکان حیا بن کر بکھر گئی۔ جسے ضحاک نے بے حد پیار سے دیکھا۔ باہر شاید موسم سرما کی بارش برس رہی تھی۔ پر اندر محبت و چاہت کی نرم گرم سی پھوار درنجف کے وجود کو بھگو رہی تھی۔

زندگی قسمت کا کھیل ہے اور قسمت صرف موقع ڈھونڈتی ہے اور وہ کب کیسے کس کی زندگی بدل دے کوئی نہیں جان سکتا۔ پر درنجف نے جان لیا تھا کیونکہ قسمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اور

محبت نے بہت پیار سے اسے اپنوں سے ملا کر خوش نصیب بنا دیا مہربان محبت نے اپنا فرض نبھایا تھا کیونکہ اب محبت مہربان ہو چلی تھی۔

......☆......

فاطمہ خان

ناولٹ

محبت جادو والی ہے

رات اپنی مخصوص مہک کے ساتھ اس پہاڑی علاقے پر قطرہ قطرہ اترتی جا رہی تھی۔ پہاڑوں کی خوشبوؤں کے ساتھ بندھی اس وادی کے مکینوں کی اکثریت اس وقت نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔



ایسے عالم میں وہ اکیلا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مخصوص پہاڑی راستوں سے گزر رہا تھا۔ ان چند ماہ میں یہ تمام راستے اسے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ اندھیرے میں بھی ان پر پیچ راستوں سے بغیر کسی دشواری کے گزر سکتا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی راتوں کا مزاج میدانی علاقوں سے بہت مختلف ہوتا ہے، یہاں کی گھور اندھیری راتوں میں چھپے اسرار سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جو ان پراسرار اندھیروں کے ساتھ کچھ وقت گزار چکے ہوں پھر یہاں کے لوگ بھی جلد سو جانے کے عادی ہوتے ہیں، اس لیے ویرانی اور تنہائی بھی یہاں ایک نئے انداز کے ساتھ اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے۔ اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ خاموشی کے اس عالم میں دریا کا وہ گیت اب اسے بہت واضح انداز میں سنائی دینے لگا تھا۔ دو دریاؤں کے خوب صورت ملاپ سے جو دلکش آواز ابھرتی تھی، وہ اسے کسی مغنیہ کے ایسے گیت کی طرح لگتی تھی جسے سن کر انسان کسی اور ہی جہان میں چلا جائے اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ جب وہ پہلی بار اس شہر میں آیا تھا۔ تب اسی آواز نے اس پر ایک سحر طاری کر دیا



تھا۔ اس کے پاؤں کئی ان دیکھی زنجیروں میں بندھ گئے تھے اور ان زنجیروں کو پہنے وہ خوشبوؤں کے ایسے جہان میں چلا گیا تھا۔ جہاں سے واپسی کا سفر اسے اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا مگر اب اس کے پاس واپسی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ رات کے خطرناک قسم کے جنگلی جانور بھی انسانوں کو لقمہ اجل بنانے کے لیے پہاڑوں سے نیچے اتر آتے تھے مگر وہ تو جیسے ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ بہت بے خوفی سے پہاڑوں سے نیچے اتر رہا تھا، ویسے بھی وہ تو ایک انسان کا ڈسا ہوا تھا اور انسان کے ڈسے کو تو خطرناک سے خطرناک جنگلی جانور بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے پورے وجود سے ایک عجیب قسم کی مایوسی چھلک رہی تھی۔ بالآخر اس کے قدموں کا سفر مکمل ہوا اور دریا کے سامنے آکر اس کے قدم خاموش ہو گئے۔ دریا کے پانی کے وہ رنگ جو اسے دھنک رنگ جیسے لگتے تھے، اس لمحے وہ تمام دھنک رنگ سیاہ رنگ میں تبدیل ہو چکے تھے، یہ شاید اس کے نصیب کی وہ سیاہی تھی جس نے دریا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ دریا کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی تمام محرومیاں اس کے سامنے کھڑی ہو کر زور زور سے اس کی بے بسی پر قہقہے لگانے لگیں۔ دریا کی وہ دلکش آواز اب ایک المیہ گیت میں ڈھل چکی تھی۔ اس نے سامنے نظر دوڑائی تو دور تک پھیلے بلند و بالا پہاڑ بھی اسے اپنے ساتھ روتے ہوئے نظر آئے۔ وہ پورا علاقہ ہی شاید اس کی ناکام محبت کا ماتم منا رہا تھا۔ ناکامی کا لفظ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ زندگی میں بہت دفعہ اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر ناکامی کے بعد اس کے اپنے اس کے اندر سے مایوسی کے سارے اجزاء نکال دیتے تھے اور وہ پھر سے ایک نئے راستے پر چل پڑتا تھا مگر اس بار کی چوٹ بہت گہری تھی۔ زخم دینے والے کوئی اور نہیں اس کے اپنے تھے۔ جذباتی تو وہ شروع سے ہی تھا اس لیے ہر بار کی طرح اس بار بھی بدگمانی کی عینک پہن کر ہی سب کو دیکھ رہا تھا۔ منفی سوچیں پوری طرح اس کے دل و دماغ میں پھیل چکی تھیں، وہ کچھ دیر آنسو بہاتا رہا اور پھر ایک بے خودی کے عالم میں اس نے اپنا آپ دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا، صبح سورج کی آمد کے ساتھ ہی اس شہر میں اس کی خبر پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اس کی لاش بھی جلد ہی مل گئی، اس کی موت پر سب سے زیادہ آنسو بھی اسی انسان نے بہائے تھے جس سے وہ سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا۔

وہ شہزادی پچھلے کئی ماہ سے ایک ظالم دیو کی قید میں تھی۔ اپنے شہزادے کا انتظار کرتے کرتے اسے بہت دن بیت چکے تھے۔ اس زندان میں اپنی خودداری اور عزت نفس کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اسے نہ جانے کتنا وقت ہو چکا تھا۔ اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ وہ شخص روزانہ ہی اس کی عزت نفس کو پامال کرتا اور زبردستی اس سے ایک ایسی بات منوانا چاہتا تھا جو اس کے بس میں نہیں تھی۔ اتنے دنوں میں اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شخص کون ہے اور اس کا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ شاید اسی رشتے کا پاس تھا جو ابھی تک اس کی عزت محفوظ تھی۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ ایک روز اسی زندان میں وہ اپنی زندگی کی بازی ہار جائے گی، اسے اب انسانوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اپنی ذہنی حالت بھی اسے اب ٹھیک نہیں لگتی تھی۔ ان تمام دنوں میں وہ بہت کمزور ہو چکی تھی ویسے بھی اسے کھانے پینے اور سونے جاگنے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، دیکھنے میں وہ ایک زندہ لاش ہی نظر آتی تھی۔ اپنے مسیحا کی آمد کا وہ روز انتظار کرتی تھی مگر وہ بھی لگتا تھا کسی پہاڑی راستے پر اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کہیں کھو گیا ہے۔

اپنے رب کے آگے اس نے کتنے ہی سجدے کر ڈالے تھے مگر رب کائنات کو بھی ابھی اس کا اور امتحان مقصود تھا۔ وہ اس شخص کی منتیں کرتی، اسے نہ جانے کون کون سے واسطے دیتی تھی مگر وہ شخص اس کی ہر ایک بات کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ وہ بہت تھک سی گئی تھی اور شاید وہ اس شخص کی بات مان کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیتی مگر کاتب تقدیر کو اس پر رحم آ ہی گیا اور ایک روز اس زندان کا دروازہ کھل گیا۔ شہزادی کے آنسوؤں کو سمیٹنے اس کا شہزادہ آن پہنچا تھا، اس کا مسیحا اسے لینے آ گیا تھا۔

☆......☆

بارش کو پیر چناسی کے ان پہاڑوں پر برسنا ہمیشہ سے بہت پسند تھا، یہی وجہ تھی کہ آئے روز بادلوں کے چند ننھے ننھے مسافر پانی سے بھرے ہوئے سامان کے ساتھ پہاڑوں کے پاس آکر کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر کبھی کم اور کبھی زیادہ پانی کی بوندوں سے اس پورے علاقے کو سیراب کر دیتے تھے، سورج وہاں اپنا رنگ کم ہی جماتا تھا اور سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی سے اکثر وہاں کے مکین محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ اس روز بھی بارش کی چند بوندوں نے ہلکی ہوا کے ساتھ مل کر موسم کو ایک حسین رنگ دے رکھا تھا۔ تمام سیاح بس سے اتر کر اب اپنے اپنے انداز میں اس جگہ کی خوب صورتی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ عمارہ اور حرا بھی ان دلکش نظاروں کو دیکھنے میں محو تھیں۔

''عمارہ! میری ایک تصویر تو بنا دو۔'' حرا نے وہاں موجود ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک اور پلیز......'' اب وہ ایک درخت کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عمارہ کچھ دیر تو حرا کے ساتھ تصویروں کا یہ کھیل کھیلتی رہی مگر چند تصویریں اتارنے کے بعد وہ حد درجہ بیزار دکھائی دینے لگی تھی۔

''حرا ڈیئر! کچھ دیر کے لیے یہ کیمرہ ایک طرف رکھ دو، وہ دیکھو سامنے پہاڑ یوں لگ رہا ہے جیسے دھنک کے سارے رنگ گرنے لگے ہوں۔ اس خوشبو کو محسوس کرو جو ہمارے دائیں، بائیں، اوپر، نیچے آگے پیچھے محو رقص ہے۔'' عمارہ ایک جذب کے عالم میں بول رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ یہ ساری خوشبو اپنے اندر اتار رہی ہو۔

''او کے یار! بس یہ لاسٹ پکچر بنا دو، پھر گوتم بدھ کی طرح کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر نروان حاصل کر لینا، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے حرا کے چہرے پر شرارت کے سات رنگ جمع ہو گئے تھے۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو عمارہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ حرا اب پہاڑ پر بنے ہوئے ایک مزار کے پاس کھڑی تھی اور عمارہ نے اسے نیچے کھڑے ہو کر فوکس کرنا تھا۔

''تھوڑا اور پیچھے جاؤ یار! یہ پیچھے والی پوری پہاڑی نظر آنی چاہیے۔''

حرا کی اس بات پر عمارہ تھوڑی اور پیچھے ہوئی، وہ تصویر اتارنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ بالکل کنارے پر کھڑی ہے اور نیچے بہت گہری کھائی ہے، وہ تصویر کا زاویہ درست کر رہی تھی کہ اچانک سے اس کا پاؤں پھسلا کیمرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ زندگی بھی اس کے ہاتھ سے پھسل جاتی اچانک سے دو بھاری مضبوط ہاتھوں نے اسے اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ کچھ دیر کے لیے عمارہ کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ جب حواسوں کی دنیا میں واپس آئی تو دیکھا کہ تمام لوگ اوپر کھڑے اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور حرا کی تو رو رو کر آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں مگر اب وہ سب کے درمیان تھی اور خوش تھی کہ

زندگی اسے دوبارہ مل گئی ہے۔ وہ کئی بار شکر گزار نظروں سے اپنے اس محسن کو دیکھ چکی تھی جس کی جرأت اور ہمت کی بدولت وہ سب کے درمیان تھی، ورنہ تو وہ شاید کب کی ان پہاڑوں کے درمیان فنا ہو چکی ہوتی مگر معجزہ رونما ہو چکا تھا اور اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس کے محسن کا نام کیپٹن ریان تھا جو اپنی فیملی کے ساتھ وہاں گھومنے کے لیے آیا تھا۔ اس بھوری آنکھوں والے فوجی نے عمارہ کو پہلی ہی نظر میں بہت متاثر کیا تھا اور آنے والے دنوں میں اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا دل ریان کے آگے ہار چکی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسی جگہ پر وہ کسی اور کی نظروں کے حصار میں آ چکی ہے اور ان نظروں نے ہمیشہ کے لیے اسے اپنانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔

☆......☆

کرنل خاور کے گلشن کے دو ہی پھول تھے جو ان کی کل کائنات تھے، ان کی پھیکی اور بے رنگ زندگی میں بہار ان کے دونوں بیٹوں ایان اور ریان کے دم سے ہی تھی۔ ان کے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے تھے کہ ایک روز ایک کار حادثے کے نتیجے میں ان کی بیگم انہیں ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اس خوفناک حادثے نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی بیگم اگر ان کی صرف شریک حیات ہوتیں تو وہ اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھ کر کچھ عرصے کے بعد دوبارہ سے اپنی زندگی میں مگن ہو جاتے مگر وہ تو ان کی محبت تھیں اور اپنی محبت کو منوں مٹی تلے دفنانا کوئی آسان کام تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ کوئی عام آدمی ہوتے تو اپنی محبت کے زیر اثر شاید اپنے بچوں پر توجہ نہ دے پاتے یا پھر کسی وقتی سہارے کو تلاش کرتے مگر وہ تو ایک فوجی تھے اور فوجی تو بڑے سے بڑے امتحان سے بھی ہنس کر گزر جاتا ہے۔ سو انہوں نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ بیک وقت اپنے بچوں کے باپ بھی تھے اور ماں بھی اور یہ دونوں کردار وہ بخوبی نبھا رہے تھے۔ ریان ان کا جڑا بیٹا تھا اور اپنی ماں کی طرح سمجھدار اور انتہائی ذمہ دارانہ شخصیت کا مالک تھا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ایان انتہائی لاپرواہ اور شرارتی ذہن کا مالک تھا۔ ریان کا تعلیمی ریکارڈ انتہائی شاندار تھا۔ اس کی طرف سے انہیں کبھی کوئی شکایت نہیں ملی تھی بلکہ اس کے اسکول اور پھر کالج میں انہیں ہمیشہ ایک خاص اہمیت ملتی تھی۔ اپنے بیٹے کی تعریفیں سن کر ان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا مگر انہی اداروں میں اساتذہ کی زبانی جب وہ ایان کی شکایات سنتے تھے تو انہیں شدید قسم کی شرمندگی محسوس ہوتی تھی اگر وہ شکایات صرف ہوتیں پڑھائی کے حوالے سے ہوتیں تو انہیں اتنی شرمندگی نہ ہوتی مگر اکثر شکایات اس کے کردار اور بدتمیزیوں کے حوالے سے ہوتی تھیں جن کا نشانہ اس کے ساتھی طلباء اور اساتذہ بنتے رہتے تھے۔ کرنل خاور اب اس پر بہت سختی کرنے لگے تھے مگر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ ریان ایسے موقعوں پر اکثر اپنے بھائی کی ڈھال بن جایا کرتا تھا۔ ایان کی بدتمیزیاں صرف اس کے تعلیمی اداروں تک محدود نہیں تھیں۔ بلکہ وہ ریان کے ساتھ بھی بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتا تھا۔ ان دونوں کی عمروں میں دو ہی سال کا فرق تھا اور ایان کی نظر میں یہ فرق کوئی فرق نہیں تھا۔ ریان اپنے بھائی کی ہر بدتمیزی کو ہنس کر سہہ جاتا تھا اور کرنل خاور کو بھی صبر کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ایان کا رویہ خود ہی بہتر ہو جائے گا مگر افسوس ایسا نہیں ہو سکا، وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا اور کرنل خاور کے گلشن کے یہ دونوں پھول اسکول کی دنیا سے نکل کر اب کالج کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے لگے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے ان ہی کی طرح فوج میں شامل ہوں۔ ریان نے اپنی

گریجویشن مکمل کرنے کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کر لیا تھا اور اب وہ ایک کمیشنڈ آفیسر تھا، جب کہ ایان فوج میں بھرتی کے لیے ابتدائی ٹیسٹ ہی پاس نہیں کر سکا تھا۔ اس نے دو سے تین بار کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ پے در پے ناکامیوں نے اس کے مزاج پر بہت برا اثر ڈالا تھا، وہ اپنی ہر ناکامی کا ذمہ دار اپنے بھائی کو سمجھتا تھا۔ بھائی سے نفرت کا معمولی بیج اب ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ کرنل خاور نے اس کا داخلہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں کروا دیا تھا مگر اب اسے پڑھائی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ ریان جو اب کشمیر میں پوسٹڈ تھا۔ اس نے کچھ عرصے کے لیے ایان کو اپنے پاس بلا لیا تا کہ اس کے مزاج کی تلخی کچھ کم ہو سکے وہ تو اپنے والد کو بھی اپنے پاس بلانا چاہتا تھا مگر وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا آبائی شہر چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ ویسے بھی انہوں نے اپنے آبائی شہر کوہاٹ میں ایک اسکول کھولا تھا اور وہ تمام تر توجہ اب اپنے اسکول کو دینا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اب ریان کے سر پر سہرا سجا دیکھیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے دوست کی بیٹی کو پسند کر چکے تھے۔ بس انہیں ریان کی رضامندی کا انتظار تھا انہیں امید تھی کہ ان کا فرمانبردار بیٹا اس معاملے میں بھی ان کی پسند پر اپنا سر جھکا دے گا۔ مظفر آباد آ کر ایان کے مزاج پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ اسی لیے ریان اسے اپنے ساتھ لے کر پیر چناسی کے پہاڑوں پر چلا گیا تھا، جہاں پر ایک حادثے کے نتیجے میں عمارہ ان کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور عمارہ کے آنے کے بعد ان سب کی زندگی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

☆......☆

عمارہ کو پہاڑوں سے عشق تھا۔ اسی لیے وہ سال میں دو مرتبہ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر پہاڑوں سے ملنے ضرور آتی تھی۔ ان پہاڑوں سے اس کی دوستی بہت پرانی تھی۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کے بابا اسے اور اس کی ممی کو لے کر پہاڑوں پر کچھ وقت گزارنے آئے تھے تب پہلی بار اس نے پہاڑوں کی سرگوشیوں کو محسوس کیا تھا۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کو بہت قریب سے سنا تھا۔ بارش کے قطروں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر پہاڑوں سے باتیں کی تھیں، پہاڑوں کے ساتھ ہنستے مسکراتے اس نے اپنا ہاتھ دوستی کے لیے پہاڑوں کی طرف بڑھا دیا تھا اور اسے یوں لگا کہ پہاڑوں نے بھی مسکرا کر اس کی دوستی کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔ اپنے شہر واپس آ کر وہ کتنے ہی دن اپنے بابا سے ان بلندیوں پر دوبارہ جانے کی ضد کرتی رہی تھی اور ان دنوں تو اس نے ان کوہساروں کے قریب ہی ایک خوب صورت سا گھر بنانے کی اپنے بابا سے فرمائش بھی کر دی تھی۔ اس کے بابا اسے ہر سال کوہساروں کے پاس لے تو جاتے تھے مگر اس کی گھر والی خواہش کو انہوں نے کبھی پورا نہیں کیا۔ اس کے بابا ڈاکٹر شہر کے ایک معروف ڈاکٹر تھے۔ جب کہ اس کی والدہ ڈاکٹر حلیمہ کا شمار بھی انتہائی قابل ڈاکٹرز میں کیا جاتا تھا۔ اپنے والدین کی ہی خواہش پر اس نے میڈیکل پروفیشن کا انتخاب کیا تھا، اب وہ میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی، میڈیکل کی سخت پڑھائی نے بھی اس کے سیر و سیاحت کے شوق کو کم نہیں کیا تھا، اس لیے وہ اکثر چھٹیوں میں اپنی کسی نہ کسی دوست کو لے کر پہاڑوں سے ملنے پہنچ جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ اپنی ایک دوست کو لے کر کشمیر کے خوب صورت پہاڑی مقام پیر چناسی کو دیکھنے پہنچ گئی تھی۔ یہاں وہ پہلے بھی آ چکی تھی مگر ہر بار یہ پہاڑی راستے اسے نئے نئے سے لگتے تھے۔ اس کے ساتھ پہلے کبھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا مگر ان پہاڑوں پر نہ جانے کیسے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ کیپٹن ریان کی بروقت مدد سے اس کی زندگی اسے واپس مل گئی تھی۔

اس حادثے سے وہ کچھ خوفزدہ تو ضرور ہوئی تھی مگر کسی کی جرأت و ہمت نے اسے بہت متاثر بھی کیا تھا۔
کچھ دن بعد وہ اور حرا واپس جا رہی تھیں مگر اس بار واپسی کا سفر بہت خوب صورت تھا۔ تمام رستے ایک خوب صورت انسان کا خیال اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور ان پہاڑوں کو الوداع کہتے ہوئے اس نے ہنستے مسکراتے محبت کی حسین وادی میں قدم رکھ دیا۔

☆......☆

اپنے خوابوں کو کبھی کہہ نہ سکا تھا تم سے
ان کو چپ چاپ نگاہوں میں چھپا لیتا تھا
عمر بھر جو کبھی آباد بھی نہ ہو شاید
اب وہ لڑکا تو تمہیں یاد بھی نہ ہو شاید

ایان نے غزل مکمل کر کے اپنی ڈائری بند کر کے رکھ دی اور گلاس ونڈو سے باہر ہونے والی بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اب اسے اس من موہنی صورت والی اپسرا کا سراغ لگانا تھا جس نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔
ڈاکٹر یوسف کا شمار شہر کے انتہائی قابل ماہر امراض دل میں ہوتا تھا۔ وہ روزانہ کتنے ہی آپریشنز کرتے تھے۔ ان کی اپنی صحت قابل رشک تھی اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی مگر ایک روز جب وہ آپریشن تھیٹر سے باہر آئے تو اچانک سے انہیں اپنے سینے میں شدید قسم کے درد کا احساس ہوا۔ وہ اس مرض کے ماہر تھے اس لیے فوراً سے پہلے اپنی بیماری سمجھ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوا لیتے انہیں دو تین شدید قسم کے درد کے جھٹکے محسوس ہوئے اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انہیں ایمرجنسی میں شفٹ کر دیا گیا۔ عمارہ جسے کشمیر سے واپس آئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے یہ خبر سنتے ہی وہ شدید پریشانی کے عالم میں اسپتال کی طرف بھاگی تھی۔ یہی حال ڈاکٹر حلیمہ کا بھی تھا۔ ڈاکٹر یوسف کی حالت ٹھیک نہیں تھی، ڈاکٹرز ان کی زندگی بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان جنگ لڑتے ہوئے ڈاکٹر یوسف کو دو دن ہو چکے تھے۔ انہیں ہوش تو آ گیا تھا مگر ابھی بھی ڈاکٹرز ان کے حوالے سے زیادہ پرامید نہیں تھے۔ عمارہ کمزور دل کی مالک نہیں تھی مگر اپنے بابا کی بیماری نے اسے دو دنوں میں نڈھال کر دیا تھا۔ اس روز بھی عمارہ ایمرجنسی روم کے باہر بچھے بینچ پر بیٹھی اپنے بابا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی کہ اچانک اس نے کیپٹن ریان کو شعبۂ ایمرجنسی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے بابا کے ایک دوست بھی تھے جو ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کے گھر مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے تھے۔ اسپتال کے شعبہ ایمرجنسی میں روزانہ کتنے ہی لوگ آتے ہیں۔ اس لیے اس کا یوں اچانک شعبۂ ایمرجنسی میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ حیرت کا جھٹکا عمارہ کو تب لگا جب ریان اور اس کے ساتھ آنے والے اپنے بابا کے دوست کو اس نے اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کہ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر حلیمہ باہر آ کر اسے اپنے ساتھ لیے اندر کمرے میں آ گئیں۔ اس کمرے میں اپنے والد کو اس طرح مشینوں کے زیر اثر لیٹے ہوئے دیکھ کر درد کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر حلیمہ نے اسے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے والد ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا رہے ہیں، وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اپنے والد کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ ان کے قریب ہو کر ان کی بات غور سے سننے کی کوشش کرنے لگی۔
”عمارہ بیٹا! میری حالت اچھی نہیں ہے، کوئی پتا

نہیں اس سرجری کے بعد میں زندہ بھی رہ پاؤں یا نہیں، یہ میرے بچپن کے دوست کرنل خاور ہیں، تم انہیں جانتی ہو، یہ کچھ ماہ پہلے بہت سالوں بعد مجھے حادثاتی طور پر ملے تھے، انہوں نے اپنے بیٹے ایان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ابھی میرے سامنے تم دونوں کا نکاح ہو جائے، اپنے مرتے ہوئے باپ کی اس خواہش کو تم پورا کرو گی؟“
ابھی ڈاکٹر یوسف کچھ اور بھی کہنے والے تھے مگر عمارہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈاکٹر یوسف کی ہتھیلیوں پر گرتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر حلیمہ نے آگے بڑھ کر اسے خود سے قریب کر لیا، کرنل خاور اور ریان کی آنکھوں میں بھی یہ منظر دیکھ کر نمی جھلکنے لگی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں نکاح خواں اور کچھ گواہان کا انتظام کیا گیا اور اسپتال کے اسی کمرے میں ڈاکٹر یوسف کے سامنے عمارہ کو کیپٹن ریان احمد کے نکاح میں دے دیا گیا۔ ڈاکٹر یوسف بھی شاید جان گئے تھے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا ضروری سمجھا، ان کے دل کا آپریشن کیا گیا مگر آپریشن کے دوران ہی وہ زندگی کی بازی ہار گئے، ان کی موت عمارہ اور ڈاکٹر حلیمہ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ایسے میں کرنل خاور اور ریان نے انہیں بہت سہارا دیا۔ تب عمارہ کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر یوسف نے اس کے حق میں کتنا صحیح اور بروقت فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کے مثبت اثرات تھوڑے ہی عرصے بعد اس پر ظاہر ہونے لگے تھے۔

☆......☆

مظفر آباد کے خوب صورت موسم اور دلکش نظاروں نے ایان احمد کے اندر کی اداسیوں کو بہت حد تک کم کر دیا تھا اور اب تو کسی کی محبت کی ہلکی پھوار نے اس کی روح تک کو سرشار کر دیا تھا۔ ابھی تین روز پہلے تو ریان اپنے والد کرنل خاور کے حکم پر کراچی چلا گیا تھا۔ وہ تو ایان کو بھی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہ رہا تھا مگر ایان ابھی فی الحال اس خوب صورت شہر کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا، اس لیے اس نے جانے سے معذرت کر لی تھی۔ بلکہ اسے اکیلے رہنے میں زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دو دن اس نے بہت سکون سے گزارے تھے مگر تیسرے دن فون پر ریان کے ایمرجنسی میں نکاح کی خبر سن کر اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ اپنے والد کی زبانی نکاح کی تمام تفصیلات سن کر اسے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی تھی، ویسے بھی اسے ریان اور اس کی منکوحہ کے ذکر سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی، اس لیے اس نے رسمی طور پر مبارک باد دے کر فون بند کر دیا، وہ اب جلد از جلد اس لڑکی تک پہنچنا چاہتا تھا جس نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ وہ اس لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے موبائل پر اس کی کچھ تصویریں بھی اتار لی تھیں۔ جنہیں وہ دن رات دیکھتا رہتا تھا۔ ایان نے اپنے اور اس لڑکی کے حوالے سے ڈھیروں خوشنما سے خواب دیکھ لیے تھے۔ ریان کے آنے سے پہلے اس نے اس لڑکی کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب اسے کسی طریقے سے اس لڑکی سے رابطہ کرنا تھا مگر ریان کے واپس آتے ہی ایک دل ہلا دینے والا انکشاف اس کا منتظر تھا۔

☆......☆

کراچی ریان احمد کے لیے بالکل ایک اجنبی شہر تھا مگر اجنبی شہروں سے انسان کو مانوس ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا، ہاں اگر ہمسفر اجنبی ہو تو پھر دل کو بہلنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ اسے وہ لڑکی اچھی طرح یاد تھی، جسے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی، اس وقت بھی اس کے دل میں اس لڑکی کی مدد کے علاوہ کوئی اور جذبہ کارفرما

نہیں تھا اور اب بھی صرف یہی ایک احساس دامن گیر تھا کہ اسے اپنے بابا کی خواہش پوری کرنی ہے۔ اس کے بابا جان نے محض ایک فون کال پر اس کی مدد مانگی اور اس نے فوراً سے پہلے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ہمسفر کے روپ میں اسی ڈری سہمی لڑکی کو دیکھ کر ایک خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ عمارہ اس کے بابا کی پسند تھی اور اپنے بابا کی پسند اسے دل و جان سے قبول تھی۔ ریان کے نکاح کے محض ایک دن بعد ڈاکٹر یوسف کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر یوسف پہلے صرف اس کے بابا کے دوست تھے مگر اب یہ دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی اس لیے ان کی موت کے بعد تدفین تک کے تمام تر انتظامات انہوں نے ہی سنبھالے تھے۔ ریان نے صحیح معنوں میں ان کے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ صدموں سے چُور عمارہ اور ڈاکٹر حلیمہ کو بھی وہی دونوں زندگی کی طرف واپس لا رہے تھے۔ ریان حیران تھا کہ نکاح کے محض چند بولوں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ اب اس لڑکی کے آنسو اسے اپنے دل پر گرتے محسوس ہونے لگے تھے۔ کسی کا دکھ اس کے اندر کی دنیا کو بھی اداس کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اب اسے کشمیر واپس جانا تھا۔ کرنل خاور تو عمارہ کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر حلیمہ ابھی عدت میں تھیں۔ اس لیے رخصتی کے لیے عدت کے بعد کا وقت رکھا گیا تھا۔ ریان کو پہلی بار کشمیر اکیلے جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دو بھیگی بھیگی آنکھیں اسے اپنے ساتھ جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جاتے سمے کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے جیسے اسے اقرار کی ڈور تھما دی تھی۔ وہ بہت خوش تھا اور مستقبل کے حوالے سے ڈھیروں خواب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اس کے پاس ایان کو سنانے کے لیے ڈھیر ساری باتیں تھیں۔ اس نے عمارہ کی ایک تصویر بھی اپنے موبائل میں محفوظ کر لی تھی، اب اسی تصویر کو دیکھ کر اس نے یہ چند ماہ گزارنے تھے، یہی تصویر اس نے ایان کو بھی دکھانی تھی اسے امید تھی کہ ریان کو بھی معصوم سی شکل و صورت والی اپنی بھابی بہت پسند آئے گی۔ انہی سوچوں میں گم مستقبل کے تانے بانے بنتا وہ مظفر آباد پہنچ گیا۔ جہاں ایان نے انتہائی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا وہ ایان کے ایسے رویے کا عادی تھا، اس لیے اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا اور پہنچتے ہی اسے اس ایمر جنسی شادی اور یوسف انکل کی اچانک وفات کا بتانے لگا مگر ایان کی بیزاری اس کے پورے وجود سے عیاں تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان ساری باتوں سے اسے بہت کوفت ہو رہی ہو، باتوں ہی باتوں میں ریان نے اپنا موبائل نکالا اور عمارہ کی تصویر نکال کر ایان کی نظروں کے سامنے کر دی تصویر دیکھ کر ایان کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ساکت آنکھوں سے ریان کی عمارہ کے متعلق تمام گفتگو سن رہا تھا۔ ایان تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایان کتنی ہی دیر سر کو پکڑے بیٹھا رہا۔ اپنے بھائی کے لیے اس کے دل میں جو تھوڑی بہت محبت تھی۔ اس انکشاف کے بعد تو جیسے وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ زندگی نے اس کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے باپ اور بھائی نے جان بوجھ کر اس کی محبت کو اس سے چھین لیا ہے۔ اسے ہر حال میں اپنی اس محبت کو پانا اور اپنے بھائی کو اس حرکت کا مزہ چکھانا تھا۔ اس رات وہ کئی انتقامی کارروائیوں پر غور کرتا رہا، اگلی صبح اس نے ریان سے اجازت لی کہ اب وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ ریان اسے اپنے پاس مزید کچھ دن رکھنا چاہتا تھا مگر اس کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنے والد کے پاس نہیں جا رہا تھا۔ اس کی منزل اب کچھ اور تھی۔ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ کر وہ اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہر گیا تھا اور اب

اسے اپنے دوست کے ساتھ مل کر اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینی تھی۔

ریان عمارہ کی زندگی میں حادثاتی طور پر ضرور شامل ہوا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی محبت نے عمارہ کے دل میں پہلے سے ہی اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ جو اپنی محبت کو پانے کے خواب دیکھنے میں مصروف تھی۔ یوں اچانک سے محبت اس کی جھولی میں آن گرے گی۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے اس غم سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا کہ قدرت نے اس پر کس قدر مہربانی کی ہے۔ وہ ان خوش قسمت ترین لوگوں میں شامل ہو گئی ہے جن کا نصیب ان کی محبت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے وہ شدت سے اب اس دن کی منتظر تھی جس دن ریان احمد اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ پہاڑوں پر لے جائے گا۔ ریان احمد کے حوالے سے نجانے کیسے کیسے خواب اس کی پلکوں پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ اب جب کہ ڈاکٹر حلیمہ کی عدت ختم ہونے والی تھی اس لیے انہوں نے کرنل خاور سے باقاعدہ طور پر رخصتی کی بات کی تھی۔ طے یہی ہوا تھا کہ ان کی عدت ختم ہونے کے ایک ہفتے بعد ریان چھٹی پر آئے گا اور تب ایک سادہ سی تقریب میں چند افراد کی موجودگی میں عمارہ کو ریان کے سنگ رخصت کر دیا جائے گا۔ عمارہ کو رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹر حلیمہ کا ارادہ بیرون ملک جا کر اپنے شعبے سے متعلق چند کورسز کرنے کا تھا، ویسے بھی کینیڈا میں ان کی بہن رہتی تھیں اور ان حالات میں وہ کسی اپنے کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھیں۔ عمارہ کی تو خواہش تھی کہ وہ اب اس کے اور ایان کے ساتھ رہیں مگر ڈاکٹر حلیمہ اپنی بیٹی پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتیں تھیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک نہایت سوشل قسم کی خاتون تھیں مگر اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ اس غم سے اب باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ اس کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ خود کو بہت زیادہ مصروف کر لیں۔ ڈاکٹر حلیمہ کے ہی کہنے پر عمارہ نے اپنی چند دوستوں کے ساتھ مل کر اپنی شادی کے لیے کچھ خریداری کی تھی، اپنی آنے والی زندگی کے حوالے سے اسے کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا بلکہ وہ خوش تھی کہ وہ ایک بہت خوب صورت دل رکھنے والے انسان کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے جا رہی ہے۔ ایان اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں دنیا کے سب سے خوب صورت رشتے میں بندھ چکے تھے۔ ریان باقاعدگی سے اسے فون کرتا تھا۔ اس سے بات کر کے عمارہ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ صرف ظاہری طور پر نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی ایک بہت اچھا انسان تھا۔ اس روز بھی ریان کی پسند کی کچھ چیزیں خرید کر وہ واپس گھر کی طرف جا رہی تھی ابھی اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی تھی کہ اچانک سے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا، کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو گئی، اس کے بعد اسے نہیں پتا چلا کہ اس نے کتنا طویل سفر طے کیا تھا، جب اس کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بند پایا، تب اسے معلوم ہوا کہ وہ اغوا کی جا چکی ہے۔ ہر تکلیف اور پریشانی ہمارے وجود کو اندر سے کسی نہ کسی حد تک توڑتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی پریشانیوں اور تکلیفوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کا اختتام بالآخر ہمارے پورے وجود کی تباہی پر ہوتا ہے، ڈاکٹر حلیمہ کی اچانک موت سے ریان کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ کیسے غموں کے یہ پہاڑ لمحوں میں مضبوط سے مضبوط انسان کو مٹی کی ڈھیری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حلیمہ ابھی اپنے شوہر کی موت کے صدمے سے باہر نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھیں کہ اچانک سے عمارہ کے اغوا کی خبر نے ان کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ریان، کرنل خاور کے کہنے پر انہیں اپنے

پاس لے آیا تھا مگر ان کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آرہی تھی۔ عمارہ کو تلاش کرنے کے لیے کرنل خاور اور ریان نے اپنے تمام ذرائع استعمال کیے تھے مگر اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ایان نے بھی اس موقع پر ان دونوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر عمارہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ایان نے جس طرح عمارہ کی تلاش میں ان دونوں کی مدد کی تھی۔ اس سے کرنل خاور کے دل میں اپنے بیٹے سے متعلق جو شکوے شکایات تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کے بیٹے نے ان کے دکھ کو محسوس کیا ہے۔ عمارہ کے اغوا کے ٹھیک ایک ماہ بعد ایک روز اچانک ہی سوتے میں ڈاکٹر حلیمہ کا دل بند ہو گیا اور وہ اپنی بیٹی کا غم لے کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ ان کی موت نے ان کے سبھی ملنے جلنے والوں اور دوستوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ ریان کو اب ہر حالت میں عمارہ کو تلاش کرنا تھا۔ اب یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

☆......☆

مظفر آباد سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر لیپا کی خوب صورت وادی ہے۔ جس کے دلکش نظاروں کو دیکھ کر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ ایان نے عمارہ کے لیے اس جنت کی ایک پہاڑی پر چھوٹی سی دوزخ بنا رکھی تھی۔ جہاں وہ جب بھی آتا تھا اسے ذہنی اور جسمانی طور پر بہت بری طرح تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔ عمارہ اسے بہت اچھی لگتی تھی اور وہ تو بچپن سے ہی ایسا تھا جو چیز پسند آجاتی تھی اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے ہی رہتا تھا۔ اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت اپنے بھائی سے تھی۔ اسے لگتا تھا ریان ہر جگہ ہر کسی سے اس کے حصے کی محبت چھین لیتا تھا۔ وہ اپنے بابا اور اساتذہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر بار کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا کرتا رہتا تھا۔ جس سے اسے توجہ تو مل جاتی تھی مگر اس کی شخصیت کا محض منفی تاثر ہی قائم رہ پاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ریان محض اپنی ذہانت اور اچھے رویے کے باعث سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ ایان اسے دیکھ کر سوائے جلنے اور کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اور پھر فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے بعد تو وہ ہر کسی کا منظورِ نظر بن گیا۔ ایسے میں ایان کے دل میں نفرت کا پنپتا جذبہ تھوڑا اور جوان ہو گیا تھا۔ عمارہ، ریان کی بیوی ہے یہ انکشاف ایان کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ عمارہ سے زبردستی اپنی بات منوا لے۔ اس مقصد کے لیے وہ کراچی گیا اور اپنے ایک دوست کی مدد سے عمارہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لیں اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا اور پھر وہ وقت آ ہی گیا، جب وہ عمارہ کو اغوا کر کے کشمیر لے آیا اسے لگتا تھا کہ وہ زور زبردستی سے عمارہ سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا کر اس سے نکاح کر لے گا مگر عمارہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر ایان کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بہت کمزور ہو گئی تھی مگر ایان کے لیے سوائے نفرت اور غصے کے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ انہی دنوں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایان نے جب یہ خبر عمارہ کو سنائی تو عمارہ کو لگا جیسے کسی نے کھولتا ہوا گرم پانی اس کے اوپر انڈیل دیا ہو۔ کمزور تو وہ پہلے ہی بہت ہو چکی تھی۔ اس خبر کے بعد اسے لگا کہ جو تھوڑی بہت سانسیں اس کے وجود کے اندر باقی رہ گئیں ہیں وہ بھی اب باہر نکل جائیں گی۔ اس کے اندر موجود مزاحمت بھی اب دم توڑ چکی تھی۔ وہ بہت خاموش رہنے لگی تھی اور ایک روز جب ایان نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا تو اس نے سر جھکا دیا۔ ایان بہت خوش تھا اسے لگ رہا تھا اب وادی میں موجود خزاں رسیدہ لمحوں میں بہار نے دستک دینی شروع کر دی ہے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆......☆

حمزہ بلال، کرنل خاور کے اسکول کا ایک انتہائی ذہین طالب علم تھا۔ اس کی اسکول کی تعلیم اب مکمل ہونے ہی والی تھی۔ انہیں امید تھی کہ وہ کالج جا کر بھی ان کے ادارے کا نام روشن کرے گا۔ اب کی بار وہ چھٹیوں کے بعد واپس آیا تو انہیں کچھ پریشان سا لگا۔ وہ حمزہ کو اپنے اسکول کا بہت بڑا اثاثہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انتہائی پریشانی کے باوجود وہ حمزہ سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکے۔ جواب میں حمزہ نے انہیں ایک بہت عجیب بات بتائی جسے سن کر وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ حمزہ نے انہیں بتایا تھا کہ اب کی بار جب وہ گھر گیا تو ان کے گھر سے چند کوس کے فاصلے پر واقع ایک خالی مکان میں کوئی رہنے کے لیے آگیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی۔ وہ جب بھی اس گھر کے پاس سے گزرتا وہاں سے رونے کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ عجیب سی درد بھری سسکیاں تھیں جو اسے بہت بے چین رکھنے لگی تھیں۔ گھر کے باہر سخت قسم کا پہرہ تھا، جس کے ہوتے ہوئے حمزہ کا اندر جانا بہت مشکل تھا مگر اتنا اسے احساس ہو گیا تھا کہ اندر موجود لڑکی کسی مشکل میں ہے۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر یہ مدد کیسے ہو گی؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا، اسی دوران اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ اپنے ادارے میں واپس تو آگیا تھا مگر وہ آوازیں اسے سونے نہیں دیتی تھیں۔ کرنل خاور کو یہ سب سن کر دکھ تو بہت ہوا تھا مگر ساتھ میں حمزہ پر فخر بھی محسوس ہو رہا تھا جو کسی کے دکھ کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ حمزہ کی ہر طرح کی مدد کے لیے تیار تھے کہ شاید اس طرح اس کی پریشانی کم ہو جائے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ساتھ پولیس اور فورسز کے کچھ لوگوں کو لے کر جائیں، پہلے اپنے ایک دوست کے ذریعے انہوں نے حمزہ کی بات کی تحقیق کروائی تو پتا چلا کہ حمزہ کی کہی ہوئی بات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور تھی۔ اس جگہ پر واقعی میں کوئی لڑکی مشکل میں ہے۔ اب انہیں جلد از جلد اس لڑکی کو وہاں سے نکالنا تھا جہاں وہ اپنی زندگی کے اذیت بھرے دن گزار رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ریان کو بھی لے کر جانا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ریان کشمیر کے راستوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور انہیں امید تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں راستوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ وہ فورسز کے چند جوانوں حمزہ اور ریان کے ساتھ کشمیر کی طرف چل پڑے اور ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ حمزہ کی بتائی گئی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا چھوٹا سا مکان تھا، جس کے باہر ایک پہرے دار بندوق تانے کھڑا تھا۔ ریان اور اس کے ساتھیوں نے پہرے دار کو قابو میں کیا اور مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک مختصر سا صحن عبور کرنے کے بعد انہیں ایک کمرہ نظر آیا۔ کمرے کا دروازے بند تھا۔ ریان نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تو سامنے والا منظر اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ بھائی جس کو وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی منکوحہ کا ہاتھ پکڑتے نہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا اور وہ بکھرے بالوں اور ملگجے حلیے والی لڑکی اس کی عمارہ تو ہرگز نہیں تھی۔ خود سے بے نیاز، خلاؤں میں گھورتی لڑکی ذہنی طور پر کسی طرح بھی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ ریان ابھی حیرانگی کے عالم میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس اذیت ناک منظر نے اس کے اندر کی ساری توانائی چھین لی ہے۔ کرنل خاور نے آگے بڑھ کر ایان کو گریبان سے پکڑ لیا اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایان کو مار رہے تھے۔ ریان نے بڑی مشکلوں سے انہیں قابو کیا۔ اب انہیں کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب لوگ ایان اور عمارہ کے ساتھ واپس مظفر آباد جا رہے تھے۔ ریان اور کرنل خاور کو لگتا تھا کہ اس انکشاف

کے بعد وہ اندر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ اندرونی زخم بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ان کو ٹھیک ہونے میں مدت لگ جاتی ہے مگر ٹھیک ہو کر بھی یہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایان کا دیا ہوا زخم بھی ایسا ہی تھا۔ ریان کو عمارہ کی بھی بہت فکر تھی۔ کچھ دن مظفر آباد رہنے کے بعد وہ عمارہ کو لے کر کراچی آ گیا اور وہاں کے ایک مشہور ماہر نفسیات سے اس کا علاج کروانے لگا۔ ریان کی محبت اور توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمارہ تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کی طرف واپس لوٹنے لگی، اپنا ماضی وہ ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ اب اسے ریان کے ساتھ ایک محبت بھری نئی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔

کرنل خاور ایان سے نفرت کرنے لگے تھے بلکہ کرنل خاور ہی کیا ریان بھی جب عمارہ کو روتے ہوئے دیکھتا، اسے ایان سے اتنی ہی نفرت محسوس ہوتی۔ اس کے کراچی جانے کے بعد مظفر آباد میں اب ایان اور کرنل خاور ہی رہ گئے تھے۔ کرنل خاور کا ارادہ بھی کچھ دنوں بعد اپنے آبائی شہر جانے کا تھا۔ وہ ایان سے بات نہیں کرتے تھے مگر وہ باپ تھے آخر کب تک اپنے بیٹے سے نفرت کرتے۔ اس کے چہرے پر ندامت اور پشیمانی دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ وہ خود کو ایان کی اس منفی شخصیت کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ایان انہیں ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی خاموشی کے پیچھے کیا راز ہے۔ اگر جانتے ہوتے تو اسے کبھی بھی اس رات اکیلے دریا پر نہ جانے دیتے۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اور ایان انہیں بتائے بغیر آدھی رات کو دریا کی طرف چل پڑا۔ صبح صادق کو انہیں اس کی موت کی خبر مل گئی۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں آدھا کر دیا تھا۔ ریان بھی اپنے بھائی کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ ایان نے کبھی اس کی محبت کو نہیں سمجھا تھا اور اس بار بھی کچھ کہے سنے بغیر وہ اسے دائمی جدائی کا غم دے کر چلا گیا۔ ابھی وہ ایان کی موت کے غم سے باہر نہیں نکلا تھا کہ ایک روز اس کے بابا کرنل خاور بھی ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان حالات میں عمارہ اگر اسے نہ سنبھالتی تو وہ کب کا خود کو ختم کر لیتا۔ یہ عمارہ کی محبت ہی تھی جو اسے زندگی کی طرف واپس لے آئی تھی۔

☆......☆

یہ کوہاٹ شہر کے ایک شہر خاموشاں کا منظر ہے جہاں پہاڑوں کے درمیان دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں پر روزانہ ایک شخص آتا ہے کبھی وہ اکیلا آتا ہے اور کبھی اس کی بیوی اور بیٹا بھی اس کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ قبریں ایان اور کرنل خاور کی ہیں۔ اس شخص کا نام کرنل ریان ہے اور یہ قبریں اس کے باپ اور بھائی کی ہیں۔ اسے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ اس کا باپ اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے اور اس کے بھائی کے جانے کے بعد اس کا باپ بھی اپنے بیٹے کے پاس ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے قیمتی رشتوں کو کھو دیا۔ ان مشکل حالات میں اس نے اور عمارہ نے کیسے ایک دوسرے کو سنبھالا یہ وہی جانتے تھے مگر ان دونوں کے درمیان محبت نے غم کے اس احساس کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام ایان رکھا تھا مگر اس نے اسے ویسا ایان نہیں بنانا تھا بلکہ اسے زندگی سے محبت کرنے والا ایان بنانا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ ایان کسی سے نفرت اور حسد نہیں کرے گا۔ اب وہ واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں عمارہ اور ایان اس کے منتظر تھے۔ اسے امید تھی کہ آنے والے وقت میں اب کوئی ایان کسی عمارہ کو اپنی ضد کی بھینٹ نہیں چڑھائے گا اسے محبتوں کا ایک جہان بسانا تھا اور وہ پرامید تھا کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔

......☆......



نظیر فاطمہ

افسانہ

یوم مجنوں

فروری کا مہینہ شروع ہوتے ہی ماجد بھائی کے اندر کا مجنوں پوری شدت سے جاگ اٹھتا تھا۔ ویسے تو مجنوں کے علاوہ فرہاد، رانجھا، پنوں اور نہ جانے کون کون سے عاشقوں کی فہرست ہے مگر ماجد بھائی مجنوں کے بہت بڑے عقیدت مند تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ پاکستان میں ویلنٹائن ڈے پر پابندی لگا کر ''یومِ مجنوں'' منانے کا حکم صادر کردیتے لیکن کیا کیا جائے کہ لوگ مجنوں کا نام سن کر برے برے منہ بنانے لگتے ہیں۔ نوجوان ویلنٹائن کے اتنے دیوانے ہیں کہ ویلنٹائن ڈے کی تیز و تند آندھی میں ان سوکھے پتوں کی طرح اڑنے لگتے ہیں جنہیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ آندھی تھمنے کے بعد گریں گے کہاں؟

''تم لوگوں کو ویلنٹائن ڈے مناتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ اتنا بڑا عاشق موجود ہے تم لوگوں کے پاس مجنوں مگر تم لوگ مغرب کی اندھی تقلید میں اس عظیم ہیرو کو بھول چکے ہو۔ تم سب کو تو مجنوں کے حوالے سے محبت کا عالمی دن منانا چاہیے اور وہ بھی عین 14 فروری کو تاکہ مغرب والوں کو اس ویلنٹائن ڈے کا منہ توڑ جواب دیا جاسکے۔'' ماجد بھائی کے پانچ دوستوں کا گروپ چھپ چھپا کر ویلنٹائن ڈے منانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ چھپ کر اس لیے کہ اگر ان کے اباؤں کو پتا چل جاتا تو چھترول لازمی تھی۔ وہ سب تیاریوں میں مگن تھے اور ماجد بھائی انہیں شرم دلا رہے تھے۔

''ارے جاؤ...... بڑا آیا مجنوں کا جانشین...... اب کون مجنوں کی طرح لیلیٰ کے غم میں پاگل ہوجائے اور گریبان چاک کر کے بکھرے بالوں کے ساتھ صحراؤں کی خاک چھاننے جائے۔ اوپر سے ستم یہ کہ اظہارِ محبت بھی نہ کرسکے۔ ویلنٹائن کی طرح صاف ستھرے پینٹ کوٹ اور ٹائی میں سر پر ہیٹ رکھ کر ہاتھوں میں ایک خوب صورت گلاب لیا اور بس اظہار محبت کردیا۔'' عدیل نے بڑی بے رحمی سے مجنوں پر تنقید کی۔

''مرے تو دونوں محبت میں ہی نا۔'' ماجد بھائی نے اکڑ کر دلیل دی۔

''ہاں! مگر ویلنٹائن نے محبت کا اظہار تو کردیا تھا۔ پھر بھلے سے مر گیا...... اور...... مجنوں صرف لیلیٰ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اس کی گلی کے سو چکر لگاتا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو پاگل ہوگیا اور اب یومِ مجنوں منانے کا مطلب ہے کہ ہم بھی اپنے سروں میں خاک ڈال دیں۔'' سبحان کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

اب کے ماجد بھائی کو خاموشی اختیار کرنا پڑی کہ بہرحال یہ ایک حقیقت تھی کہ ویلنٹائن ڈے منانا قدرے سہل تھا مگر انہوں نے زبان سے اس بات کا اقرار نہ کیا کہ آخر تھے تو مجنوں کے پکے پیروکار۔

☆......☆

ماجد بھائی کو ہر سال فروری کے مہینے کے شروع میں یہ احساس ہونا شروع ہوجاتا تھا کہ وہ فلاں لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں مگر ہر سال یہ احساس صرف ان کے دل تک ہی محدود رہتا تھا۔ ان کی یہ

کیفیت فروری کے اینڈ تک رہتی۔ شاید یہ ویلنٹائن ڈے کے غلغلے کی وجہ سے ہوتا تھا کیونکہ مارچ شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ کیفیت پورے سال کے لیے کہیں جا سوتی تھی۔ اس سال ماجد بھائی کو یونیورسٹی میں اپنی ایک کلاس فیلو مشی سے محبت میں مبتلا ہونے کا احساس ہورہا تھا۔ وہ دل میں ٹھان چکے تھے کہ وہ اپنے دوستوں کو ”یومِ مجنوں“ منا کر دکھائیں گے۔

آج فروری کی پانچ تاریخ تھی۔ ان کے پاس آٹھ دن تھے جن میں انہوں نے اپنے پروگرام کو ترتیب دینا تھا اور نویں دن اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

ماجد بھائی ہر روز مشی کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ مختلف طریقوں سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے لگے۔ مگر اُدھر کسی کو پروا نہیں تھی۔ مشی برقعے میں لپٹی ہوئی آتی۔ کلاسز لیتی اور خاموشی سے واپس چلی جاتی۔ وہ کبھی بھی کلاسز کے بعد کسی سرگرمی یا تقریب کے لیے نہیں رکتی تھی۔ ماجد بھائی اپنی یک طرفہ محبت کی پینگیں چڑھاتے گئے...... چڑھاتے گئے...... یہاں تک کہ تیرہ فروری کا دن آن پہنچا۔

”ہائے! اب میں کیا کروں؟ ویلنٹائن ڈے منانے والوں نے تو گلاب اور امپورٹڈ چاکلیٹ خرید لیے ہیں میں کیا خریدوں؟“ اب انہیں مجنوں کی تہی دامنی کا شدت سے احساس ہوا۔

”اچھا چلو کوئی بات نہیں...... میں امپورٹڈ کی بجائے لوکل چاکلیٹ لے لیتا ہوں اور سرخ گلاب کون سا ویلنٹائن کی ملکیت ہے۔ میں دیسی سرخ گلاب خرید لوں گا۔ اب بھلے ”یومِ مجنوں“ ہی منانا ہو۔ ”محبوبہ“ کے پاس خالی ہاتھ تو نہیں جایا جاسکتا۔“ انہوں نے خود کو تسلی دی۔

☆......☆

چودہ فروری کی صبح ایک اور مسئلہ ان کا منتظر تھا کہ وہ اپنی ”محبوبہ“ کو یہ چیزیں کیسے پہنچائیں۔

”ہاں! میں کون سا ویلنٹائن ڈے جیسا واہیات دن منا رہا ہوں۔ میں سیدھا مشی کے گھر چلا جاؤں گا۔“ ماجد بھائی نے اپنے اس ”بے وقوفانہ خیال“ پر خود کو ایک خیالی تھپکی دی۔

ماجد بھائی نے لوکل چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبہ خریدا، ایک دیسی گلاب لے کر مشی کے گھر کے دروازے پر جا پہنچے اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

”السلام علیکم!“ ایک مضبوط تن و توش والا آدمی باہر آیا تو ماجد بھائی نے فوراً سلام جھاڑا۔

”وعلیکم السلام!“ اس آدمی نے ماجد بھائی کا گھور کر جائزہ لیا تو وہ تھوڑا سا گھبرا گئے۔

”مشی، میری کلاس فیلو ہے۔ میں اسے یہ چاکلیٹ اور پھول دینے آیا ہوں۔“ ماجد بھائی نے جھٹ سے دونوں چیزیں اس آدمی کے سامنے کردیں۔ اس کے چہرے پر جلال چھا گیا۔

”ارے! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ویلنٹائن ڈے جیسی بے ہودہ رسم کا قائل نہیں ہوں۔ میں تو چودہ فروری کو ”یومِ مجنوں“ قرار دے کر آیا ہوں۔“ ماجد بھائی نے تھوڑا سا سینہ پھلا کر کہا۔ اس آدمی نے گردن گھما کر گھر کے اندر آواز دی۔

”ارے! سب سن رہے ہو...... یہ لونڈا...... مجنوں کا جانشین بن کر اپنی مشو کو پھول اور چاکلیٹ دینے آیا ہے۔“ آناً فاناً سات آٹھ اونچے لمبے آدمی جو مشی کے بھائی تھے ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہاکیاں پکڑے باہر آئے اور سب مل کر ماجد بھائی پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔ ماجد بھائی اپنا بچاؤ کرتے ہوئے ضربیں کھاتے رہے اور منہ سے نکلنے والی چیخوں کا گلا گھونٹتے رہے جو روکتے روکتے بھی حلق سے برآمد ہورہی تھیں۔

”ارے! اسے چھوڑو...... یہ اب اٹھنے کے قابل نہیں رہا...... جاؤ...... اندر سے کتا لے کر آؤ اور اس پر چھوڑ دو تاکہ اسے ہماری مشو کو پھول اور چاکلیٹ دینے کا مزا ساری زندگی یاد رہے۔“ کتا شاید زیادہ ہی طاقت ور تھا جو سب کے سب اندر دوڑ گئے۔ ماجد بھائی کے دوستوں کے لیے بس اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ سب جو گلی کے نکڑ پر چھپ کر ماجد بھائی کو پٹتے دیکھ رہے تھے۔ دوڑ کر آئے، ان کو ٹانگوں، بازوؤں، گردن، سر، بالوں، غرض جہاں کسی کا ہاتھ پڑا ڈالا اور انہیں اٹھا کر بھاگ گئے اور گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا...... جب وہ لوگ کتا لے کر آئے تو خالی گلی سائیں سائیں کررہی تھی۔ وہ سب ناک پر انگلیاں دھرے حیران کہ لونڈے کو زمین کھا گئی یا آسمان۔

☆......☆

”یہ لے...... مر، اب...... اگر تیری پراسرار حرکتوں کی وجہ سے تیرا پیچھا نہ کرتے تو آج تو مرا ہی مرا تھا۔“ ماجد بھائی کے دوستوں نے انہیں اسپتال کے بستر پر پٹخا۔

”ارے جگر! یومِ مجنوں ہو یا ویلنٹائن ڈے کسی کے گھر جا کر علی الاعلان نہیں بلکہ چوری چھپے کرنے والے کام ہیں۔ سرِ عام کرو گے تو یہی حال ہوگا تو کیا سمجھ رہا تھا کہ یوم مجنوں منانے پر تمہیں پھولوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔“ سبحان نے ان کو آئینہ دکھایا۔

”ویسے یار! ہم وہی کام چھپ کر کرتے ہیں جو غلط ہو۔ تو کیا ویلنٹائن ڈے منانا بھی غلط ہے۔“ عدیل نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہے تو غلط...... اب ہم مانیں یا نہ مانیں...... انجوائے منٹ کہہ کر گزر جائیں یا کچھ اور مگر حقیقت حقیقت ہی رہے گی۔“ سبحان نے کندھے اچکا کر تلخ سچ کی بات کی۔

ماجد بھائی ان کی باتوں کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ہونٹوں سے آہ و بکا کے علاوہ کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ البتہ ایک بات ان کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آگئی تھی کہ ویلنٹائن ڈے ہو یا یومِ مجنوں، تجدید و اظہارِ محبت کا ہر وہ طریقہ جو ہمارے معاشرے اور دین کے اصولوں کے خلاف ہو غلط ہے اور اس میں اسی طرح پٹنے کا اندیشہ ہے۔

......☆......

ماریہ یاسر

افسانہ

محبت ایک دن کا مزار

''سماویہ یار! جلدی سے مجھے چائے پلادو، میں نے ضروری کام سے صفدر کی طرف بھی جانا ہے۔''

زوہیب نے چوتھی بار کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔
''جی جی بس لارہی ہوں۔'' اس نے جلدی جلدی



چائے پیالیوں میں ڈالنی چاہی تو پتیلی سے تھوڑی سی چائے اس کے ہاتھ پر گر گئی۔
''آئے اللہ ہی......'' تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''یار! چائے لارہی ہو یا میں جاؤں۔'' اب کی بار زوہیب کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔
''یہ لیں چائے۔'' ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے پکڑے دوسرے ہاتھ پر ٹوتھ پیسٹ لگا کے اس نے زوہیب کو چائے پکڑائی۔
''کمال ہے یار! اتنی دیر کرادی تم نے چائے کے

چکر میں، یہ تو چائے نہیں پائے بن گئے ان کے چکر میں میرا ضروری کام رہ جاتا۔'' اس نے جلدی جلدی چائے کے گرم گھونٹ بھرتے طنز کیا۔
''زوہیب! میرا ہاتھ جل گیا تھا چائے سے اس لیے تھوڑی دیر لگ گئی۔'' اس نے اپنا جلا ہاتھ شوہر کے آگے کیا۔
''کمال ہے یار کوئی کام تم سے ٹھیک سے نہیں ہوتا۔'' اس نے خالی پیالی ٹرے میں واپس رکھی اور جلدی جلدی جوتے پہن کے نکل گیا۔
''حد ہے زوہیب! آپ کو دو منٹ دیر ہو گئی تو





غصہ ہو گئے لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ کتنی تکلیف ہو رہی ہے مجھے۔" اس نے ٹوتھ پیسٹ لگے ہاتھ پر نظر ڈالی۔

"ایک بار پوچھ ہی لیتے میرا دل رکھنے کے لیے کہ کیسے جل گیا ہاتھ لیکن آپ کو کیا پرواہ آپ کو تو اپنے کام ٹائم پر کیے ملنے چاہیں۔ میں مروں یا جیوں آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

☆......☆

"یہ دیکھو! فیصل نے مجھے شادی کی سالگرہ کا گفٹ دیا کل۔" عنائیہ نے اپنی کلائی اس کے آگے لہرائی تو اس میں لشکارے مارتے دو کنگن اس کو چونکانے کے لیے کافی تھے۔

"بہت خوب صورت ہیں عنائیہ! فیصل بھائی تم سے بہت پیار کرتے ہیں ناں۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

"ہاں یار! بہت چاہتے ہیں فیصل مجھے آخر کو لو میرج جو کی تھی مجھ سے پیار تو بہت کرتے ہیں۔" کہتے ہوئے اس کی گردن تن سی گئی۔

"لو میرج تو زوہیب نے بھی مجھ سے کی تھی۔" اس کے بڑبڑانے پر عنائیہ چونک گئی۔

"کیا ہوا سماویہ! کوئی مسئلہ ہے کیا۔ زوہیب بھائی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟" اس نے چائے کی پیالی ٹیبل پر واپس رکھ دی۔

"نہیں بابا لڑائی کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ بات کرنا تو دور، ٹائم ہی نہیں ہوتا ان کے پاس میرے لیے۔ آفس سے آتے ہیں تو دوستوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ میں اکیلی سارا دن گھر میں ان کے انتظار میں سوکھتی رہتی ہوں۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"تم بولا کرو کہ تمہیں بھی ٹائم دیا کریں بتاؤ کہ تم ان کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہو سارا سارا دن، کچھ وقت تمہارے لیے بھی نکالیں اور تھوڑا تم تیار بھی ہوا کرو، جب زوہیب بھائی کے آنے کا وقت ہو تو خوب اچھے سے تیار ہوا کرو، خود بھی ان کو گفٹ دیا کرو اور خاص موقعوں پر ان سے لیا بھی کرو۔" عنائیہ نے اپنے کنگنوں پر فخریہ نظر دوڑائی۔

"کہاں یار میں تیار ہوتی ہوں تو دھیان ہی نہیں دیتے۔ میں خود سے پوچھوں کہ کیسی لگ رہی ہوں تو بغیر نظر ڈالے بول دیتے ہیں کہ ٹھیک ہی لگ رہی ہو۔ اس وقت اتنا رونا آتا ہے کہ کیا بتاؤں اور گفٹ کا تو نام بھی مت لو۔ پچھلے ہفتے جب میری سالگرہ تھی تو میں نے پہلے تو انتظار کیا کہ شاید خود ہی دے دیں لیکن گفٹ دینا تو دور کی بات وش تک نہ کیا تو میں نے بھی گلہ کر دیا تو بجائے شرمندہ ہونے کے کہنے لگے کہ یاد ہی نہیں رہا، میں نے کہا کہ اب دے دیں تو کہنے لگے کہ آج کل تو بالکل بھی ٹائم نہیں، جب ٹائم ملے گا تو دے دوں گا۔" سماویہ بالکل روہانسی ہو گئی۔

"اچھا تم فکر مت کرو ایسا کرو کہ تم ویلنٹائن ڈے پر زوہیب بھائی کو گفٹ دینا اچھا سا اور ابھی سے بول دو کہ 14 فروری کو ڈنر باہر کروائیں تمہیں ٹھیک ہے ناں ان کو بول دو کہ ابھی تین دن رہتے ہیں ویلنٹائن ڈے میں تو جتنے بھی کام ہیں نمٹا لیں۔ اس دن کوئی بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔" اس کے کہنے پر سماویہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے تو فیصل کو ابھی سے بول دیا ہے کہ گفٹ میں مجھے ڈائمنڈ رنگ چاہیے اور لنچ یا ڈنر میرے فیورٹ ریسٹورنٹ میں۔" اس نے فخریہ کہا جیسے بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہو۔

"تو فیصل بھائی مان گئے رنگ اور ڈنر کے لیے۔" سماویہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"ہاں یار اور انکار کرتے بھی تو کیوں، آخر کو ان کی بیوی ہوں اتنا تو حق بنتا ہے میرا، اچھا اب میں چلتی ہوں فیصل آنے والے ہوں گے اور اگر ان کے آنے پر میں ان کو نظر نہ آؤں تو یہاں وہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں مجھے جب تک مجھے دیکھ نہ لیں چین نہیں آتا انہیں۔" اس نے اپنا پرس صوفے سے اٹھایا۔

"بہت لکی ہو تم کہ تمہیں فیصل بھائی جیسے کیئرنگ ہسبینڈ ملے۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"تم بھی لکی ہو جاؤ گی میں نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کرنا۔" دروازے سے نکلتے اس نے یاد کروایا تو سماویہ نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور عنائیہ کی کہی باتوں پر عمل کرے گی تا کہ زوہیب بھی فیصل کی طرح اس کا خیال رکھیں۔

☆......☆

"زوہیب! میں کیسی لگ رہی ہوں۔" وہ جو آفس سے آ کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ سماویہ کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پنک لان کے نئے سوٹ میں ہلکے سے میک اپ، کانوں میں نازک سی ایئر رنگ، ہاتھوں میں ڈھیر ساری، پنک اور وائٹ چوڑیاں پہنے وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"ٹھیک لگ رہی ہو لیکن اتنا تیار ہوئی ہو کہیں جا رہی ہو کیا؟" اس نے دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔

"اُف توبہ زوہیب! بہت برے ہیں آپ، کبھی جو میری تعریف کی ہو آپ نے، حسرت ہی رہی میری۔" وہ اب غصے میں چوڑیاں اتار کر پٹخ رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آج تمہیں اتنا غصے کیوں آ رہا ہے۔ اچھا وہ جو اس دن تمہارا ہاتھ جلا تھا اب ٹھیک ہوا کہ نہیں، لاؤ دکھاؤ مجھے کیسے جل گیا تھا۔" وہ اچانک یاد آنے پر اسے بلانے لگا لیکن وہ غصے سے کمرے سے نکل گی تو زوہیب اس کے عجیب برتاؤ پر حیران ہوا۔

"اس ویلنٹائن ڈے پر مجھے اچھا سا گفٹ چاہیے اور ساتھ ڈنر بھی باہر کرنا ہے مجھے ابھی سے سن لیں اس دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا آپ کا۔" اس نے آملیٹ اس کے سامنے رکھا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

"یار! کوشش کروں گا تمہیں پتا بھی ہے کہ نیا نیا کاروبار سیٹ کر رہا ہوں، آج کل تو ٹائم نہیں ہوتا اگر ٹائم نکل آیا تو چلے جائیں گے ڈنر کے لیے۔" اس نے بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈالنے شروع کیے۔

"زوہیب! میں بول دیتی ہوں کہ اس دفعہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی آپ کو مجھے لے کر چلنا ہی ہو گا۔ سالگرہ کے گفٹ پر بھی مجھے ٹالا تھا لیکن اس بار نہیں بہت ہو گیا، ذرا فیصل بھائی کو تو دیکھیں کتنا خیال رکھتے ہیں اتنے گفٹ دیتے ہیں عنائیہ کو، ہر دوسرے دن باہر گھمانے لے کر جاتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔ میری کوئی پرواہ ہی نہیں ذرا ٹائم نہیں میرے لیے سارا سارا دن آپ کا انتظار کرتی رہتی ہوں لیکن آپ کو کیا پرواہ میری۔" آج اس کے منہ سے سارے گلے نکل آئے۔

"یار! میں تمہارے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہا ہوں تا کہ تمہیں ہر چیز دے سکوں۔" اس نے اپنی صفائی دینی چاہی تو وہ غصے سے کچن میں چلی آئی۔ زوہیب اسے منانے کچن کی طرف گیا۔ دروازے پر پہنچ کر نظر کلائی میں بندھی گھڑی پر ڈالی جو پونے آٹھ بجا رہی تھی تو سماویہ کو منانے کا ارادہ موقوف کر کے تیار ہونے چل دیا۔

"بس یہی پیار ہے جو میں ناراض ہوں تو منایا تک نہیں، میری کیا پرواہ بھاڑ میں گئی میں۔" تیاری کرتے زوہیب نے اس کی بڑبڑ سنی تو مسکرا دیا۔

☆......☆

زوہیب کے ماں باپ زندہ نہ تھے بس ایک بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور سعودی عرب میں مقیم تھی۔ زوہیب اپنی یونیورسٹی میں جونیئر کلاس کی سماویہ کو پسند کرنے لگا تو پڑھائی مکمل کر کے بہن سمیرا کو ساری بات بتائی اور نوکری لگتے ہی سماعیہ کے گھر رشتے کے لیے بھیجا یوں آناً فاناً دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے مہینے بعد ہی نند سمیرا واپس اپنے گھر چلی گئی۔ یوں وہ اکیلی سسرال کے جھنجھٹ سے آزاد خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ جب اچانک زوہیب کو اپنا

کاروبار کرنے کا شوق ہوا تو ماں باپ کے چھوڑے پیسے کو کاروبار میں لگا کر خوب محنت کرنے لگا تاکہ سماویہ کو دنیا کی ہر خوشی دے سکے، نئے کاروبار کو پروان چڑھانے میں اسے وقت کا ہوش ہی نہ رہتا، صبح کا گیا رات کو لوٹتا تو تھکن سے چُور ہو کر سوتا تو صبح ہی اٹھتا۔
اس ساری صورت حال میں اسے احساس تک نہ ہوا کہ سماویہ اس کی مصروفیت سے کتنی ڈسٹرب رہنے لگی ہے۔ شادی کے پانچ مہینے بعد جب اس کی سالگرہ گزری تو کام کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے ذہن سے نکل گیا۔ بعد میں اس کے یاد دلانے پر وقت کی کمی کی وجہ سے ابھی تک اس کا گفٹ نہ دے سکا۔ تو اس بات پر سماویہ کا دل بہت دکھا اوپر سے اس کی سہیلی عنائیہ جب اپنے شوہر کی وارفتگیاں بتاتی تو وہ اور یاسیت کا شکار ہو جاتی۔

☆......☆

"کل اگر ویلنٹائن ڈے کا گفٹ نہ دیا اور باہر نہ لے کر گئے تو میں بھی امی کی طرف چلی جاؤں گی اور وہیں رہوں گی جب تک انہیں احساس نہیں ہوتا۔" اس نے رخ موڑ کر لیٹے زوہیب پر نظر ڈالی اور خود سے یاد دہانی کی۔
"بس آج رات سو جاؤ اے دل، کل سماویہ کو سرپرائز دینے کے لیے ابھی چپ ہونا بہت ضروری ہے۔" اس نے ناراض بیوی کو منانے کے لیے تڑپتے دل کو ڈپٹا۔

☆......☆

"مجھے یقین ہے کہ آج بھی لیٹ آئیں گے میں جا کے بیگ پیک کر لیتی ہوں کل صبح ہی امی کی طرف چلی جاؤں گی۔ پھر شاید احساس ہو کہ محبت کا اظہار کتنا ضروری ہے۔" اس نے کپڑے بیگ میں ڈال کے زپ بند کی ہی تھی کہ دروازے کی بیل پر چونک اٹھی۔
"آپ اس وقت، مجھے یقین نہیں آ رہا۔" زوہیب کے ساتھ اندر آتے اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی جو 7 بجنے کا پتا دے رہی تھی۔
"کیوں جناب اس میں یقین نہ آنے کی کیا بات ہے۔ آپ نے خود ہی تو کل بولا تھا پھر انتظار بھی تو کرنا چاہیے تھا ناں۔" اس نے اس کے رف حلیے کی طرف اشارہ کر کے اپنے سے قریب کر لیا تو وہ کچھ دیر پہلے کی ناراضی بھول بھال کے اس کی سنگت میں ہر گلہ بھول گئی۔
"اچھا ہٹیں میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" اس کو ابھی بھی خواب کا عالم لگ رہا تھا۔
"ہاں تیار ہو جانا لیکن پہلے اپنے گفٹ تو لے لو۔" اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو خوب صورت سی ڈبیا نکالیں۔
"یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ، ہیپی برتھ ڈے اور یہ تمہارا ویلنٹائن ڈے کا گفٹ اور بوکے، ہیپی ویلنٹائن ڈے میری جان اور پلیز ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ سے ناراض مت ہوا کرو۔ میں یہ سب محنت صرف تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔ اس لیے ناراض مت ہونا دوبارہ کبھی بھی۔" اس نے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
"اچھا میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" دونوں ہاتھوں میں اس کے گفٹ پکڑے خوشی سے سرشار لہجے میں کہتی ہوئی اٹھی، آخر اس کو اندر پیک پڑے بیگ سے کپڑے نکال کر بیگ کو زوہیب کے اندر جانے سے پہلے ہٹانا بھی تو تھا۔
"یہ تو چیٹنگ ہے اپنا گفٹ تو لے لیا تم نے، میرا گفٹ ویلنٹائن ڈے کا تو دے جاؤ۔" زوہیب کی بات کا مطلب سمجھ کے وہ اندر بھاگ گئی تو وہ مسکرا دیا۔ غلط فہمی کے بادل چھٹنے پر دونوں ہی خوش تھے اور اس محبت کے دن کو اور بھی محبت بھرا اور یادگار بنانے کے لیے دونوں ہی پرعزم تھے لیکن محبت کے لیے صرف ایک دن ہی کیوں بلکہ محبت تو روز منانی چاہیے کیونکہ محبت کے تو دن ہزار ہونے چاہییں۔

......☆......

ثناء کنول اللہ دتہ

افسانہ

میرے دل کی ملکہ

''السلام علیکم میں نوشین سید منور بات کررہی ہوں جی مجھے اپنی تحریروں کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ شائع ہوں گی یا پھر نہیں۔'' اس نے کچھ ڈر کر کہا اور اپنی تحریروں کے نام بتانے لگی جب کہ دروازے میں کھڑی نورامر نے اسے جلدی سے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایڈیٹر کے کہے جملوں پر اس کی خوشی سے بھرپور چیخ اتنی زور سے تھی کہ یقیناً ایڈیٹر نے فوراً فون کو اپنے کان سے ہٹایا ہوگا اور نورامر بھاگ کر اس کی طرف آئی تو اس نے تھینک یو کہہ کر فون جلدی سے رکھا اور اسے تقریباً کھینچ کر گلے سے لگاتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔

''میری کہانی شائع ہوگئی ہے یاہو......''

''کیا......اوہو میرے اللہ......''

اس کے بعد کیا تھا دونوں کی چیخوں سے ''سید منور ولا'' گونج اٹھا تھا۔ شافعہ بیگم ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور انہیں اچھل کود کرتے دیکھ کر سخت لہجے میں بولیں۔

''کیا ہورہا ہے یہ اور بندروں والی حرکتیں کیوں کررہی ہو تم دونوں۔''

''جی امی وہ......'' نوشین انہیں دیکھ کر صرف اتنا ہی کہہ سکی تو نورامر اپنی عقل کے مطابق بولی۔

''وہ امی ٹی وی گر گیا تھا۔''

''ٹی وی ہمارے گھر کہاں سے آگیا، دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔''

''نہیں امی! اس کی بات کا مطلب ہے ابھی چھپکلی گری تھی تو ہماری ڈر کی وجہ سے چیخ نکل گئی۔''

وہ فوراً نورامر کو گھورتے ہوئے بولی، جس نے اسے مار کھلانے کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ اس کی بات پر وہ دونوں کو گھورتیں ہوئیں باہر چلی گئیں تو انہوں نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

☆......☆

اس نے ایک نظر اپنے پاس سوئی ہوئی نورامر پر ڈالی اور اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس چلی آئی۔ اپنی لاک کی ہوئی دراز سے اس نے اپنی ادھوری کہانی اٹھائی اور اسے لے کر ٹیبل پر چلی آئی۔

کتنا شوق تھا نا اسے اپنی پہلی لکھی کہانی کے شائع ہونے کا۔ کتنا ارمان تھا کہ جب اس کی پہلی تحریر شائع ہوگی تو وہ خوب ہنگامہ کرے گی۔ پارٹی کرے گی سب دوستوں رشتے داروں کو دکھائے گی کہ یہ دیکھو نوشین سید منور کی کہانی یعنی کہ میری کہانی سب کتنا خوش ہوتے نا۔ لیکن اس کا یہ خواب شاید کبھی بھی پورا نہ ہوگا وجہ وہی عام سی ہی تو تھی ابو رسالے کہانیاں پڑھنے کے خلاف تھے اور ساری زندگی ان کی خواہش کے مطابق گزار دینے والی شافعہ بیگم بھی سید منور کے ساتھ تھیں اور بھائی تو اس کے تین تھے ارسلان جو کہ ایک بچے کا باپ تھا۔ اس کی بیوی علینہ جو صرف ارسلان اور بیٹے حمزہ کے علاوہ کسی کے وجود سے واقف نہ تھی جب کہ جبران اور عدنان کالج بوائے تھے۔ صرف نورامر ہی تھی اس کی ہم راز، وہ رات رات بھر بیٹھ کر کہانی لکھا کرتی اور نورامر صبح کالج

جاتے وقت انہیں پوسٹ کر دیتی۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں کوئی آزادی ہی حاصل نہیں تھی، انہیں ہر چیز کی آزادی تھی۔ جو دل کرتا کھاتیں جو دل کرتا کرتیں من چاہا پہنتی لیکن صرف گھر تک۔ ساری زندگی وہ اپنی دوستوں کے گھر نہیں گئی تھیں۔ بقول بابا ”نورامر ہے تو اس سے دوستی کر لو بری صحبت انسان کو برا کر دیتی ہے نوشین بیٹا تم تو سمجھدار ہو۔“ اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ پاتی۔ کالج جاتی تھی تو وہاں پر بریک میں یا پھر کسی فری پریڈ میں دوستوں سے ڈائجسٹ پڑھ لیتی تھی گھر والوں سے چوری اور بی اے کے بعد وہ جب گھر بیٹھی تو تعلیم سے زیادہ اسے ڈائجسٹ کے نہ پڑھنے کا دکھ تھا اور یہ دکھ اس وقت کم ہوا جب اس نے ارسلان بھیا سے کہہ کر کچھ وقت کے لیے ان کا انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت لی اور بھائی نے اسے صرف ایک گھنٹے کے لیے روزانہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ یہ ایک گھنٹہ انٹرنیٹ پر ڈائجسٹ پڑھنے میں گزار دیتی تھی۔ اس نے بس ایک بار امی سے کہا تھا۔

”امی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا کوئی بری بات تو نہیں ہے نا بلکہ اسے پڑھنے سے تو انسان کو شعور آتا ہے زندگی کا مقصد سمجھ میں آتا ہے تو آپ اس کے خلاف کیوں ہیں۔“ اس کی بات پر امی نے اسے جن نظروں سے گھور کر دیکھا تھا وہ نظریں اسے آج بھی یاد تھیں ان کے الفاظ بھی۔

”میں نے کبھی رسالے نہیں پڑھے کہ مجھے پتا ہو ان میں کیا لکھا ہوتا ہے میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ تمہارے ابو کو یہ بات پسند نہیں ہے تو میں ان سے اختلاف کیسے کر سکتی ہوں۔ بس تم نے آج ڈائجسٹ کا نام لیا ہے دوبارہ مت لینا ورنہ تمہارے ابو بہت ناراض ہوں گے۔“ ان کی بات پر وہ انہیں صرف دیکھ کر ہی رہ گئی تھی۔ پھر پتا نہیں کب اور کیسے اس نے کہانی لکھنے کا سوچا تھا جس پر نورامر نے ہمیشہ کی طرح اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور آج وہ کتنی خوش تھی مگر ایک ادھوری سی خوشی تھی۔

”اے کاش! ابو امی اس بات کے خلاف نہ ہوتے تو آج میری زندگی کا یادگار دن ہوتا۔“ وہ دکھ سے سوچتے ہوئے بے دلی سے اٹھی اور اپنی چیزیں واپس رکھ کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی ایک بے دلی کی سی حالت میں۔

☆......☆

ایک کے بعد ایک اس کی کہانیاں شائع ہوتی چلی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے سب ہی پسند کرنے لگے۔ ان دنوں وہ ایک سلسلے وار ناول لکھنے میں مصروف تھی اور اس وقت بھی وہ ناول لکھنے میں مصروف تھی۔ جب کوئی ناک کر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے جلدی سے ناول کو اٹھا کر کے رکھ دیا۔ مڑی تو دروازے میں شافعہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں کچھ پریشان سی اور شاید اپنی اسی پریشانی کی وجہ سے وہ نوشین کا گھبرانا بھی محسوس نہیں کر سکی تھیں۔

”ارے امی آپ...... آئیں نا کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں۔“ وہ اٹھ کر کچھ حیرانی سے بولی تو شافعہ بیگم بیڈ کے کونے پر ٹکتے ہوئے نم آواز میں بولیں۔

”مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میری چھوٹی سی نوشین آج اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ مجھے اب اسے رخصت بھی کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب امی! کیا بات ہے کھل کر بات کریں آپ؟“ اس کی بات پر وہ ایک گہرا سانس بھر کر بولیں۔

”آج تمہاری مامی فرحین آئی تھیں تمہارے ماموں اجمل اور جمال کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگنے جمال کے لیے۔“

”کیا امی......؟“

”ہاں تمہارے ابو نے فوراً ہاں کر دی ہے، اگلے مہینے کی 12 تاریخ کو نکاح ہو گا اور 14 تاریخ کو رخصتی۔ سچ میں بے حد خوش ہوں ایک ماں کے لیے اس بات سے بڑھ کر اور کیا بات ہو گی کہ اس کی بیٹی اس کے اپنے ہاتھوں سے رخصت ہو۔“

”امی! آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔“ وہ بات کر رہی تھیں

کہ نورامر آ کر بولی تو وہ اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

”کیا ہوا بت بن کر کیوں بیٹھی ہو تم؟“

”نورامر! میری شادی جمال سے، میں نہیں کر سکتی بالکل بھی نہیں۔“

”کیوں کیا کمی ہے ان میں، اچھے خاصے ہینڈسم ہیں ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہیں۔“

”ان کے خیالات بھی تو امی اور ابو کی طرح ہوں گے تم جانتی ہو اب کہانیاں لکھنا میرا شوق نہیں عادت بن چکا ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکوں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”کیا پتا جمال بھائی کو اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو یار کچھ اچھا سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھاتی رہی اور وہ گم صم سی ہوں ہاں کرتی رہی۔

☆......☆

دنوں کو تو جیسے پر ہی لگ گئے تھے۔ ایک دو تین کے بعد کب 12 فروری آئی کب اس کا نکاح ہوا اسے کچھ علم نہیں تھا اور پھر بالآخر 14 فروری کو وہ جمال کی سیج پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورے کمرے کو سرخ گلابوں سے سجایا گیا تھا۔ بالکل دروازے کے سامنے سرخ گلابوں کے ساتھ شادی مبارک لکھا ہوا تھا۔ پورا کمرہ گلابوں کا گل دستہ بنا ہوا تھا۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے میں گم تھی جب جمال کمرے میں داخل ہوا۔ بے شک وہ دونوں کزن تھے لیکن سید فیملی سے ہونے کی وجہ سے نوشین نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا اور آج وہ اس کا شوہر بن چکا تھا۔

”منہ دکھائی نہیں لو گی نوشین؟“

اس کے نام کی طرح اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی۔ یہ نوشین کو آج پتا چلا تھا۔ وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا اور ایک بکس اس کی طرف بڑھا دیا پھر خود ہی اس نے اسے کھولا تو نوشین نے حیرت سے اپنی منہ دکھائی کو دیکھا بہت ہی مہنگا پین۔ اس نے حیرت سے جمال کو دیکھا تو وہ محبت سے بولا۔

”منہ دکھائی کچھ انوکھی نہیں ہے نوشین لیکن ایک رائٹر کی منہ دکھائی تو ایسی ہی ہوتی ہے نا تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ تم رائٹر ہو۔ تو نوشین بات کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دوست کو ڈائجسٹ پڑھنے کا بے حد شوق ہے تو میں نے اس کے گھر پر موجود ڈائجسٹ ایک دن بس یوں ہی اٹھا لیا تھا تب اس میں موجود تمہاری کہانی ادھوری خوشی پڑھی پھر پتا نہیں کیسے تمہاری لکھی ہر تحریر پڑھتا چلا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری کزن بھی رائٹر ہو سکتی ہے۔ میں نے امی سے کہا کہ مجھے تم سے ہی شادی کرنی ہے وہ بھی ویلنٹائن ڈے کے موقع پر میں تو بہت بولتا ہوں کچھ تم کہو۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

”آپ کو میرے رائٹر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”ظاہر سی بات ہے یار! اسی لیے تو یہ پین تمہیں منہ دکھائی میں دے رہا ہوں اور ہاں میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے کہ تم رسالے پڑھ سکتی ہو، کہانیاں بھی لکھ سکتی ہو اب خوش۔“ وہ اس کی بات پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”رائٹر ہونا بری بات نہیں ہے اور نا ہی رسالے پڑھنا یہ تو انسان کو زندگی جینا سکھاتے ہیں آپ کو بات کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ خیر اب میں رومینٹک ہو رہا ہوں اجازت ہے مادام۔“

وہ آخر میں شرارت سے بولا تو نوشین نے شرما کر سر جھکا لیا۔ یہ ویلنٹائن ڈے اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر خوشیاں لے کر آیا تھا۔

”ہیپی ویلنٹائن ڈے میرے دل کی ملکہ نوشین سید جمال۔“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ شرما کر رہ گئی۔

ہر انسان ایک سا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر کسی کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے اسے آج اس بات پر یقین ہو گیا تھا۔ یہ ویلنٹائن ڈے اس کی زندگی میں لاکھوں کروڑوں خوشیاں لے کر آیا تھا۔

......☆......



سونیا چوہدری

افسانہ

ویلنٹائن ڈے

اس نے کندھوں سے سرکتی ہوئی شال درست کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی نمی اور خنکی کا احساس اسے شدت سے چھو کر گزرا تھا۔ وہ ہاتھ میں موبائل



اور والٹ تھامے ایک گفٹ سینٹر میں داخل ہوئی۔

پوری دکان سرخ گلابوں اور ویلنٹائن ڈے کے کارڈز سے جگمگا رہی تھی۔ آبدار نے آگے بڑھ کر ایک خوبصورت ویلنٹائن ڈے کا کارڈ پکڑا اور اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کارڈ کے ساتھ اس نے ایک نفیس سی گھڑی خریدی اور رقم ادا کر کے قریبی ایک کافی بار میں چلی آئی۔ بھاپ اڑاتا کافی کا مگ سامنے میز پر پڑا تھا لیکن وہ اپنی ہی سوچوں میں گم مسکرا رہی تھی۔ سالار کے ساتھ یہ اس کا پہلا ویلنٹائن ڈے تھا جو وہ بہت جوش و خروش سے منانا چاہتی تھی اس کو آج شام کا بے صبری سے انتظار تھا کیونکہ اس نے سالار کے لیے بہت اچھا سرپرائز رکھا تھا جس کے لیے وہ بے چین ہو رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اب تک گم تھی۔ جب دفعتاً اس کے موبائل پر میسج ٹون کی آواز نے آبدار کو خیالوں سے واپس حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ اس نے میسج پڑھنے کے بعد کافی ختم کی اور بل ادا کرنے کے بعد سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆......☆

آبدار نے پورے کمرے کو سرخ گلابوں میں نہلا دیا تھا۔ بیڈ شیٹ، پردے، کشن کمرے کی ہر ایک چیز سرخی مائل تھی، کمرے کی لائٹز آف تھیں مگر کینڈل ریگو میں جلتی موم بتیاں کمرے کو بے حد دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ آبدار ریڈ کلر کی فراک میں ملبوس بلا کی حسین لگ رہی تھی، اس نے ایک نظر سامنے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سالار کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ آبدار نے کئی بار اس کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری جانب سے کوئی بھی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد یہ اس کا سالار کے ساتھ پہلا ویلنٹائن ڈے تھا۔ وہ جو آج کے دن کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی اب غصے میں بیٹھی خود کو کوسنے لگی۔

''ساری غلطی ہی میری تھی۔ میں ہی پاگل تھی جو اس کے لیے اتنا سج سنور کے بیٹھ گئی۔'' اس نے کانوں میں پہنے ریڈ جھمکے اتار کے ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ غصے میں خود کلامی کرتے ہوئے اس نے اپنی ساری جیولری اتار کر پھینک دی اور چینج کرنے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔ چند ثانیے بعد وہ چینج کر کے نکلی تو ایک بار پھر آس بھری نگاہ گھڑی پر ڈالے بنا نہ رہ سکی۔ اب اس کو اپنی اس دن کے انتظار کی بے صبری پر غصہ اور سالار کے اب تک نہ آنے پر بے بسی سے رونا آ رہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ جس پر سالار کے لیے خریدی گئی گھڑی، ویلنٹائن ڈے کارڈ کے ساتھ گلاب کے پھولوں کا خوب صورت بکے بھی موجود تھا۔ آبدار کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور وہ خاموشی سے لیٹ گئی تھی۔

''اب تک وہ کیوں نہیں آیا؟ میں نے اس کو بار ہا کہا تھا کہ آج جلدی آنا۔ کہیں وہ بھول تو نہیں گیا کہ آج 14 فروری ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے بہت خاص دن ہے، کہیں سالار مجھ سے ایک ہی سال میں تو نہیں اکتا گیا؟ اور کوئی اس کی زندگی میں......'' خیالات کی یورش اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھی وہ جو سارا دن خوشی سے ہواؤں میں اڑتی رہی تھی۔ اب عجیب سی گھٹن کا شکار ہو رہی تھی۔ غصہ اور مایوسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ بنا آواز کے آنسو بہاتے سوچتے سوچتے نیند نے اس کو کب اپنی آغوش میں لیا اس کو خبر ہی نہ ہو سکی اور اس کو ویلنٹائن ڈے یوں رو کر تنہا ہی گزارنا پڑا تھا۔

☆......☆

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ آبدار نے ایک نظر اپنے پیچھے سوئے سالار پر ڈالی، رات کو وہ کب لوٹا تھا اس کو خبر نہیں تھی، اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتی ہوئی وہ بیڈ سے اتری اور فریش ہو کر کچن میں چلی آئی۔ رات کی وجہ سے اس کا موڈ اب تک آف تھا۔ وہ مگ میں اپنے لیے کافی ڈال رہی تھی جب عقب میں سالار کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

''میرے لیے بھی ایک کپ کافی بنا دو۔'' آبدار کی نظریں اب تک اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ سالار کے چہرے پر شرمندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بالکل نارمل لہجے میں کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور آبدار اس کے اس انداز پر مزید جل کر رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ رات دیر سے آنے پر معافی مانگے گا۔ اسے دیر سے ہی سہی مگر ویلنٹائن ڈے وش کرے گا لیکن اس کی سوچ ایک بار پھر غلط ثابت ہوئی تھی۔ سالار نے نہ تو سوری کہا تھا اور نہ ہی اس کو وش کیا تھا اور وہ غصے میں سالار کے لیے کافی بنائے بنا ہی کچن سے نکل گئی تھی۔

☆......☆

معمول کے مطابق وہ تیار ہو کر ناشتے سے فراغت کے بعد وہ آفس چلا گیا تھا، جانے سے پہلے بھی اس نے آبدار سے کوئی خاص گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ اس کے آگے پیچھے گھومتی رہی تھی کہ شاید اب وہ سوری بول دے گا۔

''مجھے کوئی سرپرائز گفٹ دے کر وش کرے گا اور مجھے منا لے گا۔'' مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

''کتنا لاپرواہ شخص ہے۔ بیوی کی ناراضی کی کوئی فکر ہی نہیں۔'' رات کو کمرے میں سجائے گلابوں کو اس نے تہس نہس کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

''میں بھی آج کے بعد کبھی اس کی فکر نہیں کروں گی۔ نہ کبھی یوں پاگلوں کی طرح اس کی محبت میں کمرے کو سجاتی پھروں گی۔ اس کو صرف اپنے کام سے محبت ہے مجھ سے نہیں۔'' خود کلامی کرتے کرتے وہ پھر آنسو بہانے لگی تھی۔

☆......☆

وہ سالار کو بغیر اطلاع دیئے اپنی امی کی طرف چلی آئی تھی۔ آبدار بچپن ہی سے ایسی تھی سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن کوئی اس کو اگنور کرے یہ وہ ہرگز برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

''ویلنٹائن ڈے تو محبت کرنے والوں کا دن ہوتا ہے۔ پھر اس دن سالار نے کیوں مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ آگے پیچھے تو بہت دعوے کرتا تھا اور جس دن موقع تھا محبت کا یقین دلانے کا اس دن اس نے خود میری محبت کو بھی اگنور کر دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے کتنا دکھ ہو گا۔'' اپنے کمرے میں بیٹھی وہ گم صم سے انداز میں اسی کو سوچ رہی تھی جب کمرے میں امی اس کے اور اپنے لیے چائے لے کر چلی آئیں۔ انہوں نے چائے والی ڈش ٹیبل پر رکھ دی اور خود اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

''آبی بیٹا! سالار شام کو آئے گا یا تم اکیلی چلی جاؤ گی؟'' انہوں نے محبت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

''جناب کو اپنے کاموں سے فرصت ملے گی تو آئیں گے نا، اس کو تو آج کل اتنی بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس کی ایک عدد بیوی بھی ہے۔'' آبدار کے انداز میں شکایت تھی۔

اس کی ماں نے بغور آبدار کے چہرے کو دیکھا اور پھر تفکر بھرے لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

''سالار سے جھگڑا ہوا ہے؟''

"جھگڑا ہی تو نہیں ہوا امی!" آبدار نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا تھا۔

"تو پھر اس طرح کیوں بول رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی، کچھ بھی نہیں ہوا آپ فکر مند نہ ہوں اور میں شام کو خود ہی چلی جاؤں گی۔ گاڑی میرے پاس ہی ہے۔" آبدار نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی امی سے بے حد محبت کرتی تھی اور اپنی وجہ سے انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ان سے بنا کچھ ڈسکس کیے اس نے بخوبی بات کا رخ بدل ڈالا تھا اور ان کے ساتھ چائے پینے میں مصروف ہوگئی تھی۔

☆......☆

شام کو واپسی پر وہ مارکیٹ چلی آئی تھی۔ گھر جانے کا اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے لیے چند ضرورت کی اشیاء خریدنے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آن بیٹھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اپنے موبائل پر ڈالی۔

"پورے دن میں ایک میسج بھی نہیں ہو سکا۔ کیا اس قدر وہ مصروف ہو چکا ہے۔" سوچتے ہوئے بے دلی سے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔

☆......☆

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو چار سو اندھیرا بکھرا ہوا تھا، شاید بجلی نہیں تھی۔ موبائل کی روشنی سے وہ کچن تک آئی اور ماچس لے کر موم بتی جلانے لگی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور وہ آج بھی اب تک نہیں آیا تھا۔ کینڈل تھامے وہ لاؤنج میں چلی آئی۔ ٹیبل پر کینڈل ریک رکھتے ہوئے آبدار کی نظر ایک گلابی رنگ کے لفافے پر پڑی جس کے ساتھ ایک خوب صورت سی گلاب کی کلی بھی موجود تھی۔ آبدار نے جلدی سے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

"سوری۔" کاغذ پر صرف سوری لکھا تھا۔ آبدار نے کارڈ واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور کلی پکڑنے ہی لگی تو لائٹ آگئی۔

وہ آ چکا تھا۔ آبدار نے دھڑکتے دل سے سوچا اور اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے میں لیمپ کی مدھم زرد روشنی اس کو کمرے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ گلابوں سے آراستہ کمرہ بے حد دلفریب لگ رہا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں سرخ اور سفید رنگ کے پھولوں کے گلدستے پڑے تھے۔ وہ قدم قدم چلتی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک آئی جہاں چھوٹی سی ڈبی ایک اور کلی کے ساتھ موجود تھی۔ آبدار نے ڈبی کھول کر دیکھی تو اندر ایک خوب صورت سی رنگ جگمگا رہی تھی۔

"آبدار!" اسے اپنے عقب میں سالار کی آواز سنائی دی۔

آبدار نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اسی کو مسکراتا دیکھ رہا تھا۔

"اب یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم جاؤ کرو اپنا کام مجھ پر کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔" آبدار نے خفگی سے کہا۔

"کل میں نے کتنا انتظار کیا تمہارا، تمہیں کئی بار کالز بھی کیں لیکن تم نے کوئی جواب نہیں دیا، تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانا چاہتی تھی لیکن تم نہ جانے کس دنیا میں مگن تھے۔" وہ جانتا تھا کہ آبدار اس سے ناراض ہے اس لیے خاموشی سے اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"تمہیں میرا اور میری محبت کا کوئی احساس نہیں۔ تم سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہو۔ بس اپنے جذبوں کی قدر کرنے والے، دوسرا کیا سوچتا ہے کیا چاہتا ہے اس سے تم لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولتی بولتی روہانسی ہوگئی تھی۔

"سوری آبدار! پلیز اب اتنا غصہ مت کرو۔" سالار نے آبی کو شانوں سے تھامتے ہوئے محبت سے کہا تو اس نے ایک جھٹکے میں سالار کو خود سے الگ کیا۔

"دور رہو مجھ سے۔ اب سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے دل توڑتے ہو اور پھر چھوٹا سا لفظ سوری بول کر معافی طلب کرتے ہو۔" اس نے نم آنکھوں سے سالار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آبدار! میں نے کبھی تمہارا دل نہیں توڑنا چاہا نہ ہی کبھی تمہیں کوئی تکلیف دینے کا سوچا ہے۔ مجھے تمہارا اور تمہاری محبت کا احساس ہے اور میں تمہاری محبت کی دل سے قدر بھی کرتا ہوں۔"

"وہ تو میں جان ہی چکی ہوں جتنی قدر کرتے ہو۔" آبدار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آبی یار! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، میں تو تمہیں صرف یہ احساس کروانا چاہتا تھا ہماری محبت ویلنٹائن ڈے کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی ہم مسلمانوں کا اس دن سے کوئی واسطہ ہے۔ کسی بھی قوم کے تہوار ان کی پہچان ہوتے ہیں اور ان کے دین سے مطابقت رکھتے ہیں اور ہمارا اسلام ایک مکمل طرز زندگی کا نام ہے۔ ہم مسلمانوں کی اپنی مذہبی روایات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔" (آل عمران:85)۔ یوں امت مسلمہ کا ہر شخص ان روایات کا امین اور ان کی پاسداری کرنے کا ذمہ دار ہے جب کہ ویلنٹائن ڈے کے بارے میں ملنے والی انفارمیشن سے اس کا اسلامی تعلیمات اور روح کے منافی ہونا ہے۔" آبدار خاموش ہو چکی تھی۔ وہ مدھم لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

یہ تہوار محبت کو زوجیت کے دائرے سے باہر نکال کر عشق و عاشقی کے غیر فطری دائرے میں داخل کرتا ہے جس سے بے حیائی اور فحاشی بڑھتی جا رہی ہے۔ ویلنٹائن ڈے اظہارِ محبت کا دن مانا جاتا ہے لوگ سوچتے ہیں اگر ایک دن اپنی محبتوں کا اظہار کر لیں گے تو اس میں کیا قباحت ہے لیکن ذرا تم خود سوچو آبدار کہ کیا صرف ایک دن کے اظہار سے حقیقی مقاصد حاصل ہوتے ہیں؟ کیا اس دن اظہارِ محبت کرنے والے سچی محبت حاصل کر پاتے ہیں؟ یا پھر آئندہ آنے والے ویلنٹائن ڈے پر وہ ایک نئے ساتھی سے یہی اظہار کر رہے ہوں گے۔ یہ سب صرف نفس کو وقتی تسکین دینے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح ایک دن منانے سے برائی اور بے حیائی کو تو فروغ مل سکتا ہے مگر سچی محبت کو نہیں۔

محبت کا حقیقی اظہار تو عمل سے ہوتا ہے۔ اللہ کے ساتھ محبت ایمان کا مطالبہ کرتی ہے۔ آپؐ کے ساتھ ہماری محبت اطاعت سے پتا چلتی ہے۔ والدین سے کی جانے والی محبت ان کی خدمت میں جانی جاتی ہے۔ اولاد سے محبت ان کی اعلیٰ تربیت سے نظر آتی ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ دو لوگوں کے درمیان محبت صرف ایک دن کے اظہار سے قائم ہو جائے۔" وہ چند ثانیے سانس لینے کو ٹھہرا تھا اور پھر سے آبدار سے مخاطب ہوا۔

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم مسلمان ہو کر کتنی جلدی غیر مذہبی تہوار اپنا لیتے ہیں مگر کبھی تم نے کسی غیر مسلمان کو ہمارا کوئی تہوار منانے یا اس میں شریک ہوتے دیکھا ہے؟" اس کے سوال پر آبدار کی نظریں جھک گئیں۔

"یہ سب ہمارے ایمان کی کمزوری ہے آبدار کہ ہم وہ سب جلدی سے اپنا لیتے ہیں جس سے ہمیں ہمارا اللہ اور ہمارے نبی منع فرماتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کا تو اب یہ حال ہے کہ اگر ہم اپنے نبی کی شان میں کوئی میلاد منعقد کر لیں تو دوسرے فرقے کے لوگ آ کر حوالے مانگنے لگتے ہیں کہ بتائیں میلاد کا حکم کہاں دیا گیا ہے۔ اگر ہمیں نبی کی شان میں سجائی جانے والی محفل کا حوالہ دینا ہے تو پھر ویلنٹائن ڈے، ہیپی کرسمس ڈے جیسے دنوں پر ان مسلمانوں کی زبانوں کو تالے کیوں لگ جاتے ہیں؟ کیوں ان کو پھر حوالے احادیث کا خیال نہیں رہتا۔ تم خود بتاؤ آبدار کیا سچے مسلمان ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نبی کی تعریف بیان کرنے پر حوالے مانگیں اور غیر مذہبی تہواروں کو منانے میں خاموش تماشائی بنے بے حیائی پھیلتی دیکھتے رہیں۔" آبدار کے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ اب تک نظریں جھکائے کھڑی خاموشی سے سالار کو سن رہی تھی۔

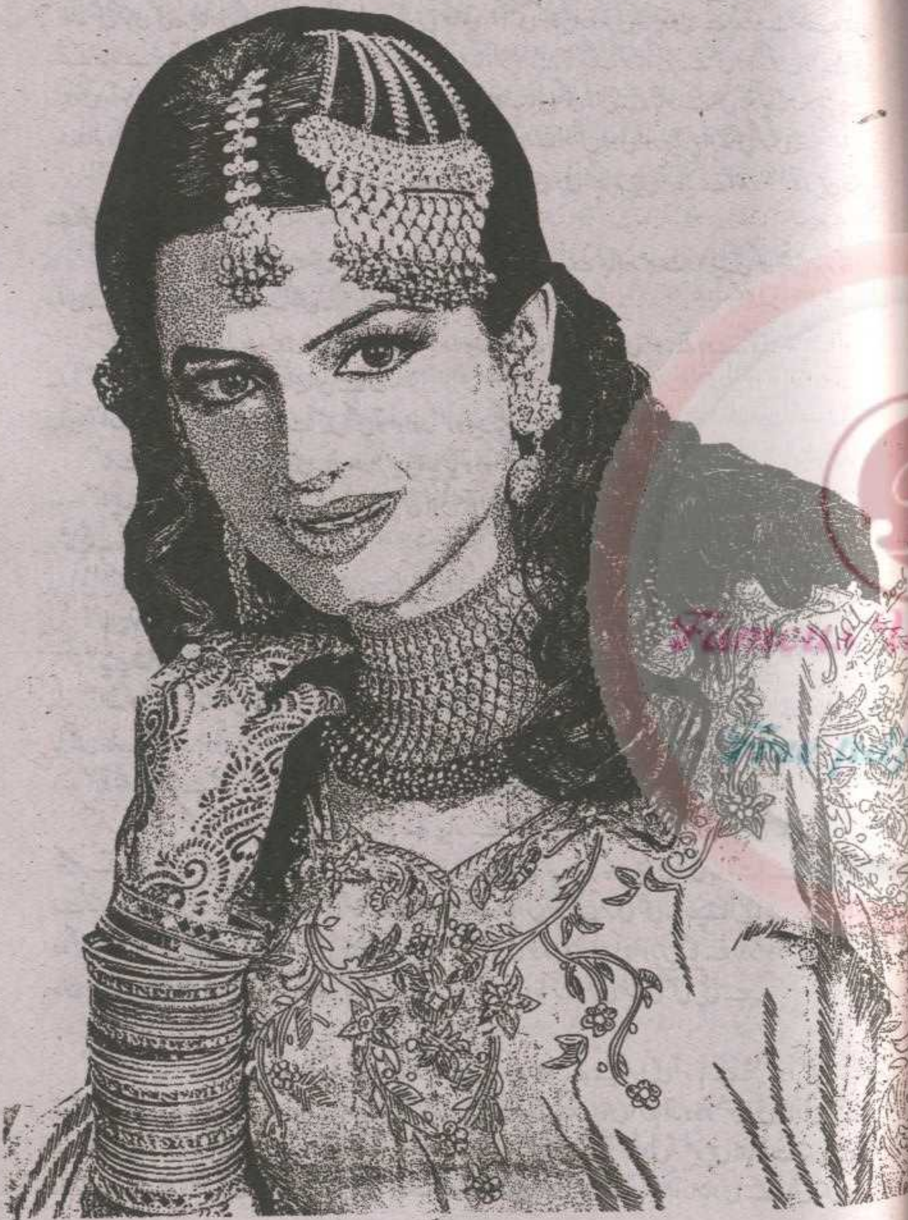
"کل رات نہ تو میں آفس کے کسی کام میں مصروف تھا اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ تھا۔ میں صرف اسی لیے دیر سے آیا تھا کہ جلدی آ کر کل تمہیں یوں سمجھا نہ پاتا اور تمہارے محبت سے کیے گئے اہتمام پر تمہیں سمجھانے کے بجائے خود بھی مجبوراً سیلیبریشن میں شریک ہو جاتا لیکن میں تمہیں احساس کروانا چاہتا تھا۔ تمہیں یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ ہماری پاکیزہ محبت کسی بھی غیر مذہبی تہوار کی محتاج نہیں ہے۔

"میں کل محض تمہیں خوش کرنے کے لیے اللہ پاک کو ہرگز ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو کسی کے بھی راضی ہو جانے سے سکون نہیں ملتا لیکن اب بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے تو مجھے معاف کر دو اور جو سزا دینا چاہو دے لو۔ میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔" سالار نے ذرا سا جھک کر اپنا سر خم کرتے ہوئے کہا تو آبدار کی آنکھ سے آنسو کا موتی ٹوٹ کر زمین بوس ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی اس کے روبرو آن کھڑی ہوئی۔

"سالار! مجھے معاف کر دو، میں نے تمہیں غلط سمجھا اور غصے میں نہ جانے کیا کچھ بول گئی۔ میں سمجھی تھی تم مجھ سے بور ہو گئے ہو اور اب مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اسی لیے مجھے ویلنٹائن ڈے بھی وش کرنا ضروری نہیں سمجھا مگر میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوں، پلیز مجھے معاف کر دو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد کبھی کوئی غیر مذہبی تہوار نہیں مناؤں گی اور میں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ ہماری محبت واقعی ہی کسی ایک دن کی محتاج نہیں۔ ہماری محبت کا تو ہر دن بہت خاص ہے۔ جیسے رات کے بعد ہر نئی صبح بہت اہم ہوتی ہے۔" آبدار نے سالار کے سینے پر سر ٹکاتے ہوئے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا تو سالار نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کی ہائی کلاس سوسائٹی کی ماڈرن وائف کو وہ باآسانی سب کچھ سمجھا سکا تھا۔

کمرے میں مہکتی گلاب کی پتیوں کی مہک اب دونوں کی زندگیوں کو بھی مہکانے لگی تھیں۔

☆......☆



عنادل تمہاری ہوئی دل سے

ایس حبیب خان

مکمل ناول

''آپا جانی! میں بازار جارہی ہوں اگر کوئی کام ہے تو بتادیجیے۔'' تہمینہ بیگم نے اپنی بڑی بہن اور رشتے میں لگنے والی جٹھانی روبینہ بیگم سے کہا۔

''کام...... ہاں یاد آیا، تمہارے بھائی صاحب کے سوٹ ڈرائی کلین ہونے گئے تھے وہ لیتی آنا۔'' روبینہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر دراز سے رسید نکال تہمینہ کو تھمادی۔

محمود حسن، ریاض حسن اور احمد حسن تینوں بھائی تھے اور ان تینوں سے بڑی ان کی بہن تھیں، جنہیں سب منیبہ آپا کہتے تھے۔ بھائیوں میں سب سے بڑے محمود حسن، منجھلے ریاض حسن اور سب سے چھوٹے احمد حسن تھے۔ محمود حسن اور ریاض کی شادیاں خالہ زاد اور چچازاد بہنوں روبینہ اور تہمینہ سے ہوئی تھیں جب کہ احمد حسن نے اپنی مرضی سے شادی خاندان سے باہر کی تھی۔ ان کی بیگم نورین بھی کافی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ تینوں بھائی ایک ساتھ ہزار گز رقبے پر محیط بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ محمود حسن کے دو بچے تھے۔ شاہ زیب اور بیٹی شہلا، منجھلے بھائی ریاض حسن کے تین بچے تھے۔ اقرار، احمر اور ارسلہ جب کہ احمد حسن کی صرف ایک ہی اولاد تھی ان کی لاڈلی عنادل۔ شہلا کی شادی اس کے چچا ریاض حسن کے بیٹے اقرار سے ہوچکی تھی۔ جب کہ شاہ زیب سی ایس ایس کر کے سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جوائن کرتے ہی اس کی پوسٹنگ اسلام آباد ہوگئی تھی۔ عنادل، احمر اور ارسلہ اے لیولز کے اسٹوڈنٹس تھے۔ جب کہ منیبہ آپا راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی مگر پھر بھی انہوں نے بھائی کے گھر آنے کے بجائے شوہر کے گھر رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ اس گھر میں ان کے شوہر کی یادیں بسیں ہوئی تھیں۔

تہمینہ بازار سے آکر صوفے پر نیم دراز ہوگئیں۔

''کیا ہوا بھابی؟'' نورین بیگم نے انہیں اس طرح دیکھ کر سوال کیا۔

''بھئی! خدا کی پناہ اتنی گرمی تھی کہ میرے سر میں درد ہونے لگا۔''

''اچھا آپ اپنے کمرے میں جائیں میں آپ کے لیے جوس بھجواتی ہوں۔'' نورین نے کہا۔

''اچھا آپ جاتے ہوئے ذرا یہ آپا کو دے دیں گی؟'' انہوں نے ہینگ ہوئے سوٹ نورین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں بھابی!'' نورین بیگم نے سوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر نورین بیگم نے روبینہ آپا کے کپڑے ان کے حوالے کردیئے۔

''نورین! یہ عنادل کہاں ہے؟ نظر نہیں آئی کافی دیر سے؟'' روبینہ بیگم نے سوال کیا۔

''بھابی! ہوگی کہاں، کہیں بندر بنی دھما چوکڑی مچارکھی ہوگی۔'' نورین بیگم بولیں۔ تو روبینہ بیگم مسکرادیں۔

''ارے بھئی بچی ہے، یہ ہی تو دن ہے اس کے کھیلنے کودنے کے۔'' روبینہ بیگم نے بیڈ پر پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھابی! مگر کھیل کھیلے بھی تو لڑکیوں والے۔'' نورین بیگم نے بیٹھتے ہوئے کہا اور ان کی بات غلط بھی نہیں تھی۔ عنادل تھی بالکل اپنے نام کی طرح چہکتی، اچھلتی کودتی دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف، اس کے سارے شوق لڑکوں والے تھے ٹینس کھیلنا، گٹار پلے کرنا، کزنز سے فائٹنگ کرنا، کپڑے بھی وہ لڑکوں والے ہی پہنتی، آج تک اس نے لڑکیوں والا کوئی بھی فیشن نہیں کیا تھا۔ بال بھی اس کے چھوٹے ہی ہوتے۔ دھڑ سے دروازہ کھلا تو روبینہ اور نورین دونوں چونک گئیں۔ عنادل ایک دم اندر داخل ہوئی اور بیڈ پر اوندھی گر گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے عنادل! دروازہ ناک کر کے اندر آتے ہیں کوئی مینرز ہیں تمہارے اندر؟'' نورین بیگم برہمی سے بولیں۔

''امی! پلیز اس وقت کچھ نہ بولیں۔ میرا موڈ آف ہے۔'' عنادل نے کہا اور جھٹ روبینہ کی گود میں سر رکھ کر ان کے جسم کے گرد بانہیں لپیٹ لیں۔

''کیا ہوا میری عنادل کو، کیوں موڈ آف ہے؟'' روبینہ بیگم نے اس کو گود میں سموتے ہوئے کہا۔

''بڑی امی! احمر کا بچہ اتنا بے ایمان ہے کہ......''

''ارے بھئی احمر کا بچہ کہاں ہے ہمیں بھی تو ملواؤ۔'' روبینہ بیگم نے اسے چھیڑا۔

''ناٹ فیئر! بڑی امی۔'' عنادل نے منہ مزید چھپا لیا تو وہ مسکرا دیں۔

''اچھا اٹھو! یہ دیکھو میں تمہارے لیے ڈریس لائی ہوں پرسوں انعم کی منگنی پر پہن لینا۔'' نورین بیگم نے شاپنگ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''فیمیل ڈریس؟'' عنادل نے منہ اندر کیے وہیں سے پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا ہوگا۔ تم لڑکی ہی ہو ناں تو ڈریس بھی لڑکیوں والا ہوگا۔'' نورین بیگم بولیں۔

''پیسے ضائع کیے ہیں آپ نے، ہاں اگر ڈینم یا برانڈڈ شرٹ لاتیں تو ٹھیک تھا۔'' عنادل نے کہا۔

''اللہ کو مانو لڑکی! منگنی میں ایسے کپڑے پہن کر جاؤ گی اپنا نہیں تو ہماری عزت کا خیال کر لو، سارا خاندان باتیں بنائے گا۔ حد ہوتی ہے ہر چیز کی۔'' نورین بیگم بولیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے میں نہیں جاؤں گی آپ انعم سے معذرت کر لیجیے گا اور خالہ امی سے بھی۔''

''ارے بس بھی کرو نورین۔'' روبینہ بیگم نے پیار سے عنادل کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ نورین بیگم سر ہلا کر رہ گئیں۔ عنادل جو ایک دفعہ کہہ دیتی پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس بات سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ ہاں بڑے ابو یعنی محمود حسن کی کوئی بات عنادل رد نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماں باپ سے زیادہ وہ محمود حسن اور روبینہ بیگم کے قریب تھی کسی کو کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ عنادل کی سورس لگاتے اور محمود حسن جھٹ مان جاتے اور اس مرتبہ بھی عنادل نے منگنی میں نہ جا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی ضد کی کتنی پکی ہے۔

☆......☆

''بھئی آپ سب لوگوں کے لیے گڈ نیوز ہے کہ شاہ زیب کچھ روز کے لیے کراچی آ رہا ہے۔'' محمود حسن نے ناشتے کی میز پر سب کو بتایا تو سب خوش ہو گئے۔ شاہ زیب پانچ سال بعد واپس آ رہا تھا وہ تو شہلا کی شادی پر بھی نہ آ سکا تھا کیونکہ وہ ٹریننگ کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ جب شاہ زیب گیا تھا تو عنادل آٹھویں جماعت میں تھی۔ وہ شاہ زیب سے بالکل بھی بات نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ بہت ڈسپلن اور بڑھا کو بندہ تھا اور عنادل کے خیال میں وہ

ایک بور پرسنالٹی کا مالک تھا ہاں احمر اور ارسلہ سے اس کی پکی یاری تھی۔ شاہ زیب کی بہن شہلا بھی لیے دیے رہتی تھی۔ عنادل کی اس سے بھی دوستی نہیں تھی۔

''السلام علیکم بابا! خیریت کیسے فون کیا؟'' شاہ زیب، محمود حسن کی کال پر پریشان ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا اچانک اس طرح فون کرنے کی کوئی تو وجہ ہو گی ورنہ شام کو تو ہی اس نے بات کی تھی۔

''ہاں بیٹا! سب خیریت ہے، دراصل مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ تمہارے کراچی آنے سے قبل یہ بات کروں تا کہ تم ذہن بنا کر آؤ۔'' محمود حسن نے کہا۔

''جی بابا کہیے!'' شاہ زیب نے کہا۔

''بیٹا ہم بڑوں نے عنادل کو تم سے منسوب کر دیا تھا مگر ہم نے تم لوگوں کو بتایا اس لیے نہیں کہ بچوں کے ذہن پر جانے کیا اثر ہو اب جب کہ تم دونوں بڑے ہو گئے ہو تو ہم نے اور عنادل کے ماں باپ نے اپنے اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم یہاں آ جاؤ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو ہمیں بتا دینا۔'' محمود حسن نے اپنی منشا بیان کی۔

''جی بہتر بابا!'' شاہ زیب نے فرمانبرداری سے کہا اور فون رکھ دیا۔ اس نے محمود حسن پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں، بابا نے تو اس کے دل کے اندر دبی بات جانے کیسے جان لی تھی۔ وہ اس کی محبت کو اس کے حوالے کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اس کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔

''آئی لو یو بابا۔'' اس نے نعرہ لگایا۔ شاہ زیب کے دل کو عنادل نے اس وقت گرفت میں لے لیا تھا۔ جب وہ دونوں بچپن کی حدوں سے آگے نکلنے لگے تھے۔ عنادل بے حد گوری رنگت کے ساتھ جب دھوپ میں کھیل کر آتی تو اس کے گال سیب کی مانند سرخ ہو جاتے۔ جانے شاہ زیب کو وہ کیوں بہت پیاری لگتی اور جب وہ کوئی سوال کر کے ہرنی جیسی آنکھوں کو جھکاتی جنہیں گھنیری پلکوں نے ڈھانپ رکھا ہوتا تو شاہ زیب کا دل دھڑکنا بھول جاتا۔ اس وقت اسے اس کیفیت کا نام نہیں معلوم تھا اور نہ ہی اس نے کسی پر کبھی ظاہر ہونے دیا مگر آج بابا نے تو اس کی مشکل ہی آسان کر دی۔ اس کی محبت کو اظہار کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ محمود حسن نے عنادل کو پہلے ہی اس کے لیے مانگ لیا تھا۔ شاہ زیب بستر پر کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ جلد کراچی جائے اور اپنی محبت کا دیدار کرے۔ ان پانچ سالوں میں تو وہ مزید خوب صورت ہو گئی ہو گی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کو نیند نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

☆......☆

شاہ زیب فلائٹ پر سوار ہو کر سوچنے لگا۔ سرپرائز ملتے ہی سب کتنا خوش ہو جائیں گے کیونکہ اس نے اپنی فلائٹ کا وقت نہیں بتایا تھا۔ وہ جب گھر آیا تو اسے کوئی نظر نہ آیا وہ سیدھا امی کے روم میں گیا۔ روبینہ بیگم لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ارسلہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ شاہ زیب کو شرارت سوجھی تو وہ دبے قدموں ارسلہ کی طرف گیا۔ اس نے روبینہ بیگم کو اشارے سے منع کر دیا۔ پھر شاہ زیب نے ارسلہ کے ہاتھ سے ریسیور چھینا اور اس میں بولا۔

''بی بی! ارسلہ آپ سے بعد میں بات کریں گی۔'' اور فون رکھ دیا۔

''یہ کیا حرکت ہے شاہ زیب بھائی؟'' ارسلہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا حکمت ہے۔'' شاہ زیب نے ہلکی سی چپت ارسلہ کے سر پر لگائی پھر مزید بولا۔

''اپنے بھائی کو فون کرنے میں تو تمہارے ہاتھوں میں مہندی لگ جاتی ہے، دوستوں سے گپیں مارتے نہیں تھکتیں۔ کبھی کہوں گھر کا اتنا لمبا بل کیوں آتا ہے؟ تو وہ تم ہو۔'' شاہ زیب نے اس کے بال بھی کھینچے۔

''تائی امی! دیکھیں ناں بھائی کو۔'' ارسلہ کا بس نہ چلا تو اس نے روبینہ بیگم کی حمایت سمیٹی۔

''شاہ زیب بیٹا! بری بات ہے کیوں ستا رہے ہو بہن کو۔'' انہوں نے مصنوعی غصے سے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہ زیب نے کھینچ کر ارسلہ کو گلے سے لگالیا۔

''میری پیاری گڑیا!'' اور ارسلہ نے بھی اس کے گرد بانہیں لپیٹ لیں سب کو شاہ زیب کے اچانک آجانے کی خبر ملی تو سب آگئے مگر عنادل اپنے کمرے میں ہی رہی۔ کھانا لگ گیا ان کی ملازمہ انابی بلانے آئیں تو عنادل نے آنے سے صاف منع کردیا اور بولی۔

''اس وقت اگر زلزلہ بھی آجائے تو میں یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔ آپ ایسا کریں میرا کھانا یہیں لے آئیے۔'' سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے مگر شاہ زیب کی نگاہیں اس حسین پیکر کی متلاشی تھیں مگر انابی نے آکر اس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔

''عنادل بٹیا نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوایا ہے۔''

''اوہ شٹ!'' احمر نے زور سے کہا۔

''احمر!'' محمود حسن نے اسے تنبیہہ کی۔

''سوری! بڑے ابو آج فٹ بال ورلڈ کپ فائنل ہے۔'' احمر نے کہا۔

''تو بیٹھے کیوں ہو یہاں جاؤ۔'' ارسلہ نے جل کر کہا۔

''اف یو گائز ڈونٹ مائنڈ میں عنادل کے ساتھ کھانا کھالوں؟'' احمر نے بڑوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا جاؤ۔'' احمد حسن نے بولا۔ تو احمر جلدی سے اٹھ گیا۔

''انابی میرا کھانا بھی وہیں لے آئیے گا پلیز۔'' اور عنادل کے روم کی طرف چلا گیا۔

''عنادل ''میسی'' کا میچ چھوڑ دے امپاسبل۔'' ارسلہ نے کہا اور نوالہ منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہوگیا۔

''اتنے سالوں بعد آیا ہوں اور محترمہ کو ملنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔'' وہ سوچتے ہوئے چمچے سے چاولوں کو پلیٹ میں ادھر ادھر کررہا تھا۔

''بیٹا کھانا پسند نہیں آیا؟'' ریاض حسن نے پوچھا۔

''نہیں چچا جان۔ وہ بس بھوک نہیں ہے تھکن ہورہی ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور دو چار لقمے لے کر اپنے کمرے میں لائٹ آف کرکے سوگیا۔

☆......☆

ناشتے کی میز پر سب آگئے تھے۔ سب سے آخر میں وہ آئی۔ ٹائٹ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں وہ بھی بغیر دوپٹے کے چھوٹے چھوٹے بال وہ میز پر آکر دھپ سر رکھ کر اونگھنے لگی۔ شاہ زیب دھک سے رہ گیا۔ اس نے جو تصور میں اپنی محبت کے سراپے کو تراشا تھا وہ کانچ پر لگنے والی کاری ضرب کی مانند چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

''یہ عنادل ہے؟ وہ ہی جس سے میں نے پیار کیا تھا؟''

''کب سوئے تم دونوں؟'' تہمینہ تائی نے پوچھا۔

''ساڑھے چار بج گئے تھے۔ میچ کے بعد ایوارڈ سیرمنی بھی تھی نا۔'' عنادل نے بوجھل انداز سے کہا۔ شاہ زیب کی نگاہیں اسی کا طواف کررہی تھیں۔

''لگتا ہے اس میچ میں میسی کوئی گول نہ کرسکا۔ کیوں عنادل؟'' محمود حسن نے عنادل کی نیند بھگانے کے لیے کہا۔

''بڑے ابو! اٹس امپاسیبل۔'' عنادل کو ایکدم کرنٹ لگا ہو مانو۔

''اب ہوئی ہے میرے بیٹے کی مارننگ۔'' محمود حسن نے عنادل کو چھیڑا تو وہ مسکرانے لگی اور اس کے سبب جیسے گالوں میں بھنور پڑ گئے۔ شاہ زیب لمحہ بھر کو اس کی مسکراہٹ میں کھو گیا۔

''بیٹا شاہ زیب! تم ناشتہ شروع کرو، رات بھی تم نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔'' روبینہ بیگم نے اس کی پلیٹ میں پراٹھا رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز پر بھی عنادل شاہ زیب کو ٹوٹلی اگنور کرکے اپنی پلیٹ میں سے آملیٹ کانٹے سے اٹھا کر منہ میں رکھنے لگی۔

شاہ زیب سب کے لیے گفٹس لایا تھا مگر اس نے عنادل کو کچھ نہ دیا۔

''بھائی آپ عنادل کے لیے کچھ نہیں لائے؟'' ارسلہ نے پوچھا۔

''سوری ڈیئر! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان میں لڑکیوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لیے ان کو میرا گفٹ بیکار لگے گا سو میں نے نہیں دیا۔'' شاہ زیب نے سیڑھیاں اترتی عنادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھینکس! میں ہر کسی سے چیز لینا پسند نہیں کرتی، صرف اپنے قریب کے لوگوں سے تعلق رکھتی ہوں۔'' عنادل نے منہ توڑ کر شاہ زیب کو جواب دیا اتنے میں عنادل کا موبائل بجا۔

''ہاں! حارث شام کو چل رہے ہو ناں۔'' عنادل بات کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اس نے شاہ زیب کے تاثرات دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی۔

''ارسلہ! یہ حارث کون ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''بھائی! عنادل کا کلاس فیلو ہے۔'' ارسلہ نے کہا اور چلی گئی شاہ زیب غصے سے انگلیاں چٹخانے لگا۔

''عنادل! لو آئی نے بھیجے ہیں۔'' ارسلہ نے فرنچ فرائز اور سوفٹ ڈرنک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ عنادل اپنی کرسی پر نیچی ہوکر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ٹائٹ جینز میں اس کے پیر نمایاں ہورہے تھے۔ سامنے سے آتی شہلا کو عنادل کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔ وہ ارسلہ اور عنادل کے پاس آگئی۔ عنادل نے وہیں سے جھک کر پلیٹ اٹھائی اور گود میں رکھ کر فرنچ فرائز کھانے لگی۔

''کبھی کچن کی شکل بھی دیکھ لیا کرو عنادل۔'' شہلا نے کہا۔

''مجھ سے نہیں ہوتے یہ لڑکیوں والے کام۔'' عنادل نے گلاس میں سے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''شادی کے بعد اگر میاں کے ساتھ اکیلے گھر میں رہنا پڑ گیا تو کیا کھلاؤ گی اپنے آپ کو اور اپنے میاں کو؟'' شہلا نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ عنادل کو الجھن ہونے لگی اس نے گردن جھٹکی اور ہینڈ فری لگا کر موبائل میں گم ہوگئی۔

☆......☆

''عنادل بیٹھو!'' نورین بیگم نے اس کے کمرے میں آکر کہا جہاں عنادل کھڑی اسکرین پر چینل چینج کررہی تھی۔

''جی کہیں امی! میں سن رہی ہوں۔'' عنادل کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں اب میوزک چینل پر راک شو آ گیا تھا۔ نورین بیگم نے اٹھ کر اسے آف کر دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔

''عنادل! اپنے جینے کے ڈھنگ بدلو اور لڑکیوں والا انداز طور طریقے اپناؤ۔'' نورین بیگم بولیں۔

''بس امی! کیا پھر کوئی شادی کی تقریب آ رہی ہے؟'' عنادل نے لاپروائی سے کہا۔

''ہاں! اور اس بار تقریب ہو گی تمہاری شاای کی۔''

نورین بیگم نے کہا تو عنادل اچھل پڑی۔

''آر یو ان یور سینس؟'' وہ بے اختیار بولی۔

''عنادل! اپنی حد میں رہو۔'' نورین بیگم بھڑک گئیں۔

''نہیں! مجھے آپ یہ بتائیں کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی تو پھر آپ یہ بات کیوں کر رہی ہیں؟'' عنادل نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''یہ فیصلہ آج نہیں برسوں پہلے ہو چکا ہے۔ ہم بڑوں نے بچپن میں ہی تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ طے کر دیا تھا۔'' نورین بیگم نے بتایا۔

''اوہ کم آن امی! پہلی بات کہ میں شادی نہیں کروں گی اور دوسری اس سڑیل شاہ زیب سے تو کسی صورت نہیں۔'' عنادل نے صاف کہا۔

''بس بہت ہو گئی تمہاری من مانی! بدلو اپنے انداز کو۔'' نورین بیگم نے کہا اور روم سے چلی گئیں۔ عنادل نے زور سے ریموٹ کو صوفے پر پھینک دیا اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

''شاہ زیب! تم ہوتے کون ہو میری زندگی کے مالک بننے والے؟ یہ میری زندگی ہے صرف میری۔'' عنادل غصے سے بڑبڑائی۔

''مجھے عنادل سے بات کرنی چاہیے۔ آخر کو وہ میری محبت ہے۔'' شاہ زیب نے سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں سیڑھیاں اتر کر اس سے بات کرنے آنے لگا مگر سیڑھیاں اترتے اس کے قدم اچانک رک گئے۔ سیڑھیوں سے نیچے زمین پر احمر گرا ہوا تھا اور عنادل اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھی اس پر مکے برسا رہی تھی۔ اس نے جینز اور وائٹ ہاف سلیو شرٹ پہنی ہوئی تھی اور کالر کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور احمر اپنے بچاؤ میں اس کے ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ شاہ زیب یہ منظر دیکھ کر کھول اٹھا وہ زور سے دہاڑا۔

''احمر! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''بھائی وہ......'' احمر نے بولنا چاہا۔

''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

عنادل نے ہانپتے ہوئے کہا اس کے گال دہک رہے تھے۔ شاہ زیب پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

''جب اسے مجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو پھر میں کیوں پاگل ہوا جا رہا ہوں اس کے پیچھے۔ ضرور اسے کوئی اور پسند ہے جبھی تو وہ اس کے لیے مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔'' شاہ زیب نے خود سے کہا۔ شاہ زیب نے سر درد کا بہانہ کر کے کھانے سے منع کر دیا وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہلا دودھ کا گلاس لے کر آ گئی۔ اس نے شاہ زیب کو آواز لگائی۔

''بھائی!'' شاہ زیب کی آنکھ کھلی تو شہلا چونک گئی۔ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔

''بھائی آپ نے کھانا نہیں کھایا یہ دودھ پی لیں۔'' اس نے کہا۔

''رکھ دو! ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔'' شاہ زیب بولا۔

''اینی ٹینشن؟'' شہلا نے پوچھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ شہلا! عنادل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' عنادل نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے شاہ زیب کے منہ سے اپنا نام سنا تو اس کے قدم رک گئے۔

''کیا مطلب بھائی! اچھی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''میرا مطلب اس کی حرکتوں سے ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے کی تمیز، گھر میں اتنے بڑے اور لڑکے موجود ہیں میڈم کو اتنی شرم نہیں کہ دوپٹہ ہی لے لیں، لڑکوں سے دوستی اور ہاتھا پائی، شاید اسے کسی نے احساس نہیں دلایا کہ وہ لڑکی ہے اور ان کی کچھ لمٹ ہوتی ہیں۔'' شاہ زیب کے الفاظ اسے تیر کی طرح چھلنی کر رہے تھے۔

''بھائی عنادل، بچپن سے ہی ایسی ہی زندگی گزار رہی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''تو گھر کے بڑوں نے کیا آنکھیں بند کر لیں ہیں؟ صحیح غلط کی تفریق کو بھول گئے ہیں؟'' اس کے سوالوں کا شہلا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ واقعی ان لوگوں کی لاپروائی بلکہ غلطی کہا جائے تو بجا نہ ہو گا، تھی۔

''گھر کے بڑوں نے تو آرام سے اسے میرے پلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا مگر میرے بارے میں سوچا۔ امی بابا کو میری زندگی کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں لوگوں میں اپنی بیوی کو کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ جب میری بیوی روڈ پر لڑکوں کی طرح دوستوں سے جھگڑے گی۔ ہاتھا پائی کرے گی، بغیر دوپٹے کے پھرے گی۔'' شاہ زیب لاوے کی طرح ابل پڑا۔

''بھائی! میری بات تو سنیں۔'' شہلا بولی۔

''تم میری بات سنو معاف کرنا شہلا مگر عنادل میں لڑکیوں والی ایسی کوئی بات نہیں جس کی بنا پر میں اس سے شادی کروں۔ نہ شرم و حیا، نہ سلیقہ اور نہ رکھ رکھاؤ۔ کچھ بھی تو نہیں ہے اس میں۔ امی بابا سے ابھی بات کر کے میں ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر تم تو میری بہن ہو ناں اس لیے تمہیں اپنے دل کی آواز سنا دی۔''

''شہلا! مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''انفیکٹ! مجھے تو کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو اس سے شادی کرنے میں کوئی چارم نہیں ہو گا۔ تم ابھی امی بابا سے کچھ مت کہنا۔ مجھے اور ان کو وقت چاہیے۔

''میں اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ایسے نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ عنادل فوراً تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی اور دھم سے بستر پر چت گر گئی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ زیب کا منہ نوچ لے۔

''اتنی انسلٹ...... مسٹر شاہ زیب تم کیا منع کرو گے۔ میں تمہیں ریجیکٹ کرتی ہوں تم سے شادی کرتی ہے میری جوتی۔'' عنادل نے غصے سے کہا اور ہیڈ فونز لگا کر میوزک کا والیوم فل کر لیا۔ شہلا کے جانے کے بعد شاہ زیب سیدھا لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''عنادل! تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ میرے لیے کیسا ہے یہ صرف اور صرف میرا دل جانتا

ہے۔تم نے میرے لیے کوئی آپشن ہی کب چھوڑا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کیا کچھ نہیں سوچا تھا اور تم کیا نکلیں۔'' آنسوؤں کے قطرے شاہ زیب کی آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے اور اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆......☆

''یار پکنک کا پروگرام بنا تو لیا ہے مگر اجازت کون لے گا۔ پتا ہے ناں تھوڑے دن میں ایگزامز شروع ہو رہے ہیں۔'' احمر نے پاستہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا جو اس نے تھوڑی ہی دیر پہلے آرڈر کیا تھا۔

''اپنا کیپٹن لے گا اور کون لے گا؟'' ارسلہ نے عنادل کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا جو کہ پاستہ کھانے میں مصروف تھی۔

''ارے یہ بھی کوئی ٹینشن کی بات ہے جو مزہ کرکرا کر رہے ہو۔ مم۔ مم مم یمی۔'' عنادل نے ڈرنک کا سپ لیا اور دوبارہ پاستے سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔

''تو ٹھیک ہے چیلنج ہے تمہارے لیے دس منٹ میں اجازت لے کر دکھاؤ۔'' احمر نے کہا۔

''منظور ہے تم گھڑی میں ٹائم دیکھو میں دس منٹ میں اجازت لے کر آتی ہوں۔'' عنادل نے احمر سے کہا تو اس نے گھڑی کی طرف نگاہ کی چھ بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ عنادل محمود حسن کے کمرے میں گئی اور بولی۔

''بڑے ابو۔''

''جی میرا بچہ۔'' بڑے ابو نے کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا وہ ایزی چیئر پر بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔

''بڑے ابو مجھے بہت بوریت ہو رہی ہے تو میں نے سوچا کیوں ناں ہم سب پکنک پر چلیں۔'' اس نے نیچے جھک کر لاڈ سے بانہیں محمود حسن کے گلے میں ڈال کر پوچھا۔

''مگر بیٹا کچھ دن میں تو ایگزامز شروع ہو رہے ہیں ناں تم لوگوں کے؟'' انہوں نے کہا۔

''ہم پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہیں۔ بڑے ابو تھوڑا فریش ہو جائیں گے۔'' عنادل نے کہا۔

''ٹھیک بابا، جیسے میری گڑیا کی خوشی۔'' انہوں نے پیار سے عنادل کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''تھینکس بڑے ابو! یو آر دی بیسٹ۔'' عنادل نے اچھلتے ہوئے کہا اور کمرے سے دوڑ لگا دی۔

''ارے بیٹا! ایسی بھی کیا جلدی ہے آرام سے۔'' محمود حسن نے جاتی ہوئی عنادل سے کہا۔

''اٹس اے چیلنج بڑے ابو۔'' اس نے جاتے ہوئے زور سے کہا اور دوڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ محمود حسن اس کے جانے کے بعد مسکرانے لگے۔ وہ عنادل کو بے حد چاہتے تھے۔ شاید اپنی بیٹی شہلا سے بھی زیادہ سیڑھیاں اترتی عنادل زور سے کسی سے ٹکرائی اور اس سے پہلے لڑکھڑاتی تو اسے کسی نے تھام لیا عنادل نے جو نظریں اٹھائیں تو وہ شاہ زیب تھا۔ چند لمحے تو وہ ساکت رہی پھر سنبھل کر غصے سے بولی۔

''کیا نظر کمزور ہے جو دکھائی نہیں دے رہا۔''

''آنکھوں کے علاج کی ضرورت تو تمہیں ہے جو سامنے سے میں نہیں تو اتنا بڑا سا بکس بھی نظر نہیں آیا۔'' شاہ زیب کے ہاتھوں میں بڑا سا بکس تھا جو وہ اسٹور روم سے لا رہا تھا۔

''میں تو جلدی میں ہوں آپ ہی دیکھنے کی زحمت کر لیتے۔'' عنادل نے غراتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا آپ کی فلائٹ مس ہو رہی ہے جو جلدی میں تھیں آپ؟'' شاہ زیب نے فٹ سے کہا۔ عنادل چاہتی تو گھنٹوں کیا دنوں کے حساب سے بحث کر سکتی تھی مگر فی الحال اسے جلدی تھی اس نے شاہ زیب کو ایک

طرف دھکیلا اور نیچے دوڑ لگا دی۔ جب وہ احمر کے پاس پہنچی تو گھڑی میں ڈیڑھ منٹ باقی تھا۔

''مان گئے باس۔'' احمر نے کہا تو عنادل کھل کھلا کر ہنس دی اور اس کے گالوں میں حسین بھنور پڑ گئے۔

☆......☆

پکنک پر جانے کے لیے سب گاڑی میں بیٹھے عنادل کا انتظار کر رہے تھے۔ عنادل باہر آئی تو شاہ زیب چونک گیا ریڈ ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس اس نے سنہری بالوں کو بالکل سمیٹ لیا تھا اور سن گلاسز لگائے وہ دھوپ میں الگ ہی چمک رہی تھی۔ عنادل گاڑی میں آنے کے بجائے روڈ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں سامنے سے ایک سفید کار آ گئی اور اس میں سے دو لڑکے اور ایک لڑکی اتری۔ ان لوگوں کو دیکھ کر عنادل مسکرائی۔

''اتنی دیر لگا دی یار!'' وہ لہراتے ہوئے بولی۔

''آ جاؤ بچو! دیر ہو رہی ہے۔'' ریاض حسن نے آواز لگائی تو وہ سب گاڑی میں چڑھ گئے۔ شاہ زیب کے برابر والی سیٹ خالی تھی۔ عنادل کے دوست سہیل اور سارہ بیٹھ گئے اور حارث احمر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ عنادل نے شاہ زیب کے پاس جا کر زور سے کہا۔

''احمر اٹھو! حارث کے ساتھ میں بیٹھوں گی۔'' احمر، شاہ زیب کے برابر آ کر بیٹھ گیا اور عنادل حارث کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہو گیا۔ اس نے محمود حسن سے کہا جو کہ اس کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔

''بابا! یہ فیملی پکنک ہے یا کالج پکنک۔'' تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے یہ تو اپنے ہی بچے ہیں۔'' گاڑی میں میوزک چل رہا تھا اور پیچھے سے چاروں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ عنادل جان بوجھ کر شاہ زیب کو تپا رہی تھی اور وہ کامیاب بھی ہو گئی تھی کیوں کہ شاہ زیب کو عنادل کا اس طرح کا طرز عمل ہرٹ کر رہا تھا۔ گاڑی رکی اور سب اتر گئے محمود حسن کا ذاتی ہٹ تھا جہاں انہوں نے سارا سامان رکھوا دیا تھا۔ خواتین نے جاتے ہی فوڈ کارنر سنبھال لیا تھا۔ محمود حسن کے گروپ نے گپ شپ شروع کر دی جب کہ نوجوان پانی میں چلے گئے۔ شاہ زیب حسن ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں سمندر میں اٹھتی لہروں میں گم تھیں جو مچلتی ہوئی آ کر ساحل کو چھو لیتیں پھر مانو انہیں بے قراری میں قرار آ جاتا مگر خود اس کے اندر جو طوفان برپا تھا وہ کیسے قابو آتا ایسا کون سا بند تھا جو ان طوفانی لہروں کو باندھ دیتا اس کا جواب تو خود شاہ زیب کے پاس بھی نہ تھا۔ دوپہر ہو گئی تہمینہ بیگم نے آواز لگائی مگر سب پانی میں مستیوں میں لگے ہوئے تھے۔ پھر انہیں شاہ زیب نظر آیا۔

''شاہ زیب!''

''جی چھوٹی امی۔'' شاہ زیب انہیں بچپن سے ہی چچی کے بجائے چھوٹی امی کہتا تھا۔

''بیٹا! میں نے کھانا لگا دیا ہے سب کو لے آؤ۔'' انہوں نے کہا تو شاہ زیب وہاں سے اٹھ کر سب کی طرف چل دیا جہاں وہ سب مستیاں کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک دم شاہ زیب کے قدم رک گئے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے جسم میں خون کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ ایکدم غصے میں آ گیا۔

عنادل جھکی ہوئی تھی اور جب کہ حارث نے اسے پیچھے سے جکڑا ہوا تھا۔ عنادل قہقہے لگا رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک دم پیٹھ موڑ لی۔

''شاہ زیب بھائی آئیے نا آپ بھی۔'' اسے اپنے دائیں طرف سے احمر کی آواز آئی۔

''نہیں مجھے بھیگنا پسند نہیں ہے۔ اینی ویز، چھوٹی امی نے کھانا لگا دیا ہے تم سب کو لے کر آ جاؤ۔'' شاہ زیب اتنا کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور دستر خوان پر آ گیا پیچھے ہی سب شور مچاتے آ گئے۔

''امی میں بس دومنٹ میں آئی۔'' عنادل نے کہا اور چلی گئی۔ سب بیٹھ گئے اور کھانا نکالنے لگے۔ عنادل اندر سے آئی تو اس نے کپڑے چینج کر لیے تھے۔ بے بی پنک کلر کی شرٹ پہنے دھوپ میں تپے اس کے رخسار دہک رہے تھے جب کہ ہونٹ سرخ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند ہو گئے تھے۔ شاہ زیب کی نگاہیں عنادل پر آ کر واپسی کا راستہ بھول گئی تھیں۔

''امی! میرا پیزا؟'' عنادل نے بے تابی سے پوچھا۔

''ارے بھئی یہ لو، یہ رہا تمہارا پیزا۔'' نورین بیگم نے اسے پیزا دیتے ہوئے کہا۔ شہلا کی نگاہوں نے شاہ زیب کے جذبات کو بھانپ لیا۔ کھانے کے بعد نوجوان گیمز کھیلنے لگے۔ شاہ زیب چائے کا کپ لیے چیئر پر بیٹھ گیا۔ شہلا اس کے پاس آئی۔

''بھائی!''

''ہوں۔'' شاہ زیب چونک کر خیالات کی دلدل سے باہر آ گیا۔

''آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' شہلا نے سوال کیا۔

''ارے بھئی چائے پی رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''میں عنادل کی بات کر رہی ہوں۔ کیوں اس کو خود اپنے آپ سے دور کر رہے ہیں۔ جب کہ میں جانتی ہوں کہ آپ اسے کتنا چاہتے ہیں۔'' شہلا بولی۔

شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کوئی جانے یا نہ جانے مگر مجھے معلوم ہے کہ عنادل آپ کی بچپن کی محبت ہے۔'' شہلا نے کہا تو شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی پھر بولا۔

''محبت...... یکطرفہ محبت کچھ نہیں ہوتی۔ عنادل کے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اس کے معیار کا نہیں ہوں اور نا ہی وہ میرے معیار پر اترتی ہے، میری بچپن کی محبت کا سراپا جو میرے ذہن میں نقش تھا اسے عنادل نے چکنا چور کر دیا ہے۔''

''وہ دیکھو سامنے۔'' شاہ زیب نے ہاتھ سمندر کی طرف کرتے ہوئے کہا جہاں عنادل اکیلی حارث کے ساتھ پانی میں مچل رہی تھی۔ شہلا جھینپ کر شرمندہ ہو گئی۔

''شہلا! مجھے تو حیرت ہے کہ سب گھر والوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ میری بات تو ہٹا دو، لاڈ پیار اپنی جگہ مگر عنادل نے ساری لمٹس کراس کر لی ہیں۔''

''آئی ایم سوری ٹو سے ایسی بے ہودگی کی میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ شہلا چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر سب لوگ گھر لوٹ گئے رات گئے شاہ زیب نے اپنے والدین سے کہا۔

''امی، بابا! مجھے صبح ہی نکلنا ہوگا۔'' شاہ زیب نے محمود حسن اور روبینہ بیگم سے کہا۔

''ہوں بیٹا ابھی تو آئے ہو۔'' محمود حسن بولے۔

''بابا! اٹس ریئلی ارجنٹ۔'' شاہ زیب نے کہا اور اگلی صبح کی فلائٹ سے چلا گیا۔ شہلا حقیقت سے واقف تھی

مگر شاہ زیب نے اسے منع کیا تھا اس لیے وہ وقتی طور پر تو خاموش ہو گئی مگر اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔

☆......☆

شہلا چائے کی ٹرے لے کر امی بابا کے کمرے میں لے کر گئی تو دونوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہلا نے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھی اور بولی۔

''چائے فوراً بناؤں یا تھوڑی دیر میں پئیں گے؟''

''بیٹا بنا دو۔'' روبینہ بیگم نے کہا تو شہلا ٹی پاٹ سے چائے کپ میں نکالنے لگی۔

''بیگم! اگر شاہ زیب کو جانا نہیں ہوتا تو میں نے ایک تقریب میں ان دونوں کے رشتے کے بارے میں سب خاندان والوں کو بتانے کا پروگرام بنایا تھا۔'' شہلا نے چائے کے کپ دونوں کی طرف بڑھائے۔

''میں تو جلد عنادل کو بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' روبینہ بیگم نے کہا۔ شہلا نے موقع بہتر جان کر شاہ زیب کے دل کی آواز ماں باپ تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔

''امی، بابا! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''ہاں بولو بیٹا!'' محمود حسن، شہلا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مجھے عنادل اور شاہ زیب بھائی کے رشتے کے بارے میں بات کرنی ہے۔ بابا آپ لوگوں نے عنادل کو بھائی کی زندگی کا حصہ بنانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے مگر آپ نے بھائی کے بارے میں سوچا ہے کہ ان کی کیا مرضی ہے؟'' شہلا نے بات شروع کی۔

''کیا مطلب ہے تمہارے کہنے کا، ہم شاہ زیب سے بات کر چکے ہیں۔ انفیکٹ اگر اسے جلدی نہ جانا پڑتا تو ہم رسم کر لیتے۔'' روبینہ بیگم بولیں۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ لوگوں سے کیا کہوں؟'' شہلا جھنجھلا کر بولی۔

''بیٹا! کھل کر کہو ہم سن رہے ہیں۔'' محمود حسن نے کپ سائیڈ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بابا! شاہ زیب بھائی نے رضامندی جب ظاہر کی ہو گی جب وہ اسلام آباد میں ہوں گے کراچی آنے کے بعد تو وہ سکتے میں آ گئے تھے۔'' روبینہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تو محمود حسن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

''بابا! آپ لوگوں نے تو اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ حرکتیں دیکھی ہیں آپ لوگوں نے عنادل کی؟ اور پلیز اب مجھے اس کے بچپنے کی دہائی مت دیجئے گا۔ کیونکہ جس لڑکی کی شادی کی عمر ہو وہ بچپن کی حدوں سے بہت آگے جا چکی ہوتی ہے۔ صرف بھتیجی کی محبت میں آپ اپنے بیٹے کی زندگی برباد کرنے جا رہے ہیں۔'' شہلا بولی۔

''بیٹا! شاہ زیب نے کچھ کہا؟'' روبینہ بیگم نے سوال کیا۔

''جی مگر انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ آپ لوگوں کو کچھ بتانے سے۔ انہیں عنادل کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا سب گھر والوں نے جان بوجھ کر نظریں چرا لی ہیں۔ عنادل پر کبھی غور کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کسی نے اسے تو دوپٹہ اوڑھنے کا ہوش تک نہیں ہے اب تک، پرسوں پکنک پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ انتہائی چیپ حرکتیں کر رہی تھی شاہ زیب بھائی نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ شریف گھر کی جوان بیٹیوں کو یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں اگر بھائی بڑوں کا ادب کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بڑوں کی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہو جائے۔'' شہلا پھٹ پڑی۔

''شادی کے بعد بدل جائے گی عنادل۔'' روبینہ بیگم بولیں۔

''اوہ کم آن امی! اپنا بیٹا ہی ملا ہے آپ کو عنادل کے بدلنے کے لیے اور کبھی عنادل سے سوال کیا ہے کہ وہ خود کو بدلنا بھی چاہتی ہے یا نہیں مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے بھائی سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی بھی ہے، دن رات لڑکوں میں گھسے رہنا، چلیں شاہ زیب بھائی سے شادی ایک طرف کر دیں۔ کیا بڑوں کو عنادل کی حرکتیں بالکل نظر نہیں آتیں۔ اس کے ماں باپ، چچا چچی کسی نے اسے سمجھایا منع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بابا! لڑکی کتنی لاڈلی ہو مگر اس کی کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ یہ معاشرتی ضرورت بھی ہوتی ہے اور دین کا حکم بھی اور اس سے منہ موڑنا انسان کو نقصان کی طرف لے جاتا ہے۔ مجھے جو غلط لگا وہ میں نے کہہ دیا باقی آپ بڑے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔'' شہلا وہاں سے چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں موجود نمی کو محمود حسن اور روبینہ بیگم دیکھ چکے تھے۔

''شہلا بالکل صحیح کہہ رہی ہے ہم سے واقعی کوتاہی ہوئی ہے۔'' روبینہ بیگم بولیں۔

''اور رہی شاہ زیب سے شادی کی بات تو کل میں عنادل سے خود بات کروں گا۔'' محمود حسن نے فکر مندی سے کہا۔

☆......☆

کمرے میں تینوں بھائی اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔

''بھابی! ہم نے آپس میں رشتوں کو مضبوط کرنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا مگر کیا ہمارے بچے اس فیصلے کو دل سے مانتے بھی ہیں؟'' محمود حسن نے نورین بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

''بھائی صاحب! میں نے عنادل سے ذکر کیا تھا اس بارے میں۔'' وہ بولیں۔

''ہمارے بچے اب جوان ہو گئے ہیں اور ان کی بھی مرضی ہمیں جاننی چاہیے۔''

''کیوں احمد حسن؟'' محمود حسن نے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب! مگر مجھے یقین ہے کہ عنادل ہمارے فیصلے کو رد نہیں کرے گی۔'' احمد حسن نے کہا۔

''تو پھر بلایئے عنادل کو۔'' روبینہ بیگم بولیں۔ تھوڑی دیر میں عنادل اپنی سابقہ روایت کے مطابق جینز اور ٹی شرٹ میں چیونگم چباتی ہوئی آئی اور دھم سے صوفے پر گر گئی۔

''واؤ لگتا ہے کوئی گول میز کانفرنس ہو رہی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا اور اس کانفرنس کا ایجنڈا ہے ''مس عنادل حسن''۔ ریاض حسن بولے۔

''کیا مطلب؟'' عنادل نے چیونگم کو چبانا روک دیا۔

''عنادل! تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے بیٹا۔'' احمد حسن نے بیٹی سے کہا۔

''او کے کہیے۔'' اس نے کہا۔

''بیٹا! تمہارے بڑے ابو اور میں نے تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ بچپن میں طے کر دیا تھا اور اب ہم اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ رہے ہیں تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟'' احمد حسن نے عنادل سے کہا۔ عنادل رک کر بولی۔ ''واہ...... زندگی میری اور فیصلہ دوسرے کریں۔ سوری مگر مجھے نہیں لگتا کہ میں نے آپ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔'' عنادل نے جلدی سے کہا۔

''عنادل! یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نورین بیگم زور سے بولیں۔

''اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ صحیح تو کہہ رہی ہوں۔ میری لائف ہے اسے مجھے کس کے ساتھ گزارنی ہے وہ میرا ذاتی فیصلہ ہے تو آپ لوگ اپنی مرضی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ وہ بھی ود آؤٹ مائی پرمیشن۔'' عنادل، احمد حسن غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔

''احمد حسن بیٹھ جاؤ۔'' محمود حسن نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔

''بڑے ابو! آپ بتائیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' عنادل نے ان سے کہا۔

''بیٹا آپ کو یہاں بلانے کا یہ ہی مقصد ہے کہ آپ کا فیصلہ جان لیا جائے مگر بڑوں سے یوں بات کرتے ہیں؟'' انہوں نے عنادل سے کہا۔

''میں نے کسی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی اور جہاں تک بات ہے میرے فیصلے کی تو صاف سن لیں۔ مجھے شاہ زیب سے شادی نہیں کرنی اینڈ دیٹس فائنل آئندہ مجھے اس طرح کی کوئی تقریر نہیں کرنی۔'' عنادل نے انتہائی روڈ طریقے سے اپنا فیصلہ سنایا اور وہاں سے چلی گئی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا احمد حسن کا چہرہ شرمندگی کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

''بھائی صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں۔'' انہوں نے ہمت جمع کر کے کہا۔

''نہیں، احمد حسن! صرف تم نہیں، ہم سب شرمندہ ہیں۔ عنادل کی اس طرح پرورش ہم سب نے کی ہے لاڈ پیار میں ہم اتنا آگے نکل گئے کہ اچھا برا، صحیح غلط سب کا فرق فراموش کر بیٹھے۔'' محمود حسن نے کہا تو سب کے سر جھک گئے۔ محمود حسن نے سب کو تو سمجھا دیا مگر وہ خود اندر سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے کبھی عنادل کو رونے نہیں دیا مگر آج عنادل نے ان کے دل کو رلا دیا تھا۔

☆......☆

عنادل اور اس کی فرینڈ سارہ بوتیک سے نکل کر چل رہے تھے کہ سامنے سے ایک لینڈ کروزر بالکل ان کے قریب آ کر رکی جس سے عنادل کی ٹکر ہو گئی تھی۔ عنادل کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا اس نے شاپنگ بیگس سارہ کو پکڑائے اور گاڑی پر زور سے ہاتھ مارا۔

''سڑک کیا باپ نے خرید کر دی ہے۔'' اور پھر زور سے دوبارہ ہاتھ گاڑی پر مارا۔ سارہ نے عنادل کو منع بھی کیا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اتنے میں گاڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لمبا چوڑا نوجوان نکلا سانولی رنگت، ہلکی شیو، کلف دار کرتے شلوار میں ملبوس وہ چلتا ہوا قریب آیا تو فضا بے حد قیمتی پرفیوم کی مہک سے رچ گئی۔ اس نے سن گلاسز اتار کر عنادل کو دیکھا تو بے خوف ونڈر عنادل لمحہ بھر کو ڈر گئی۔ اس کی گھنی آئی برو کے نیچے موجود براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ عنادل نے گھبرا کر گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''گاڑی کے ساتھ کیا سڑک بھی آپ کی ملکیت ہے؟'' عنادل غصے سے بولی مگر وہ خاموشی سے عنادل کو دیکھتا رہا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بلیک کلر کے کرتے اور جینز میں عنادل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''لگتا ہے کان بھی خراب ہیں۔'' عنادل نے اپنا خوب صورت ہاتھ اس کے آگے ہلایا مگر وہ عنادل کے سراپے میں کھویا ہوا تھا۔ عنادل نے گردن ہلائی اور وہاں سے چلی گئی۔

''سائیں کہیں تو......'' ملازم نے کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔ عنادل کی بدقسمتی نے اس کا سامنا ارسل سے کروا دیا تھا اور اس میں سب سے بڑا قصور تھا عنادل کی خوب صورتی کا جس نے پہلی ہی

نظر میں ارسل کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ارسل گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی نگاہوں میں عنادل کا سراپا گردش کر رہا تھا۔
''بابا مٹھن!'' ارسل نے ملازم کو پکارا۔
''حکم سائیں۔'' مٹھن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
''بابا! ایک ضروری کام ہے وہ کرنا ہے تمہیں۔''

☆......☆

''عنادل ڈنر کا وینو کافی دور ہے۔ لیٹ ہو جائیں گے واپسی پر۔'' حارث نے کہا۔
''ہاں تو پیچ کون بتائے گا؟ کمبائنڈ اسٹڈیز کا کہہ دوں گی۔ سمپل۔'' عنادل نے لاپروائی سے کہا۔ عنادل نے فرینڈ سارہ کے گھر ٹیسٹ کی تیاری کا کہہ کر اجازت لے لی۔ سارہ کے گھر حارث اور سہیل گاڑی لے آئے اور وہ لوگ ڈنر پر نکل گئے۔ حارث ڈرائیو کر رہا تھا۔ سہیل اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جب کہ عنادل اور سارہ پیچھے بیٹھی تھیں۔
''یار! تم لوگ بورنگ ہو؟ میوزک تو لگاؤ۔'' عنادل بولی تو سہیل نے پلیئر آن کر دیا اس میں سیڈ سانگ لگا ہوا تھا۔
''کم آن یار! میرا موڈ آف مت کرو۔ نکالو یہ مجنوں نما سانگ حارث! بیک اسٹریٹ بوائز لگا دو۔'' عنادل نے کہا تو حارث نے سہیل کو سی ڈی نکال کر لگانے کو دے دی۔ ابھی سانگ چلے ہی ہوا تھا ایک لینڈ کروزر تیزی سے ان کی گاڑی کے برابر سے زور سے ٹکراتی گزری ان کی گاڑی لڑکھڑا گئی۔ پھر وہ لینڈ کروزر ان کے آگے راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اس لینڈ کروزر سے تین نقاب پوش نکلے اور ان کی گاڑی کے پاس آئے۔ ایک نے آگے ڈرائیو کرتے حارث کے سر پر گن رکھ دی اور باقی دو نے پیچھے کا گیٹ کھول کر عنادل کو باہر نکلنے کا کہا۔ مگر عنادل نے صاف انکار کر دیا۔
''بی بی باہر آئیں۔''
''نہیں۔'' عنادل بولی۔
''بی بی! آجائیں ورنہ ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔'' ایک نقاب پوش بولا۔
''آپ کیش لے لیجیے میرے پاس جیولری نہیں ہے۔'' عنادل نے اپنا والٹ دیتے ہوئے کہا۔
''بی بی باہر آئیں ورنہ اس لڑکے کو مار دیں گے۔'' حارث کے سر پر گن رکھے نقاب پوش نے کہا تو عنادل ڈرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی۔ اسے اپنے گھر والے یاد آ رہے تھے جنہیں خبر بھی نہ تھی کہ عنادل کہاں ہے۔
''چلیں۔'' نقاب پوش نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عنادل لینڈ کروزر کے پاس پہنچ کر رک گئی۔
''بیٹھیے بی بی!'' عنادل نے نہ میں گردن ہلائی تو حارث کے پاس موجود نقاب پوش نے چلا کر کہا۔
''ایک لمحہ اور لگا تو اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔'' عنادل مجبوراً گاڑی میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھتے ہی سارے نقاب پوش دوڑ کر لینڈ کروزر میں سوار ہو گئے اور اس میں موجود ڈرائیور نے گیئر لگایا اور لینڈ کروزر فراٹے بھرتی وہاں سے ہوا ہو گئی۔ گاڑی میں سوار عنادل کی ناک پر ایک رومال رکھ دیا وہ زور زور سے کسمسائی پھر آہستہ آہستہ اس کی کوشش ختم ہو گئی اور وہ ہوش سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ حارث سہیل اور سارہ مٹی کے بت بنے رہ

گئے۔ ان کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہوا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ نہ آیا کافی دیر بعد وہ ہوش میں آئے تو گھبرا گئے۔
''یار! ہم تو بری طرح پھنس گئے۔ عنادل کے گھر والوں کو تو علم ہی نہیں ہے ہمارے ڈنر پر جانے کا؟'' سہیل بولا۔
''ارے وہ بول کر تو میرے گھر گئی تھی۔'' سارہ نے روتے ہوئے کہا۔
''گائز! یہ سب باتیں تو معمولی ہیں اصل مسئلہ ہے عنادل کے کڈنیپ ہونے کا، ہمیں پہلی فرصت میں عنادل کے گھر والوں کو انفارم کرنا ہوگا۔'' حارث نے کہا اور گاڑی موڑ کر عنادل کے گھر کی طرف چل دیئے۔ جب وہ لوگ عنادل کے گھر پہنچے اور ساری بات بتائی تو عنادل کے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ نورین بیگم نے دھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔
''آنٹی پلیز! مت روئیں، یہ غلطی عنادل نے ضرور کی مگر ہم بھی بغیر بتائے جانے کے لیے اس کو نہ روک کر آپ کے مجرم ہیں۔'' سارہ بولی۔
''نہیں بیٹا! غلطی کسی کی نہیں ہے یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے ورنہ عنادل کو صرف گاڑی سے نکال کر لے جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔'' محمود حسن بولے۔ اتنے میں سامنے سے ڈی ایس پی تیمور نیازی آ گئے۔ وہ محمود حسن کے بچپن کے دوست تھے اور محمود حسن کے کال کرنے پر آئے تھے۔ ڈی ایس پی تیمور نیازی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔
''بچو! شروع سے ساری بات بتاؤ آخر ہوا کیا تھا؟'' تو عنادل کے فرینڈز انہیں پورا واقعہ بتانے لگے۔
''انکل! میں نے خاموشی سے اس لینڈ کروزر کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔'' سہیل نے اپنا موبائل محمود حسن کو دیتے ہوئے کہا۔ محمود حسن نے وہ نمبر اپنے پاس لکھ کر ڈی ایس پی تیمور نیازی کو ایس ایم ایس کر دیا۔
''ویسے اگر عنادل کو کسی نے پیسوں کے لیے کڈنیپ کیا ہے تو اب تک پیسوں کی ڈیمانڈ آ جانی چاہیے تھی۔ دوسرے پہلو کو رکھا جائے تو عنادل کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ تیسرا پہلو یہ کہتا ہے کہ کہیں کسی لڑکے وغیرہ......'' تیمور نیازی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''نیازی......!'' محمود حسن نے برہمی سے کہا۔
''نو سر! عنادل کا لڑکوں سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم جانتے ہیں اسے۔'' حارث بولا۔
''ارے بھئی! میرا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو میں اپنی عنادل بٹیا کو جانتا ہوں مگر کالج، یونیورسٹی میں اکثر لڑکے لڑکیاں ایڈونچر کے لیے ایسے بے ہودہ مذاق کر لیتے ہیں۔'' نیازی نے کہا۔
''ایک منٹ۔'' سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''ہاں یاد آیا تین یا چار روز پہلے میں اور عنادل بوتیک سے نکل رہے تھے تو عنادل کی ٹکر ایک لینڈ کروزر سے ہو گئی تھی۔ اس میں سے کوئی نوجوان نکلا تھا۔ عنادل نے اسے خوب سنائیں تھیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا مگر وہ باز نہ آئی۔'' سارہ نے یاد کر کے بتایا۔
''انٹرسٹنگ! عنادل کی کڈنیپنگ میں بھی لینڈ کروزر استعمال ہوئی ہے۔'' تیمور نیازی نے مشترکہ پوائنٹ نوٹ کیا۔
''کون ہو سکتا ہے نیازی؟'' احمد حسن بولے۔

''اس کا پتا ہم لگا لیں گے۔ آپ فکر مت کریں عنادل بیٹی کو ہم بہت جلد بحفاظت لے آئیں گے۔'' تیمور نیازی نے تسلی دی۔

☆......☆

عنادل کی آنکھ کھلی تو اس کا سر زور سے گھوم گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ابکائی بھی آ رہی تھی یہ سب بے ہوشی کی دوا کا اثر تھا۔ وہ کافی دیر لیٹی رہی پھر اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اسے یاد آیا کہ اسے تو نقاب پوشوں نے گن پوائنٹ پر ایک لینڈ کروزر میں بٹھایا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کیا ہوا یہ عنادل کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ عنادل نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک بے حد اعلیٰ اور شاندار انداز میں سجے کمرے میں موجود تھی۔ کمرہ خواب ناک حد تک شاندار تھا۔ ایک ایک چیز سے اس کی مالیت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں فل اے سی آن تھا مگر پھر بھی عنادل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موجود تھے۔ کمرے کا لاک حرکت میں آیا اور دروازہ کھل گیا۔ اس میں سے ایک نوجوان شان سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ عنادل کو اس کا چہرہ مانوس سا لگا اس نے ذہن پر زور دیا مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

''آپ کو اس طرح یہاں لانے کے لیے شرمندہ ہیں ہم مگر کیا کریں آپ ہماری دعوت پر آتیں ہی کہاں، جان لیا ہے ہم نے کہ آپ کا مزاج ہی کچھ الگ ہے۔'' اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کون ہو تم اور کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟ میں تو نہیں جانتی تمہیں۔'' عنادل نے سختی سے کہا۔

''قربان جانے کو دل چاہتا ہے تم پر اور تمہاری بے نیازی پر۔ ہم ہیں کہ بے قراری کا عالم ہے اور آپ کو ہم یاد تک نہیں خیر آپ کی آسانی کے لیے بتا دیتے ہیں کچھ روز پہلے آپ ہم سے ملیں اور اپنے ساتھ ہمارا دل لے کر چلی گئی تھیں۔ کافی باتیں بھی سنائی تھیں آپ نے ہمیں۔'' ارسل نے کہا۔ عنادل نے ذہن پر پھر زور دیا تو اسے اس روز کی جھڑپ یاد آ گئی۔ عنادل کا پارہ پھر ہائی ہونے لگا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''ہائے...... اسی غصے پر تو ہم مرمٹے ہیں آپ کو کیا معلوم کہ آپ غصے میں اور بھی حسین ہو جاتی ہیں۔'' وہ عنادل کے قریب آ کر بولا۔

''دیکھو! مجھے اس طرح کی بے ہودگی بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے میرے گھر واپس بھجواؤ۔'' عنادل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اب یہ ہی آپ کا گھر ہے۔'' ارسل نے آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ شٹ اپ! بکواس مت کرو۔'' عنادل نے غصے سے کہا۔ ارسل صوفے سے اٹھ کر عنادل کے قریب آیا اور بولا۔

''بی بی! جتنی جلدی ہو اس حقیقت کو تسلیم کر لو، ورنہ پریشانی آپ کو ہی ہو گی۔'' ارسل نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تو عنادل ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہمیں تم سے محبت ہو گئی ہے اور ہم آپ کو چاہتے ہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''واٹ نان سینس! مجھے اس طرح کی بکواس سننے کی عادت نہیں ہے، مجھے ابھی میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔''

عنادل نے خود پر کنٹرول کیا اور زور سے بولی۔ ارسل مسکرا کر اسے گھورنے لگا۔

''تمہاری یہی ادا تو مجھے بھا گئی اور تم نے ارسل شاہ کے دل کو چھو لیا ورنہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرے سامنے اونچی آواز میں بات کر سکے۔ بی بی میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا ورنہ کون روکے گا مجھے چاہوں تو اس لمحے اپنا بنا سکتا ہوں تمہیں۔'' ارسل نے عنادل کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ عنادل لرز کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ارسل اس کا انداز دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔

''آرام کرو پرسوں ہمارا نکاح ہے اگر ہمیں جانا نہ ہوتا تو ابھی نکاح ہو جاتا۔'' ارسل نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ عنادل کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دروازہ پھر کھلا تو عنادل نے چونک کر دیکھا تو ملازمہ ٹرالی لے کر اندر آئی تھی۔ ''بی بی کھانا کھا لیں۔'' اس نے عنادل سے کہا۔ ٹرالی دنیا بھر کے لوازمات سے آراستہ تھی مگر عنادل نے کچھ نہیں کہا ملازمہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

''محمود حسن گاڑی ٹریس ہو گئی ہے۔ ''ارسل شاہ'' کے نام پر رجسٹرڈ ہے بہت بڑے باپ کی اولاد ہے۔ گاڑی سے ساری معلومات مل گئی ہیں۔'' ڈی ایس پی نیازی نے کہا۔

''نیازی کچھ بھی کرو میری عنادل کو خراش تک نہیں آنی چاہیے۔'' محمود حسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ سے دعا کرو محمود حسن! کوشش ہماری ہو گی اور حکم اللہ کا انشاء اللہ ہم بہت جلد عنادل تک پہنچ جائیں گے۔'' تیمور نیازی نے کہا۔

☆......☆

ملازمہ دوبارہ آئی تو کھانا جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ اس نے ٹرالی کو خاموشی سے دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی اور ارسل کو جا کر بتا دیا۔ ارسل نے پھر کھانا لانے کا کہا اور خود کمرے میں گیا۔ ملازمہ نے دوسری ٹرالی لا کر دی اور چلی گئی۔ عنادل نے ارسل کو دیکھ کر نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''عنادل بی بی! کھانا کھا لیں۔'' ارسل نے اسے پیار سے مخاطب کیا۔

''نام مت لینا میرا اپنی گندی ناپاک زبان سے۔'' عنادل نے کہا۔

''ہاہاہا! مگر اب تو میرا نام ہمیشہ کے لیے تمہارے نام سے جڑ جائے گا اور عنادل زندگی بھر کے لیے میری قید میں آ جائے گی۔'' ارسل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میں مر جاؤں گی مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔'' عنادل نے روتے ہوئے کہا۔ ارسل نے پلیٹ میں کھانا نکالا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''میری اجازت کے بغیر تو تم مر بھی نہ سکو گی جو چیز ارسل شاہ کی جان بن جائے، اس کی جان ارسل شاہ کے حکم کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔'' ارسل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو! غصہ چھوڑو اور کھانا کھا لو۔'' ارسل شاہ نے نوالہ اس کے منہ کے قریب کیا تو عنادل نے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔

''دیکھو! مجھے زبردستی پر مجبور مت کرو، ورنہ پھر جو کچھ ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' ارسل نے دھمکی آمیز انداز سے کہا تو عنادل لرز گئی ارسل نے ہاتھ بڑھایا تو عنادل نے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

''خوش قسمت ہو تم جو میرے دل میں اتر گئیں اور میں تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا رہا ہوں، ورنہ ان گنت لڑکیاں یہاں آئیں اور کہاں گئیں کسی کو آج تک خبر نہ ہو سکی۔'' ارسل کی چمکتی آنکھیں عنادل کو اپنے وجود کے آر

بار ہوتیں محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے جھینپ کر نظریں نیچی کر لیں۔ اس کی اس حرکت پر ارسل بے اختیار مسکرانے لگا۔

☆......☆

"سر! جن بندوں کو نگرانی پر معمور کیا ہے۔ انہوں نے خبر دی ہے کہ لینڈ کروزر کچھ دیر قبل شہر سے دور ایک فارم ہاؤس پر کھڑی ہے اور فارم ہاؤس ارسل شاہ کے باپ کا ہے۔" آفیسر نے تیمور نیازی کو رپورٹ کی۔

"فوراً ریڈ کرو، ہاں مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔" تیمور نیازی نے آرڈر دیا۔

"او کے سر!" آفیسر نے سیلوٹ کیا اور چلا گیا مگر ارسل بھی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ ارسل کو چند منٹ پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ فوراً غائب ہو گیا اگر اسے تھوڑا ٹائم اور مل جاتا تو وہ عنادل کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ پولیس نے فارم ہاؤس پر ریڈ کر کے عنادل کو بازیاب کروا لیا۔ پولیس نے کافی جگہ چھاپے مارے مگر ارسل شاہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ پھر ارسل شاہ کے باپ نے محمود حسن کو کال کی اور بولا۔

"معاملے کو پھیلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بدنامی صرف لڑکی کی ہوتی ہے تو اگر تم ارسل کو جانے دو تو میں زبان دیتا ہوں کہ آئندہ وہ تمہاری بیٹی کو پریشان نہیں کرے گا۔" محمود حسن نے سمجھداری کا مظاہرہ کیا اور عزت کی وجہ سے ارسل شاہ کو معاف کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کسی نہ کسی طرح اس نے بچ ہی جانا تھا مگر اب اس کا باپ ضمانت دے رہا ہے کہ وہ عنادل کو اب پریشان نہیں کرے گا، کیونکہ کیا بھروسہ وہ پھر عنادل کو تنگ کرنے آ جاتا۔ ارسل شاہ کو اس کے باپ نے بیرونِ ملک بھیج دیا۔ عنادل یہ سوچ سوچ کر لرز جاتی کہ اگر پولیس وقت پر نہ آتی اور ارسل اس سے نکاح کر لیتا تو زندگی بھر وہ اس سے پیچھا نہ چھڑا پاتی۔ عنادل کو اس واقعے نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆......☆

"السلام علیکم پھپھو۔" منیبہ آپا نے جو شاہ زیب کی آواز سنی تو نہال ہو گئیں۔

"ارے میرے بچے! وعلیکم السلام تین سال بعد پھپھو یاد آ گئیں؟" انہوں نے پیار سے کہا۔ عنادل سے شادی نہ ہونے کے بعد شاہ زیب دوبارہ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اسے گئے تین سال ہو گئے تھے۔

"کیا کسی گوری سے شادی کر لی ہے جو آنے کا دل نہیں چاہتا۔" انہوں نے شاہ زیب کو چھیڑا۔

"پھپھو! میں ابھی ابھی پاکستان آیا ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔" شاہ زیب نے ہنستے ہوئے کہا۔ شاہ زیب چونکہ اسلام آباد میں رہتا تھا تو منیبہ پھپھو سے ملنے راولپنڈی آتا رہتا تھا۔ وہ بھی شاہ زیب کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

"کب آ رہے ہو پھر؟" انہوں نے پوچھا۔

"پھپھو! بس آفس رپورٹ کر دوں پھر آتا ہوں۔" شاہ زیب نے کہا۔

"او کے بیٹا! اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔" انہوں نے کہا۔

"اللہ حافظ پھپھو۔" شاہ زیب نے کہا۔

☆......☆

گاڑی دروازے پر رکی اور گاڑی سے شاہ زیب اتر کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا بکے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مہنگے سے مہنگے گفٹ سے زیادہ منیبہ پھپھو کو سرخ گلاب پسند آتے، انہیں سرخ گلابوں سے

عشق تھا۔ ان کا گھر لان کے علاوہ بھی گلاب کے پودوں سے مزین تھا۔ شاہ زیب نے دروازے کے برابر دیوار پر لگی ڈور بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد خان بابا نے دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم خان بابا۔" شاہ زیب نے گرم جوشی سے کہا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" خان بابا نے دعا دی۔ لان میں قدم رکھتے ہی شاہ زیب چونک کر رک گیا۔ وہاں موجود ایک وجود نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا مہندی کلر کے شیفون کے سوٹ میں ملبوس وہ اپنی گوری کلائیوں میں بجی میرون کلر کی چوڑیاں پہنے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ سر پر موجود دوپٹے کو ہوا بار بار اُڑا رہی تھی۔ دوپٹے کے آنچل سے کبھی دکھتی کبھی چھپتی اس کی جھلک شاہ زیب کو بے قرار کرنے لگی۔ حالانکہ شاہ زیب اس ٹائپ کا نہیں تھا جو لڑکیوں کو دیکھتے ہوں مگر جانے اس وجود میں کیسی مقناطیسی کشش تھی جو اس کو اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"آخر وہ کون ہے؟" شاہ زیب کا تجسس مزید بڑھنے لگا۔ اس نے غور سے دیکھنا چاہا تو قدرت نے اس کا کام آسان کر دیا۔ تیز ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اس کے سر سے آنچل کو اڑا دیا اور اس کے کمر پر پھیلے ہوئے بال ہوا میں بکھر کر اسے پریشان کرنے لگے۔ اس حسین پیکر نے پانی روک کر ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا اور دوبارہ دوپٹہ سر پر لے لیا پھر وہ مڑی مگر آنچل اڑا اڑ کر اس کے چہرے کو چھپائے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب اسے دیکھ پاتا وہ سر جھکا کر اندر چلی گئی۔ شاہ زیب اس کے جانے کے کچھ دیر بعد تک وہیں جما کھڑا رہا پھر اسے ہوش آیا تو وہ جھینپ گیا۔

"یہ میں کیا کر رہا تھا کسی کو اس طرح دیکھنا بالکل غیر اخلاقی حرکت ہے۔" اس نے خود کو برا کہا۔

"ارے بیٹا! شاہ زیب تم کب آئے؟" منیبہ پھپھو نے اسے دیکھ کر خوشی سے کہا۔

"بس ابھی آیا ہوں۔ یہ میری سویٹ پھپھو کے لیے ہیں۔" شاہ زیب نے سرخ گلابوں کا بکے منیبہ بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو سو مچ بیٹا۔" منیبہ بیگم نے شاہ زیب کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

"پھپھو! یہ کون محترمہ تھیں جو اندر گئی ہیں؟" شاہ زیب نے سوال کیا۔

"وہ! ارے وہ تو اپنی عنادل ہے۔" منیبہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا شاہ زیب ان کی بات پر چونک گیا۔

"کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں ہے، نہیں یہ عنادل نہیں ہو سکتی وہ تو......"

"چلو بیٹا اندر کیا یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟" تو شاہ زیب خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عنادل سارا دن اپنے کمرے میں ہی تھی منیبہ بیگم نے شاہ زیب کو ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل کی زندگی میں اتنا بڑا چینج آیا انہوں نے ارسل شاہ سے لے کر عنادل کے پنڈی آنے تک کی ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ذہنی کیفیت بالکل بچوں کی طرح ہو گئی تھی۔ محمود حسن نے فوراً عنادل کو ان کے پاس بھیج دیا۔ پہلے تو عنادل نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود کر رکھا۔ میں نے کچھ وقت تو اسے من مانی کرنے دی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے اس کی نئے سرے سے تربیت کرنی شروع کر دی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دین کے بارے میں پڑھایا، نماز کی طرف راغب کیا۔ اسے اس کی اقدار سمجھائیں کہ کس طرح ایک لڑکی کو شرم وحیاء کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے اور اس طرح رہنے سے انسان بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سائے میں میرے بتائے انداز میں ڈھلتی چلی گئی۔ اب وہ پہلے والی عنادل نہیں

رہی۔

”اتنا سب ہوگیا پھپھو! اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”ارے بیٹا! یہ سب ہمارے لیے ایک خوفناک حادثہ تھا۔ جس سے ہم سب نکلنا چاہتے تھے خاص طور سے عنادل اور محمود حسن کا حکم تھا اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے اور اللہ بھلا کرے محمود حسن کے دوست ڈی ایس پی تیمور نیازی کا جس نے اس بات کی بھنک بھی نہ ہونے دی تھی کسی کو اور بحفاظت ہماری بچی ہم تک پہنچادی اور ویسے بھی تم اتنی دور پردیس میں بیٹھے تھے تمہیں پریشان کر کے کیا فائدہ ہوتا۔“ منیبہ پھپھو نے اسے سمجھایا۔ شاہ زیب بے تاب ہورہا تھا کہ کب عنادل باہر آئے اور وہ اس کا دیدار کرسکے۔ شام ہوگئی شاہ زیب اور منیبہ پھپھو بیٹھے تھے کہ عنادل وہاں آگئی۔

”پھپھو! کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ شاہ زیب کو اپنی سماعت پر شبہ ہوا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا اور عنادل کو دیکھا اور پھر نظریں ہٹانا بھول گیا۔ سی گرین نیٹ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی کھلتی گوری رنگت دہکتے گال، گلابی ہونٹ شاہ زیب کی نظر میں اپنے تخیل میں موجود عنادل گھوم گئی جو کہ اب حقیقتاً اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”بیٹا! آج تو شاہ زیب کی پسند کا کھانا بنالو، پلاؤ تو بنالیا ہے میں نے تم شامی کباب اور کھیر بنالو۔“ منیبہ پھپھو نے عنادل کو کہا۔

”پھپھو! مجھے لگتا ہے کھانے سے پہلے اپنی انشورنس کروالینی چاہیے۔“ شاہ زیب نے کہتے ہوئے عنادل کی طرف دیکھا تو عنادل دھیرے سے سر جھکا کر مسکرادی اور اس کے گلابی ہونٹوں پر موجود تل نے شاہ زیب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ شاہ زیب کی محبت کا حسین پیکر آج صحیح معنوں میں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شاہ زیب رات کے کھانے پر میز پر آیا تو میز سلیقے سے بجی ہوئی تھی۔ عنادل خاموشی سے پھپھو کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

”بیٹا! کھانا دو شاہ زیب کو۔“ پھپھو نے عنادل سے کہا تو عنادل نے سلیقے سے کھانا پلیٹ میں نکال کر شاہ زیب کو سرو کیا۔

”بیٹا! اپنی انگلیاں بچا کر کھانا کھانا، میری گڑیا بہت لذیذ کھانا بناتی ہے۔“ منیبہ پھپھو ہنستے ہوئے بولیں۔

”دیکھتے ہیں بھئی۔“ شاہ زیب نے کہا اور نوالہ منہ میں ڈال کر ٹیسٹ کرنے لگا۔

”مان گئے پھپھو! کھانا واقعی بے حد لذیذ ہے۔“ شاہ زیب نے دل کھول کر عنادل کی تعریف کی۔

☆......☆

دوپہر سے پھوار پڑ رہی تھی مگر رات ہوتے ہی بادل گھر کر آنے لگے۔

”لگتا ہے بارش زوروں سے برسے گی آج۔“ منیبہ پھپھو نے کہا۔

”جی پھپھو! آپ یہ دودھ پی لیجیے۔“ عنادل نے کہا اور دودھ کا گلاس رکھ کر چلی گئی۔ عنادل منیبہ پھپھو کے کمرے سے باہر آئی وہ چلتی ہوئی کوریڈور سے گزرتی اپنے کمرے میں جارہی تھی کہ ایکدم زور سے بارش شروع ہوگئی عنادل چلتی ہوئی گیلری میں آکر کھڑی ہوگئی۔ شروع سے ہی اسے بارش پسند تھی بچپن میں تو باقاعدہ گھنٹوں بارش میں تمام کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلتی تھی۔ عنادل نے ہاتھ باہر نکالا اور اپنے ہاتھوں کو بھگونے لگی اور آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ شاہ زیب کب آکر پیچھے کھڑا ہوا اسے کچھ معلوم نہ ہوسکا وہ مسلسل اسے دیکھے جارہا تھا پھر ایکدم عنادل کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں تو اس کے سامنے

شاہ زیب کھڑا تھا۔ عنادل اسے دیکھ کر جھینپ گئی اور شرما کر سر جھکا لیا اور پلٹ کر جانے کے لیے مڑی تو شاہ زیب نے ایکدم اس کی کلائی تھام لی۔

”کہاں جارہی ہو مجھے یوں تنہا چھوڑ کر؟“ شاہ زیب نے اس سے کہا۔

”یہ کیا کررہے ہیں آپ؟ چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ عنادل نے گھبرا کر کہا۔

”یہ ہاتھ میں نے زندگی بھر تھامنے کا ارادہ تو جانے کب سے کر رکھا تھا مگر تم......“ شاہ زیب کہتے کہتے رک گیا۔ عنادل نے ہاتھ چھڑا کر جانا چاہا مگر شاہ زیب کی گرفت اس کے جذبات کی طرح مضبوط اور شدید تھی۔

”کہاں تھیں تم عنادل اب تک؟ تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھے کس قدر مایوس کیا ہے۔“ شاہ زیب نے جذباتی انداز سے کہا۔

”میں نے تو سب کو مایوس کیا ہے۔ سب کی امیدوں کو توڑا ہے۔ بڑوں کے دل دکھائے ہیں اور اس کی سزا قدرت نے مجھے دی تھی مگر وہاں بھی میرے اپنوں کی دعاؤں نے مجھے بچالیا جن کو میں نے مایوس کیا تھا۔ بہت بری ہوں میں۔“ عنادل نے شرمندگی سے سر جھکائے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا وہ حادثہ ایک الگ چیز ہے جو کسی کے بھی ساتھ پیش آسکتا تھا۔“ شاہ زیب نے اسے سمجھایا۔

”ہاں مگر جانتی ہو؟ تم نے جو مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اس نے میرا دل چکنا چور کردیا تھا۔“ شاہ زیب نے شکوہ کیا۔

دل چکنا چور کردیا تھا مگر آپ کو میرے انکار سے بھلا کیوں کر فرق پڑا؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔

”مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے انفیکٹ مجھے تو کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو مجھ سے شادی کرنے میں کوئی چارم نہ ہوگا۔“ عنادل نے شاہ زیب کے شہلا سے کہے جملے دہرا دیے۔

”وہ تو میرے اندر کی فرسٹریشن تھی جب میری محبت غیر لڑکوں کے ساتھ گھومے گی، ان کے ساتھ ہاتھاپائی کے مذاق کرے گی تو کیا میری غیرت یہ سب گوارا کرتی میرے تصور میں جو سالوں سے میری محبت کا عکس بسا ہوا تھا۔ جیسا کہ آج تمہارا وجود ہے پاکیزہ، معطر، شرم وحیاء سے آراستہ میرے اس تراشے ہوئے خاکے کے تم بالکل برعکس نکلیں تو کیا میرا ردِعمل غلط تھا؟ تم خود بتاؤ۔“ شاہ زیب نے الٹا اسے ہی گواہ کرلیا۔

”بولو عنادل۔“

”آپ کا ردِعمل بالکل نیچرل تھا۔“ عنادل نے دھیرے سے کہا۔

”عنادل مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے تمہیں دل سے نکال دیا یا اب مجھے تم سے محبت نہیں رہی بلکہ تمہارے شادی سے انکار پر میں نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا۔“ شاہ زیب نے کہا تو عنادل چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”مگر کیوں؟“ عنادل نے حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ اس لیے کہ میں آج بھی تمہیں اتنی ہی شدتوں سے چاہتا ہوں عنادل! میرے دل پر دستک دینے والی پہلی اور آخری لڑکی صرف تم ہی ہو۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”مگر میں......“ عنادل نے کچھ کہنا چاہا تو شاہ زیب نے اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔





''اب تو مجھے میری محبت پا لینے دو، کیا تم زندگی کے اس سفر میں میری ہمسفر بنو گی؟'' شاہ زیب نے عنادل کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو عنادل نے شرم سے سر جھکا دیا۔

''پھپھو! آپ بابا سے بات کریں میرے اور عنادل کے رشتے کی۔'' شاہ زیب نے منیبہ بیگم سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

''شاہ زیب! تم نے میرے دل کی بات کہہ کر مجھے خوش کر دیا۔ ارے ہم بڑوں نے سالوں پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر تم بچوں نے ہی منع کر دیا تھا خیر دیر آئے درست آئے۔'' پھر منیبہ بیگم نے محمود حسن کو کال کی اور بات کی محمود حسن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی تھا مگر وہ ایکدم خاموش ہو گئے۔

''آپ! پہلے دونوں کو کراچی لے آیئے پھر بات کرتے ہیں۔'' منیبہ آپا دونوں کو لے کر کراچی پہنچ گئیں جہاں سب گھر والے ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

☆......☆

''شاہ زیب! پہلے بھی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمہارے اور عنادل کے نصیب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے مگر شہلا کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ مجھے بچوں سے پہلے معلوم کرنا چاہیے تھا۔ اب جب دوبارہ منیبہ آپا نے یہ ذکر چھیڑا ہے تو تم بتاؤ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے عنادل سے شادی کرنے میں؟'' محمود حسن نے پوچھا۔

''نہیں بابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے سر جھکا کر کہا۔

''ٹھیک ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر فیصلہ عنادل کے جواب پر منحصر ہے۔'' انہوں نے شاہ زیب سے کہا۔ پھر وہ عنادل کے پاس گئے اور بولے۔

''عنادل بیٹا! میں تمہاری مرضی پوچھنے آیا ہوں کسی بھی دباؤ میں آئے بغیر جواب دینا۔'' محمود حسن کے کہنے عنادل دوڑ کر آئی اور ان سے لپٹ گئی۔

''آئی ایم رئیلی سوری بڑے ابو۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''مگر کس لیے بیٹا؟'' محمود حسن نے کہا۔

''فار مائی بی ہیویئر۔ میں نے اس دن بہت روڈ انداز میں بات کی تھی جو کہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' عنادل نے کہا۔

''جو گزر گیا اسے بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کہ اپنے بڑے ابو کی بہو بنو گی؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو عنادل نے سر جھکا کر ان کے سینے سے ٹکا دیا۔ محمود حسن نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''جیتی رہو۔''

شاہ زیب اور عنادل کی شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی محمود حسن کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ ان کی برسوں کی خواہش آج پوری ہوئی تھی۔ احمد حسن اور نورین بیگم بھی بھائی بھابی سے کیے وعدے کو پورا کر کے بہت خوش تھے۔ شہلا اب مطمئن تھی کہ اس کے بھائی کو اس کی محبت اس کی چاہ کے مطابق مل گئی تھی۔ ارسلہ اور احمر نے خوب ادھم مچایا ہوا تھا۔ شادی کے روز عنادل اور شاہ زیب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے، جب کہ عنادل کے فرینڈز حارث، سہیل اور سارہ ارسلہ اور احمر کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ شاہ زیب نے عنادل کو چھیڑا۔

''عنادل! تم بھی جینز شرٹ پہن کر ان کا ساتھ نہیں دو گی؟'' تو عنادل نے شرما کر نا میں گردن ہلا دی۔

......☆......

رابعہ افضال خان

افسانہ

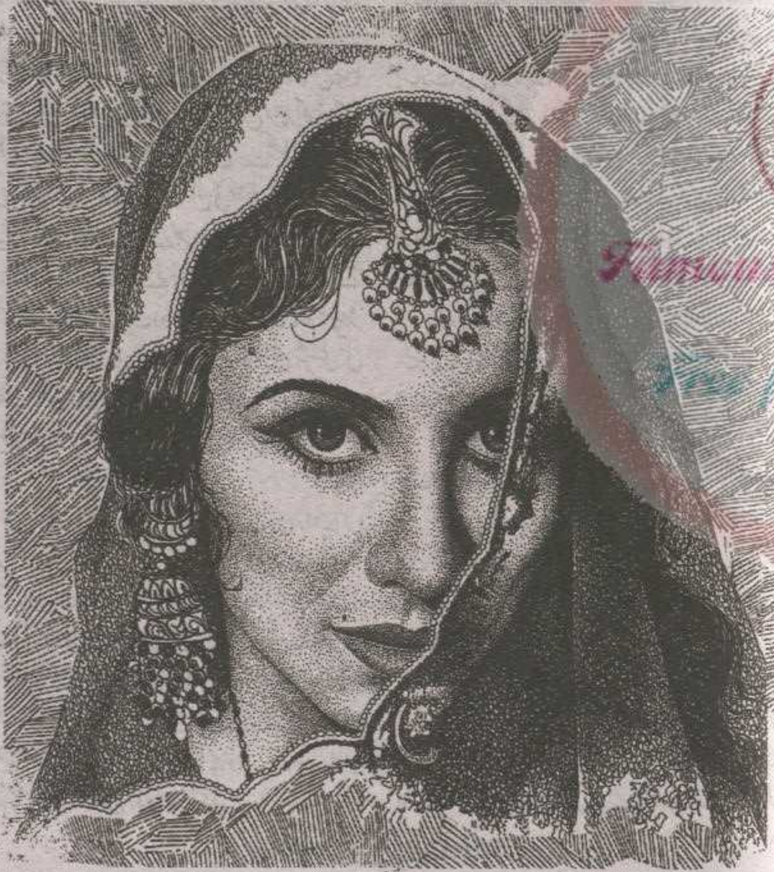
محبت کا دن

باہر بڑی رونق لگی تھی۔ فلاور شاپس، گفٹ شاپس پر ینگ جنریشن کا میلہ سا لگا تھا۔ ہر شخص مکمل جوش و جذبے کے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ خالی ہوتے دل کے ساتھ سڑک کراس کر کے بس



اسٹینڈ تک آئی تھی اور اس کی خوش قسمتی کہ اس کے مطلوبہ روڈ کی بس جلد ہی آ گئی تھی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں چڑھ گئی تھی۔ چلتی گاڑی سے بھی اسے جگہ جگہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے لگے اسٹال اور شاپ نظر آتی رہی تھیں جہاں حد درجہ رش لگا تھا، لڑکے لڑکیاں بھرپور طریقے سے خریداری میں مصروف تھے، اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ ایک زخم جو اس کے دل میں ناسور بننے لگا تھا اس میں سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔

"ویلنٹائن ڈے ہم مسلمانوں کا تہوار تو نہیں ہے تو پھر کیوں ہم اس فضول تہوار کو منائیں۔ وہ یوں ہی خالی خالی نظروں سے باہر لگی رونقیں دیکھ رہی تھی، جبھی اس کی سماعتوں میں ماضی میں کہا گیا یہ جملہ شور مچانے لگا تھا۔ وہ یک دم ہی اپنے خیال سے باہر آئی اور چونک کر اپنے آس پاس دیکھنے لگی تھی۔ اتنے میں اس کا اسٹاپ آ گیا تو وہ بیگ سنبھالتی گاڑی سے اتر آئی تھی۔ سست قدموں سے چلتی وہ گھر کی دہلیز تک آئی تھی دروازہ فاخرہ بیگم نے کھولا وہ سلام کرتی چھوٹے سے صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد فاخرہ بیگم سے باتیں کر کے وہ سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی،



جبھی اس کی نظر رانیہ کی تصویر پر جا پڑی اور اس کی ذہنی رو پھر سے بہکنے لگی تھی۔ تین سال پہلے کی تو بات ہے جب رانیہ بھی یوں ہی زور و شور سے ایسے ایونٹ کی تیاریوں میں مصروف ہوا کرتی تھی۔ رانیہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ دونوں بہنوں میں دیکھنے والی محبت تھی ہانیہ کی نسبت بچپن سے اس کے پھپھو زاد ابوہریرہ سے طے تھی جب کہ رانیہ کی منگنی راحم سے دونوں کی پسندیدگی کی بنا پر ہوئی تھی۔ راحم، رانیہ کی فرینڈ کا کزن تھا ان کی پہلی ملاقات بھی رانیہ کی فرینڈ کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔

ہانیہ جتنی شوخ مزاج تھی، ابوہریرہ اتنا ہی سنجیدہ مزاج تھا جب کہ رانیہ راحم کا مزاج ایک جیسا تھا۔ شوخ و چلبلا پن ان کی فطرت کا حصہ تھا۔ یوں تو ہانیہ کو ابوہریرہ بہت پسند تھا مگر کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا کہ جیسے ابوہریرہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتا۔ کوئی بھی اسپیشل ایونٹ ہوتا ابوہریرہ کی طرف سے مکمل خاموشی ہوتی، ہانیہ اس کی طرف سے پہل کی منتظر رہتی جب کہ رانیہ اور راحم ہر ایونٹ کو بڑے بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے، گفٹ کے تبادلے ہوتے، ڈنر پر ساتھ جاتے زیادہ سے زیادہ ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرتے ایسے میں رانیہ کے چہرے پر پھیلی شرمیلی سی مسکان ہانیہ کو ابوہریرہ سے مزید بددل کر دیتی مگر وہ خاموش ہی رہتی بس دل میں ہی جلتی کڑھتی رہتی۔

☆......☆

ہانیہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی تب ہی رانیہ اس کے پاس چلی آئی۔

"ہانی بات سنو۔" وہ اس کے سر پر کھڑی ہو کر زور سے بولی تو وہ اپنے خیالوں سے باہر نکل آئی۔

"ہاں بولو۔" اس نے سامنے کھڑی رانیہ کی طرف دیکھا۔

"ہانی! کل ویلنٹائن ڈے ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا راحم کو کیا گفٹ کروں، ڈریس کیسا پہنوں۔" وہ پریشان لہجے میں ہانیہ کو دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

"کچھ بھی گفٹ دے دو اور کوئی بھی ڈریس پہن لو تم پر سب سوٹ کرتا ہے۔" ہانیہ نے بیزاری سے کہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے یہ بتاؤ تم اور ہریرہ بھائی نے کل کے لیے کیا سوچا ہے۔" وہ بڑے جوش سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے دو لفظی جواب دیا تھا۔

"کیوں......؟" رانیہ نے از حد حیرت سے بیزار بیٹھی ہانیہ کو دیکھا۔

"یہ تمہیں آج ہی کیوں خیال آیا، اس سے پہلے وہ کب اس طرح کے کوئی بھی ایونٹ کو سیلیبریٹ کرتا ہے۔" اس نے بیزاریت سے کہا تھا۔

"تو اس دفعہ تم خود ہی انہیں سرپرائز دے دو۔ یقیناً وہ خوش ہوں گے۔" اور رانیہ کے زور دینے پر ہانیہ نے پہلی بار خود سے ابوہریرہ کو ویلنٹائن ڈے پر گفٹ دینے کی جسارت کی تھی۔ بہت خوب صورت ریڈ روز سے ہارٹ شیپ میں سجا بکے خریدا ایک اچھا سا پرفیوم اور ساتھ میں ویلنٹائن ڈے کا کارڈ اور پھر اس نے ابوہریرہ کو خود سے کال کر کے ریسٹورنٹ میں ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ابوہریرہ اس کے اس طرح کال کر کے بلانے پر پریشان سا افتاں و خیزاں بھاگا چلا آیا تھا۔

"خیریت اس طرح ایمرجنسی میں باہر ملنے کے لیے کیوں بلایا ہے۔" ابوہریرہ نے سرسری سی نظر اس کے خوب صورت چہرے پر ڈالتے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"سب خیریت ہے آپ پریشان مت ہوں۔" وہ ایک دم ہی کچھ گھبرائی سی بولی تھی۔

"میں نے یہ ویلنٹائن ڈے کا گفٹ دینے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔" اس نے جھکی پلکوں کے ساتھ جلدی سے کہا تھا۔ ابوہریرہ کی پیشانی پر یک دم ہی کئی سلوٹیں پڑی تھیں۔

"کیا ہے یہ ویلنٹائن ڈے یہ فضول سا تہوار منانا ہم مسلمانوں پر فرض تو نہیں کیا گیا بلکہ سرے سے ہمیں اس فضول خرافات جیسے ویلنٹائن ڈے کو منانا ہی نہیں چاہیے اور مجھے اس طرح کے فضول ایونٹ کو سیلیبریٹ کرنا بالکل

پسند نہیں ہے۔ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم مسلمانوں کے لیے کچھ حدود بنائی ہیں اگر ہم ان حدود میں رہتے ہوئے زندگی گزاریں تو یہ ہمارے اور ہمارے گھر والوں دونوں کے لیے بہتر ہوگا، یہ ضروری تو نہیں انگریزوں کے بنائے گئے اس فضول سے ایونٹ کو ہم بھی ان کی طرح جوش و خروش سے سیلیبریٹ کریں آج کے بعد اس طرح کا کوئی بھی فضول کام مت کرنا، میں جانتا ہوں یہ آئیڈیا بھی رانیہ کا ہی ہوگا مگر مجھے تم جیسی سمجھدار لڑکی سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے مگر حد درجہ سنجیدہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا اس کے بے تحاشا سرخ ہوئے چہرے کو نم ہوتی پلکوں کو دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ نرمی سے بولا تھا۔

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

ہانیہ جواب تک ایسے کھڑی تھی کا ٹو تو بدن میں لہو نہیں، وہ یک دم ہی ہوش میں آئی تھی اور ایک جھٹکے سے اپنے جھکے سر کو اٹھایا تھا۔

"میں خود جا سکتی ہوں۔" حد درجہ سرد لہجے میں کہتی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ابوہریرہ نے ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کی پھر ٹیبل پر موجود ان تمام چیزوں کو اٹھاتا وہ بھی نکل آیا۔

☆......☆

گھر آ کر وہ تکیے میں منہ چھپا کر ابوہریرہ کے ہاتھوں اپنی تذلیل پر دل بھر کر روئی تھی۔ جب کہ رانیہ کو اس نے اس سب کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔

دو مہینے بعد ہی پھپھو کی طرف سے ابوہریرہ اور ہانیہ کی شادی کا شور بلند ہونے لگا۔ پھپھو کا کہنا تھا کہ ابوہریرہ کو دو سال کے کنٹریکٹ پر کمپنی باہر بھیج رہی ہے تو جانے سے پہلے وہ شادی کرنا چاہتی ہیں۔ اماں، ابا نے بہت سمجھایا زور دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا بس ایک یہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ ابوہریرہ نے ملنے کی کوشش کی مگر اس نے ملنے سے بھی صاف منع کر دیا آخر کار ابوہریرہ چلا گیا وہ ایئرپورٹ بھی چھوڑنے نہیں گئی۔ نہ جانے ابا اماں نے کس طرح بات سنبھالی مگر اسے پرواہ ہی کہاں تھی۔ دن یوں ہی اپنی رفتار سے گزرنے لگے سال کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا آج صبح سے رانیہ کی تیاریاں دیکھنے لائق تھیں۔ ویلنٹائن ڈے کے لیے اس نے اسپیشل تیاری کی تھی۔ وہ اپنی تیاری مکمل کر کے جوں ہی کمرے سے نکلی اماں سے باتوں میں مصروف راحم کی نگاہ رانیہ پر جم کر رہ گئی۔ اماں دل سے راضی نہ تھیں مگر راحم کی منتوں کے آگے مجبور ہو گئیں۔ رانیہ کو راحم کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر وہ اسے جلدی گھر آنے کی تاکید کرنا نہیں بھولی تھیں۔ وہ جو تین گھنٹوں میں واپسی کا کہہ کر گئی تھی مگر یہاں تو پوری رات بیت گئی تھی اور رانیہ گھر واپس نہیں آئی تھی ہانیہ اس کے موبائل پر کال کر کے تھک چکی تھی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا، راحم کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ اماں نے ساری رات جاء نماز پر اور ابا نے گیٹ کے چکر لگا کر گزار دی تھی۔ فجر کی اذانوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ہانیہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا تھا اور وہیں ساکت ہو گئی تھی۔ شام میں جو رانیہ اتنی نک سک سے تیار ہو کر راحم کے ساتھ گئی تھی اب اسی رانیہ کی حالت قابل رحم تھی۔ جا بجا پھٹا ہوا لباس بکھرے بال چہرے پر جگہ جگہ پڑے نیل اور چوٹ کے نشان کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ ہانیہ تو صدمے کے عالم میں اسے دیکھے گی۔

"کون ہے ہانی!" ابا اسی دم کمرے سے نماز ادا کر کے نکلے تھے اور بیٹی کی ایسی حالت دیکھتے ہی تیورا کر زمین پر گر پڑے تھے۔ ہانیہ ایک دم ہوش میں آئی تھی اور ابا کی طرف بھاگی تھی مگر صادق صاحب بیٹی کی بربادی برداشت نہ کر سکے اور ملک عدم سدھار گئے تھے۔ ان لوگوں کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی، ابا

کی تدفین بھی نہ ہوئی تھی کہ رانیہ نروس بریک ڈاؤن ہونے سے خود زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو گئی تھی۔ ایک ہی دن میں ان کے گھر سے دو جنازے اٹھے تھے۔ان ماں بیٹی کو تو ہوش ہی نہ رہا تھا۔ چند دن گزرنے کے بعد ایک دن یوں ہی ہانیہ نے اپنی ڈائری کھولی تو اس میں رانیہ کی تحریر رقم تھی۔

پیاری ہانیہ!

جب تک یہ تحریر تمہاری نظروں سے گزرے گی۔ اس وقت میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ چند باتیں ہیں جو تم سے کہنا چاہتی ہوں تم بہت لکی ہو ہانی کہ تمہیں ابوہریرہ جیسے شخص کا ساتھ نصیب ہوگا، کاش کہ میں بھی تمہاری طرح لکی ہوتی پتا ہے ہانی اس رات ویلنٹائن ڈے پر جب میں راحم کے ساتھ جارہی تھی تو ذرا بھی پتا نہ تھا کہ میں اپنی بربادی کی طرف قدم بڑھا رہی ہوں، راحم مجھے ڈنر کے بہانے سے ہوٹل میں بک کروائے کمرے میں لے گیا۔ڈنر کے بعد وہ یک دم ہی ایک مہذب پڑھے لکھے شخص سے کسی شیطان نما درندے میں تبدیل ہو گیا۔ بہت منتیں کی تھیں میں نے اس کی خدا رسول کا واسطہ بھی دیا تھا مگر اس پر تو شیطان سوار تھا جو اپنی ہوس مٹانے کے درپر تھا میری ہزار ہا منتوں پر اس نے بڑے آرام سے کہا کہ شادی تو ہمیں کرنی ہے تو پھر کیا حرج ہے اور کب تک تڑپاؤ گی اور ویلنٹائن ڈے تو ہے ہی محبت کے اظہار کا دن، ایک دوسرے کے قریب آنے کا دن، دوریوں کو مٹانے کا دن محبت کرتی ہو نا مجھ سے تو پھر یہ گریز کیسا اور پھر میری آہیں چیخیں کچھ کام نہ آیا اس درندے نے اپنی ہوس مٹانے کے لیے میری عصمت کی بے داغ چادر کو داغ دار کر دیا اور میں اپنی سب سے قیمتی متاع گنوا بیٹھی اور لٹی پٹی زندہ لاش کی طرح گھر لوٹ آئی؟ یہ بھی اسی درندے کی مہربانی تھی کہ وہ مجھے گھر چھوڑ گیا، ابا میری رسوائی کے خوف سے میری صفائی سنے بنا ہی مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں اپنے پیارے ابا کی قاتل ہوں۔ دنیا والوں کی نظروں میں اپنے لیے نفرت دیکھنے اور لوگوں کے طعنے سننے کی ذرا ہمت نہیں ہے۔ خدا مجھے موت دے دے۔ میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا کیا پتا اللہ کے دربار میں مجھے معافی مل جائے کہ وہ بڑا بے نیاز ہے۔

تمہاری بدنصیب بہن

رانیہ صادق

ہانیہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ایک فضول سے انگریزوں کے بنائے گئے تہوار کے دن کو سیلیبریٹ کرنے پر اس کی پیاری بہن کو کیسی بھیانک سزا ملی تھی وہ واقعی میں خوش نصیب تھی کہ کسی بڑی قربانی دینے سے پہلے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔

☆......☆

ہانیہ نے بہت کوشش کی تھی کہ ابوہریرہ سے اس کا کسی طرح رابطہ ہو جائے مگر ابوہریرہ سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ابوہریرہ جان کر اسے اگنور کر دیا ہے، وہ تو صرف معافی مانگنا چاہتی تھی۔ اپنی اس لمحے بھر کی بے اختیاری کی مگر وہ تو اسے ایک موقع دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ وہ تو ابا اور رانیہ کے انتقال پر بھی نہیں آیا تھا ہاں مگر اماں سے ہر ہفتے تفصیلی بات ہوا کرتی تھی مگر ہانیہ کو تو جیسے وہ بالکل ہی فراموش کر چکا تھا۔

☆......☆

”ہانی بیٹا! گیٹ اچھی طرح بند کرلو، میں سودا لینے جارہی ہوں مارکیٹ تک۔“ فاخرہ بیگم نے صحن میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی تھی۔

”آئی امی!“ وہ کچن سے برآمد ہوئی تھی دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی فاخرہ بیگم کے جانے کے بعد اس نے گیٹ بند کیا اور دوپٹہ کمر پر باندھتی صفائی کرنے لگی تھی۔ جبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی وہ وائپر رکھتی دوپٹہ شانوں پر ٹھیک کرتی گیٹ تک آئی تھی، دستک مزید تیز ہونے لگی تھی۔

”کون ہے بھئی۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے

گیٹ کھول دیا تھا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ جیسے لمحہ بھر کائنات کی ہر شے ساکت ہو گئی ہو پورے تین سال کے بعد وہ نکھرا نکھرا سا اس کے سامنے موجود تھا۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گی ہانی!“ اسے یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ اپنے نرم مخصوص دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ وہ بے اختیار ہی سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ ابوہریرہ اندر چلا آیا، پیچھے وہ بھی دروازہ بند کرتی اندر چلی آئی۔

”امی! گھر پر نہیں ہیں۔“ وہ نظریں جھکائے انگلیاں چٹخاتی کنفیوز سی بولی تھی۔

”کیسی ہو ہانی؟“ اس نے جیسے اس کی بات سنی نہ تھی۔

”ٹھیک ہوں، آپ بیٹھیے میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ جواب دیتی تیزی سے جانے لگی تھی کہ جبھی اس کی نازک کلائی ابوہریرہ کی گرفت میں مقید ہوئی تھی وہ جیسے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔

”تم اب تک ناراض ہو مجھ سے۔“ ابوہریرہ نے اس کا رخ اپنی جانب موڑتے اس کی نم ہوئی آنکھوں میں دیکھتے آہستہ سے کہا تھا اور اسے نجانے کیوں یک دم ہی رونا آگیا تھا وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”بس کرو ہانی! اور کتنا شرمندہ کرو گی۔“ وہ اس کا سر تھپتھپاتے دھیمے سے بولا تھا۔

”شرمندہ تو میں ہوں آپ سے، بہت زیادہ اتنی کہ معافی مانگنے کی بھی ہمت نہیں کر سکی آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ہمیں ویلنٹائن ڈے جیسی کوئی بھی خرافات سیلیبریٹ نہیں کرنا چاہیے۔ مغربی خرافات جنہیں تہوار کا نام دیا گیا ہے ان کی تقلید کرتے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہمیں سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں دے سکتے اللہ اور اس کے رسولؐ نے یوں ہی اسلام کو ایک مکمل دین نہیں کہا ہے۔ ہمارا دین ہمیں بربادی و تباہی کے راستے پر جانے سے روکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی قائم کردہ حدود ہمیں رسوائی و بدنامی کے دلدل سے دور رکھتی ہیں ہمیں بے راہ روی کا شکار نہیں ہونے دیتیں اور جو مغربی رسومات کی تقلید کرتے ہیں ان کا انجام رانیہ جیسا یا شاید اس سے بھی بدتر ہوتا ہے میں تو آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی کہ میرے دل میں بھی ایک فرسودہ خیال نے جنم لیا تھا۔ شرمندگی اتنی تھی کہ معافی تبھی نہ مانگ سکی۔“ وہ کہنے پر آئی تو دل کا تمام غبار نکال دیا۔ ابوہریرہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اپنے دل پر کوئی بوجھ مت رکھنا، جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے اور وہ شخص خوش نصیب ہے جو گرنے سے پہلے سنبھل جائے، میری دعا ہے کہ اللہ مغرب کی تقلید کرنے والے تمام نوجوان نسل کو ہدایت عطا فرمائے اور بے راہ روی کا شکار ہونے والے نوجوانوں کو عقل دے تاکہ ہمارا معاشرہ ان فرسودہ رسومات سے محفوظ رہ سکے۔“ ابوہریرہ کے گھمبیر لہجے میں کہی بات پر بے ساختہ ہانیہ کے لبوں سے آمین نکلا تھا۔

”ایک بات کہوں ہانی!“ ابوہریرہ نے اس کے آنسوؤں سے نم چہرے کو نظروں کے حصار میں لیا تھا۔

”بولیں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے ابوہریرہ کو دیکھنے لگی۔

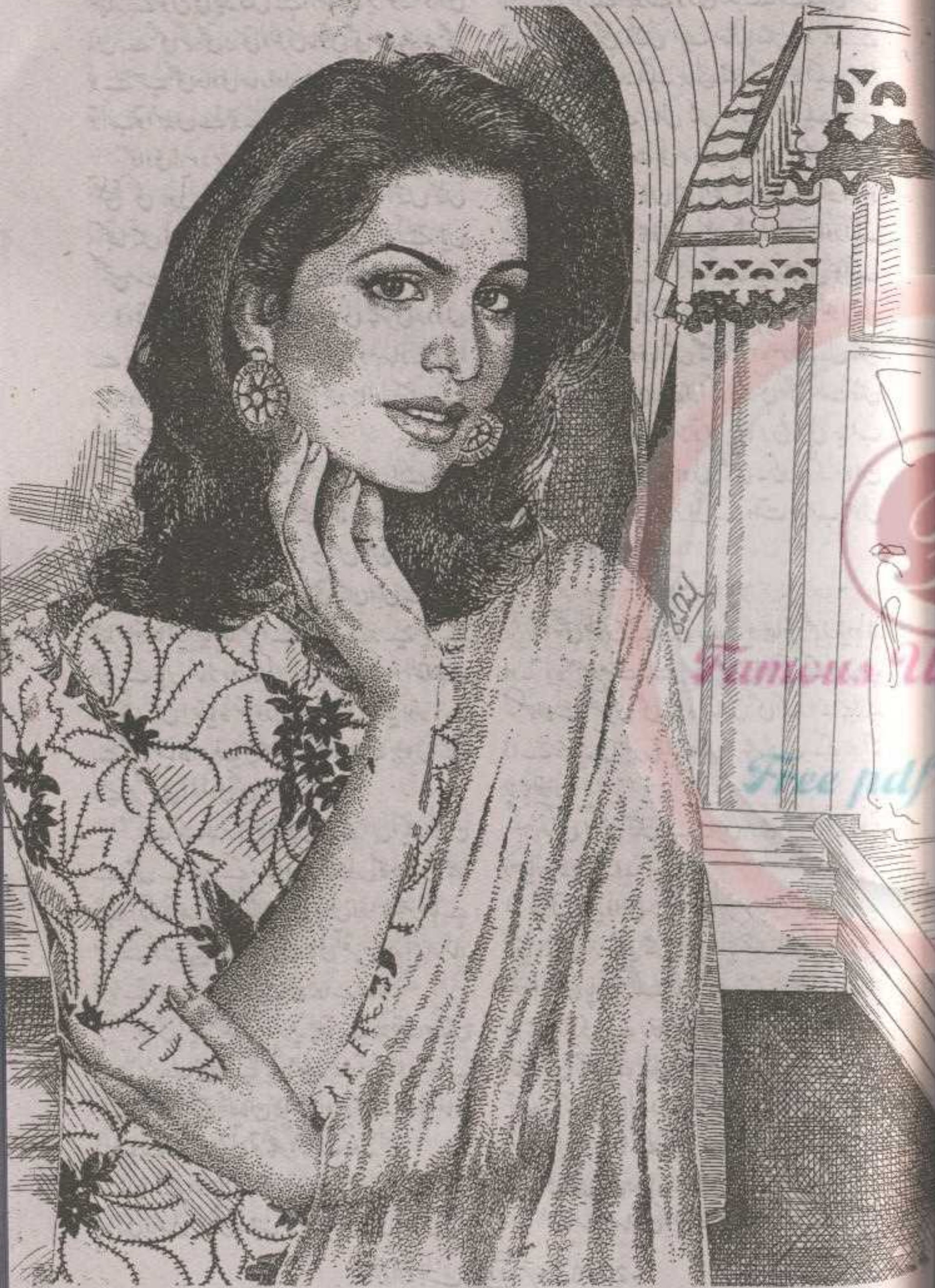
”پلیز! اب کے امی ابا شادی کی تاریخ مانگنے آئیں تو انکار مت کرنا۔“ اس کے گھمبیر لہجے میں کہے گئے جملے نے پل میں اسے سٹپٹا کر نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میں منتظر ہوں تمہارے جواب کا۔“ ابوہریرہ نے شرارت سے کہا تھا۔

”اوکے میں سوچوں گی اس بارے میں۔“ کہنے کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

ابوہریرہ کے لبوں پر بھی گہری مسکراہٹ نے قبضہ کیا تھا۔ آگے کا سفر یقیناً بہت حسین تھا۔ جس پر ان دونوں کو ایک دوجے کے سنگ ہمقدم ہو کر چلنا تھا۔

......☆......



معصوم خریدار

فریدہ فرید

افسانہ

''دکان والے بھائی آپ نے ایک ٹافی زیادہ دی ہے۔'' روپوں کے دراز میں گھسے ذوق کو رسیلی آواز نے متوجہ کیا وہ روز کی طرح چند لمحوں بعد پھر آ گئی تھی اور شکایت بھی حسب سابق تھی وہ زیر لب مسکراتا نرمی سے مڑا تھا۔

لمبے قد کی دبلی سی لڑکی عجیب بے جوڑ سے لباس پہنتی تھی۔ دوپٹہ ہمیشہ کالے رنگ کا اور شلوار سفید رنگ کی ہوتی مگر قمیص کے رنگ بدلتے رہتے، صرف دو چوڑیاں اس کی کلائی میں ہوتیں پاؤں میں ہوائی چپل پہنے وہ سادگی کی مورت تھی۔ دو ہفتے ہوئے تھے اسے اس کی دکان پر آتے۔ محلے کی اکلوتی کنفکشنری کی دکان تھی وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے سپاری، ٹافیاں، چپس بسکٹ وغیرہ لینے آتی، وہ روز ہی ایک عدد سپاری، ٹافی، زائد ڈال دیتا اور بلا ناغہ وہ چند ہی لمحوں بعد لوٹانے بھی آ جاتی۔ یہ سوچے بناء کہ ایسا اتفاق روز کیسے ہو سکتا تھا۔

''رکھ لو ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔''

وہ تقریباً ہر روز ایسا ہی جواب دیتا تھا۔ وہ ایمانداری سے ایک ٹافی یا سپاری جتنے پیسے اس کے کاؤنٹر پر رکھ کر خاموشی سے لوٹ جاتی اور ذوق اسے دور تک جاتا دیکھتا وہ پیسہ دکان کے باہر لگے چندہ والے باکس میں ڈال دیتا، اس روٹین کو دونوں باقاعدگی سے قائم رکھے ہوئے تھے نہ وہ زائد دینے سے باز آتا اور نہ وہ بنا پیسے کے لینے پر آمادہ ہوتی بھلا ہو رہا تھا تو چندے والوں کا۔

☆......☆

''آیۃ الکرسی پڑھ کر دکان کھولے تو برکت ہو ناں، صبح تڑکے دکان کھولو تو برکت کے فرشتے آتے ہیں۔ یہ مردود دوپہر کو شٹر اٹھاتا ہے اور وہ بھی بھجن پڑھتے ہوئے آمدنی کہاں سے ہو۔''

ابا اماں کے سر پر برستے جا رہے تھے۔ روپوں کو گنتے جاتے تھے اور اسے کوستے جاتے تھے۔ یہ تقریباً روز کا ہی معمول تھا۔ دن بھر وہ دکان پر مغز ماری کرتا۔ رات کو ابا آتے بکس کھول کے روپے نکالتے گھر جا کے گنتے اور شور مچاتے۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے چمچ اور گلاس اٹھا اٹھا کے پھینکنا نہ بھولتے، مگر جوش میں بھی ہوش سے کام لیتے اور جو چیز اٹھا کے پٹخنی ہو وہ اسٹیل کی ہی اٹھاتے کانچ اور پلاسٹک کی چیزیں توڑ کے اپنا ہی نقصان تھوڑی نہ کرنا تھا۔

''رحمت کے فرشتے تو سنا تھا اب یہ برکت کے فرشتے کہاں سے آ گئے۔'' ذوق اگر ان کی باتیں دل پر لیتا تو بھوکا ہی مر جاتا وہ آتش بازی کرتے رہتے اور ذوق کان بن کیے کھانا کھاتا رہتا۔ کہیں کہیں حسب ضرورت لقمہ بھی دے دیتا۔

''لاکھوں کی تعداد میں فرشتے ہیں آسمان و زمین پر یقیناً ان میں برکت کے بھی ہوں گے۔'' ذوق سے چھوٹی امینہ نے لقمہ دیا تھا۔ جس پر بڑی بہن سفینہ نے ایک چپت رسید کر دی تھی۔ وہ ابا سے خود ڈرتی ہو نہ ہو ان کو ڈرانے کا کام ضرور انجام دیتی تھی۔

''کفر مت تولو فرشتے اللہ کی نورانی مخلوق ہیں۔

تمہارے مخول کی جگہ نہیں ہے استغفار پڑھو۔'' دادی ماں نے بھی گرجتی برستی انٹری ماری تھی وہ کچھ نہ بھی بولتے تب بھی دادی سارا دن ڈراتی دھمکاتی تھیں۔ تو اب تو انہوں نے بولنے کی گستاخی کی تھی۔

''دادی! سود پر وعظ کرنے سے پہلے اگر اصل پر تبلیغ کی ہوتی تو زیادہ فائدہ مند تھا۔ انہیں نہیں سمجھاتیں ذرا سا گنگنا کیا لوں جھٹ سے کہتے ہیں بھجن مت پڑھ ادھر استغفار نہیں بنتا۔''

ذوق کو ابا کی چھڑی اور دادی کی چھڑی دونوں سے بیک وقت واسطہ پڑتا تھا۔ کبھی تو دم سادھے پڑا رہتا اور کبھی حسب طاقت دفاع کر دیتا اور یہیں سے جنگ عظیم کا طبل بج جاتا۔

''اب یہ سود کہاں سے آ گیا بیچ میں اے ذاکر دین پتہ کر کہیں ہمیں حرام تو نہیں کھلا رہا۔'' دادی نے تو ایک نیا محاذ کھول دیا تھا۔ ابا کی لعن طعن کو رابطہ مہیا کرنے کا کام وہ بخوبی انجام دیتی تھیں اس نے سود کا لفظ محاورتاً ادا کیا تھا مگر الٹے لینے کے دینے پڑ گئے ان کے ہاں نماز روزہ کی پابندی ہو نہ ہو الفاظ کی ادائیگی میں احتیاط ضروری ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ احتیاط صرف بچوں کو کرنا ہوتا تھا بڑوں کے لیے ہر قسم کی آزادی تھی۔

''بک بک نہ کر جو کہتا ہوں وہ سمجھ اس ایک دکان سے میں نے رج کے کمایا اور تم ساروں کا دوزخ بھرا ہے، آدھی آمدنی بھی نہیں رہی کہاں اڑاتا پھر رہا ہے میرے خون پسینے کو۔'' ابا رٹی رٹائی تقریر روزانہ ارشاد فرماتے اور روز اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''ابا جی! پورا محلہ ادھار پر چلتا ہے۔ وقت پر نہیں دیتے پر دے ہی دیتے ہیں مہینہ کے آخر میں حساب کتاب کرو تو نفع نقصان کا اندازہ ہوگا روزانہ کی کمائی سے بات سمجھ نہیں آتی تو پھر بگڑتے ہو۔''

ان کے درمیان بہترین سامع اماں تھیں۔ وہ ساری زندگی سوچتی رہیں کہ جس دکان کی آمدنی کے ان کے اکلوتے سپوت کو دن بھر طعنے ملتے ہیں اس آمدنی نے کبھی انہیں ایک سال میں دو جوڑے نصیب نہیں کیے۔ ایک سال میں گرمی کا ایک جوڑا بناتیں تو دوسرے سال میں سردی کا ایک سوٹ سلواتیں، تین وقت کی روٹی پر دوزخ بھرنے کی اصطلاح سارا دن کان میں انڈیلی جاتی۔ آٹھ افراد کے لیے دو کمروں کا ذاتی مکان کل اثاثہ تھا اور ایک دکان جو پیٹ بھرنے کا آسرا تھی۔ چار بہنوں کا ایک بھائی ان کا واحد سہارا تھا۔ جو دن بھر طعنوں تشنوں کی زد میں رہتا مگر یہ وہ باتیں تھیں جو وہ صرف دل میں سوچتی رہتیں۔ زبان سے ادا کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ کچھ کہہ کر تو پوں کا رخ اپنی جانب موڑنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو لڑائی کے وقت جواب بھول جایا کرتے ہیں۔

☆......☆

''اچھی طرح سے گن کے ڈالو بھائی کم زیادہ نہ ہو۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔ ذوق کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ جتا گئی تھی کہ زائد چیز نہ ڈالے ہمیشہ کی طرح اسے روز پھر لوٹ کے جو آنا پڑتا تھا۔

''گنتی اچھی نہیں ہے میری کوئی کمی بیشی ہو تو دھیان نہ دیا کرو۔''

ذوق لاپرواہی سے کہتا ہر مرتبان سے مطلوبہ اشیاء نکال کر شاپر میں ڈال رہا تھا۔ وہ ہر چیز برابر مقدار میں پانچ الگ الگ شاپرز میں ڈلواتی تھی اور وہ تابعداری سے روز ایسا ہی کرتا تھا۔ ہاں بڑے شاپر میں چھوٹے شاپرز کو اکٹھا کرتے ہوئے ایک آدھ زائد چیز ڈال دیتا جو الگ ہونے کی بناء پر نظر آجاتی اور وہ لوٹانے کے لیے واپس بھی آجاتی بس ایک ہی دن میں دو بار دیکھنے کی منشا تھی اس کی۔

''اتنا سارا سامان کون کھاتا ہے؟''

ذوق انتہائی سست رفتاری سے کام کرتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب دکان پر اس کے علاوہ اور کوئی گاہک نہ ہو اور ایسا موقع محلے کی واحد دکان پر کم ہی میسر آتا تھا۔ آج بھی اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سو موقع غنیمت جان کر اس نے بات بڑھانے کے لیے سوال داغا۔

''چھوٹے بہن بھائی ہیں جب تک یہ کھاتے رہتے ہیں منہ بند رہتا ہے تھوڑا سکون مل جاتا ہے۔'' بظاہر وہ نارمل انداز میں کہہ رہی تھی مگر اسے اس کی بیزارگی سوچ کر ہنسی آ گئی۔ بڑے بہن بھائی کا سب سے بڑا قصور یہی ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہوتے ہیں انہیں چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ایسے سپرد کی جاتی ہے جیسے یہ ان کی ذاتی خواہش ہو۔

''تم خود بھی کچھ کھاتی ہو یا بس ان کا منہ بند دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہو۔'' اس کے ناک چڑھا کے جواب دینے پر ذوق نے مزید تکلفات توڑنے کی سعی کی تھی مگر اب کی بار وہ بے نیازی سے خاموش کھڑی رہی اور اس کی سستی پر دل ہی دل میں کوسے گئی۔

''جلدی کرو ناں بھائی! آپ کو گنتی ویسے نہیں آتی اور کام بھی کاہلی سے کرتے ہو۔'' اس کے بلاوجہ فری ہونے پر مقابل کو بھی دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا تھا۔ ذرا کی ذرا میں اس نے ذوق کی بینڈ بجا دی تھی وہ بوکھلا گیا تھا۔ وہ ایک ہی جملے میں اس کی دو چوریاں پکڑ گئی تھی۔ ایک تو زائد چیز ڈالنے کی دوسری بلاوجہ دیر لگانے کی۔

''گنتی نہیں آتی تو سکھا دو پر غصہ تو نہ کرو، زبان میں چاشنی اچھی بات ہے۔''

''آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟''

ذوق نے تو بس اسے لائن پر لانے کی کوشش کی تھی مگر وہ حیرت سے دریافت کرنے لگی۔ وہ خود حیران تھا کہ اس نے نام لیا ہی کب ہے؟ اسے خوب سوچنے پر فضول سا خیال آیا کہ کہیں اس کا نام گنتی تو نہیں ہے کیونکہ اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔

''دیکھو بھائی! میں بڑی ہوں اس لیے مجھے یہاں آنا پڑتا ہے۔ پر تم میرا نام کسی اور کو مت بتانا۔'' وہ پھر سے تنبیہہ کر رہی تھی یہ دیکھے بنا کہ وہ اپنے الفاظ میں سے اس کا نام تلاش کرنے میں پوری طرح غرق تھا۔

''چاشنی ہر ایک کے لیے تھوڑی نہ ہوتی ہے۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بڑبڑاتی لوٹ گئی تھی۔ اسے الجھن کا سرا تھمائے وہ طمانیت سے مسکرایا تھا او...... تو معصوم خریدار کا نام چاشنی تھا۔ رکھنے والے نے مٹھائی کھا کر نام رکھا تھا۔

☆......☆

سفینہ کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اس کے ذمہ اوپر کے بہتیرے کام تھے اور دکانداری تو مستقل روگ تھا ابا کو سوائے صلواتیں سنانے کے کچھ اور نہ آتا تھا۔ مصروف روٹین میں بھی اسے شام میں آتی معصوم خریدار نہ بھولتی اور زائد شے ڈالنے کی پختہ عادت کو وہ ویسے بھی ایمانداری سے نبھا رہا تھا۔ دونوں کی مستقل مزاجی عجیب ہی تھی ذوق ایکسٹرا ڈالے جاتا اور چاشنی لٹائے جاتی اس نے کبھی بھی وہ چیز قبول نہیں کی تھی۔

شادی میں سارا محلہ مدعو تھا مگر ایک گھر کو انوائیٹ کرنے میں باپ بیٹے کی پھر سے ٹھن گئی تھی۔ محلے میں نئے نئے وارد ہوئے شیخ احسان کو مدعو کرنے میں ذاکر دین کو تامل تھا وہ دو اور دو جمع بائیس کرنے کے عادی تھے۔ صرف انہی لوگوں کو بلانے کے حق میں تھے جن کے ہاں کچھ دیا دلایا ہوا تھا۔ واپسی کا موقع جو تھا شیخ احسان سے ابھی دینے دلانے والا معاملہ جو نہیں تھا۔ جب کہ وہ انہیں بلانے پر بضد ضرور تھا مگر اپنی ضد کا کوئی معقول

ریزن دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اب ابا کو کیسے بتاتا کہ شیخ احسان کو نہیں چاشنی کو بلانا مقصود تھا۔ کیسے لگتی ہو گی وہ فینسی ڈریس میں جیولری پہنے سنگھار کیے۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ اس کی سب سے بڑی مخالف پارٹی نے اس کا میدان مار لیا تھا۔ دادی ماں نے ابا کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔

''آنے دے شیخ کو چھ بچے ہیں اس کے کچھ دینا دلانا کر لے گا تو آگے اپنے بھی کام آئے گا۔''

دادی کی معلومات کافی تیز تھیں انہیں شیخ احسان کے مکمل کوائف بچوں کی تفصیلات نام تک معلوم تھے یہیں اسے پتا چلا کہ چاشنی تین بہنوں تین بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ سب سے بڑا بھائی شاہ میر ہے جو دبئی میں جاب کرتا ہے اسی کے دم سے گھر کی دال روٹی چلتی ہے شیخ صاحب تو ریٹائرمنٹ کے بعد محض اخبار پڑھنے، سیاسیات پر بحث کرنے اور بچوں کو ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں کرتے ابا کی طرح اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ ایسے اباؤں کی موجودگی میں گاڑی اسٹیشن پر لگے گی بھی کہ نہیں۔

شادی میں چاشنی اپنی تمام تر فیملی کے ساتھ آئی تھی مگر وہ ویسی قطعاً نہیں لگ رہی تھی جیسا اس نے سوچا تھا۔ سوٹ میں خاص بات صرف یہ تھی کہ وہ مکمل میچنگ تھا عام دنوں کی طرح رنگ برنگے اسٹائل میں نہیں تھا جیولری نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہی اس کی مخصوص دو چوڑیاں اور وہی کس کے گوندھی ہوئی چوٹی اس کی سادگی کی وجہ بھی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ چار چھوٹے بہن بھائیوں نے اسے تگنی کا ناچ نچایا ہوا تھا اس کی امی حد سے زیادہ وزنی شیخانی تھیں۔ جہاں بیٹھیں سو بیٹھی رہ گئیں وہ شیطانوں کے ٹولے کے پیچھے ہلکان ہوئی پھر رہی تھی۔ ذرا دیر کو ستاتی تو شیخ صاحب کی چنگھاڑتی آواز آتی۔

''دیکھ شنی! اس چوہے کو بل میں گھسا جا رہا ہے۔''

پانچ سالہ چھوٹا بھائی میز کے نیچے گھسنے لگتا تو وہ ٹانگوں سے گھسیٹ کر باہر نکالتی اس کے سر کے بال بکھر گئے تھے اور کپڑوں کی کریس تو بس نام کی رہ گئی تھی۔ وہ جو اپنے گھر کی شادی کی ڈھیروں مصروفیات کے ساتھ ساتھ برابر اسے نظر میں رکھے ہوئے تھا اس کی حالت دیکھ کر کڑھ کے رہ گیا۔ اچانک اس کے ذہن میں چاشنی کی بات در آئی۔

ذوق گھر سے ملحق دکان سے پانچ پیکٹس بنا کر لے آیا اور چاشنی کو تھما دیے وہ مشکور نظروں سے اسے تکنے لگی۔ چاروں شیطانوں کو ٹھونسنے پر لگا کر وہ ذرا دیر کو سکون سے بیٹھ گئی مگر وہ اس افراتفری میں بھی ذوق کی زائد ڈالی چھوہارے کی تھیلی کو دیکھ کر متعجب ضرور ہوئی، گنتی واقعی بہت کمزور تھی ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔

☆......☆

ہفتہ بھر ہو گیا تھا۔ چاشنی کا دیدار کیے وہ آج کل دکان پر نہیں آ رہی تھی۔ وجہ اسے اِدھر اُدھر سے پتا چل ہی گئی تھی اس کا بڑا بھائی دبئی سے آیا ہوا تھا اور چھوٹے شیطانوں کا منہ بند رکھنے کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے ٹھونسنے کا سامان خریدنے نہیں آ رہی تھی۔ ذوق کی دلچسپی دکانداری میں ویسے بھی زبردستی کی تھی اوپر سے واحد تفریح بھی فی الحال بند تھی۔ اس لیے بوریت انتہا پر تھی بی اے مکمل کیے دو سال ہو گئے تھے۔ مزید پڑھنے کا شوق بھی نہیں تھا اور ابا کی طرف سے اجازت بھی نہیں ملی تھی وہ صاف لفظوں میں کہتے تھے۔ جب دکان چلانی ہے تو گریجویشن کیا اور مڈل پاس کیا ابتدا میں وہ اس مقولے سے سخت نالاں تھا مگر اپنے کالج فیلوز کو ڈگری کے ساتھ نوکری کے لیے جوتیاں گھساتے دیکھ کر اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ چلتی چلاتی دکان غنیمت تھی عزت کی روزی تھی اور سب سے بڑھ کر اپنی مرضی کی بھی۔ اب یہی مرضی کیا کم تھی کہ استحقاق

سے چاشنی کے لیے زائد شے ڈال دیا کرتا تھا کسی اور کی غلامی میں ایسا کرنا کہاں سے ممکن ہوتا ہے؟

چاشنی نہیں آ رہی تھی مگر وہ اس کے حصے کی کوئی نہ کوئی زائد سپاری یا ٹافی روز کی روز ضرور الگ کر لیا کرتا تھا اور یہ پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اگر چاشنی نے ذرا سی کمزور راہ دکھائی تو وہ یہ خود سے فرض کیا اس کا حق ضرور اس کے سپرد کر دے گا۔

دو دن بعد اسے چاشنی سے ملنے کی نئی راہ مل گئی تھی ہوا یوں تھا کہ دکانداری کر کے رات کو گھر لوٹا تو کھانے میں بینگن اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ یہ وہ سبزی تھی جس کے بارے میں اس کے خیالات بیان کرنے لائق نہیں حسب استطاعت وہ بک جھک کے بنا کھائے کمرے میں آ کے لیٹ گیا تھا اگر معلوم ہوتا گھر میں یہ پکا ہے تو باہر سے ہی کچھ کھا آتا وہ خالی پیٹ افسوس کر رہا تھا کہ بریانی کی مہک نے اسے متوجہ کیا وہ اسے خالی پیٹ کی خام خیالی سمجھ کے اگنور کرنے لگا مگر بائیں طرف میز پر رکھی پلیٹ نے اسے کرنٹ لگا دیا وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا مزیدار مرغی بریانی دیگ کی ویسے بھی اس کی کمزوری تھی پاس کھڑی امینہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''کہاں سے آئی ہے یہ نعمت؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے انصاف کرتے ہوئے بمشکل بول پایا تھا۔

''شیخ صاحب کے گھر سے نیاز آئی ہے۔ سنا ہے دبئی کی آمدنی ہے صدقہ اتارنے کے لیے دیگ چڑھائی ہے۔'' امینہ نے تفصیلی جواب دیا وہ بہنیں خود بینگن کھا کر بھائی کے لیے بریانی سنبھال لیتی تھیں۔ آخری نوالے میں جا کر اسے احساس ہوا مگر اب وہ آفر کرنے لائق نہیں رہا تھا۔

''سوری بہنا!'' وہ شرمندہ تھا مگر امینہ کی کھلتی مسکراہٹ میں محرومی کا کوئی تاثر نہ تھا وہ اکلوتے بھائی کی خوشی میں خوش رہنے والی ہستی تھی۔ رات تو وہ بریانی کے نشے میں مست رہا۔ صبح چڑھتے ہی اسے یاد آیا کہ یہ نعمتِ خداوندی چاشنی کے گھر سے آئی تھی جھٹ سے اس کے دماغ نے ترکیب سوجھا دی اماں سے شیخ صاحب کے بھیجے برتن لیے وہ اس کے گھر جانے کے لیے تیار تھا۔ دکانداری کے علاوہ ککھ کام نہ کرنے والے کی خود سے برتن لوٹانے کی پیشکش پر سب گھر والے حیران ضرور تھے مگر مشکوک قطعاً نہیں تھے کیونکہ ان کے نزدیک بھائی سے زیادہ نیک کوئی نہیں تھا اور شیخ صاحب کے گھر کے شیطانی ٹولوں سے ڈر کوئی نہیں تھا۔

''وہ اماں نے آپ کے برتن بھجوائے ہیں اور شکریہ بھی کہلوایا ہے۔''

بدقسمتی سے دروازہ شیخانی نے کھولا تھا۔ اس نے منمناتے ہوئے شرافت سے عرض کی۔ گھر سے برتن خالی لایا تھا راستے میں اس نے پھل خرید کر برتنوں میں سجا دیا تھا۔ واپس لوٹاتے ہوئے دروازہ کے پار سے دکھتی چاشنی کو چور نگاہوں سے تکتا وہ لوٹ گیا تھا،

''بڑے وضع دار لوگ ہیں۔ خالی برتنوں کو بھر کے واپس بھیجا ہے۔'' شیخ صاحب کو دینے دلانے کی روایت نے بڑا متاثر کیا تھا، شیخانی نے پھل گننے شروع کر دیے تھے۔ چھ سیب ہیں اور چھ امرود ہیں۔ ایں کیلے سات کیوں ہیں۔ ایک زیادہ ڈال دیا ہو گا ریڑھی والے نے۔''

شیخانی کے تبصرے پر چاشنی نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک زائد کیلا دیکھ کر اس کی ہنسی بڑی خود ساختہ زوردار تھی۔ بے محل ہنسی پر اماں ابا نے گھورا ضرور تھا مگر وہ ذوق کی اس پختہ عادت پر محظوظ ہو کر ہنسی روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

☆......☆

''بھائی چار جماعتیں پڑھ لیتے تو گنتی آ جاتی۔''

بیس دن بعد چاشنی سابقہ مقصد کے ساتھ پھر

سامنے تھی۔ آج اس نے تیر چلایا تھا۔ ذوق کی زیر لب مسکراہٹ زندگی سے بھرپور تھی۔ وہ چاشنی کے چٹکلوں سے مزہ لیتا تھا مگر بھائی لفظ کی کڑوی گولی بھی مجبوراً نگلنی پڑتی تھی۔

"تم نے چار جماعتیں پڑھ لیں کیا؟ ٹیوشن دے دو مجھے حساب کا سبجیکٹ پڑھا دو۔" وہ منٹوں میں بے تکلف ہوا تھا اور فرمائشیں کرنے لگا تھا چاشنی بے اختیاری میں پھیل جاتی تھی اور غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً خود میں سمٹ جاتی تھی۔

"بھائی! جلدی کرو بچے شور مچا رہے ہوں گے ابا غصے میں ہوں گے۔"

آج خاص طور پر ابا کا ذکر کر کے چاشنی نے اسے جانے کیا جتلایا تھا۔ آج تو بھائی کا لفظ بھی خاصا جتا کے ادا ہوا تھا۔ ذوق کو اس کی معصومیت میں بھی سمجھداری صاف نظر آتی تھی۔ چاشنی کو سامنے پا کر اس کے ہاتھوں میں دم ہی نہیں رہتا تھا۔ مر مر کے شاپرز تیار کرتے۔ آج وہ کئی بار اس کے چہرے کو نگاہوں میں اتار چکا تھا۔ ہمتیں بڑھ رہی تھی۔ جسارتیں قدم بڑھا رہی تھیں۔ چاشنی کے ہاتھوں میں شاپر دیتے اس کی نازک انگلیوں کو ارادتاً چھوا بھی تھا۔ چاشنی نے بھی شاید کوئی بھید پا لیا تھا کیونکہ آج زائد شے لوٹانے وہ خود نہیں آئی تھی اپنے سے چھوٹے بھائی کو پیسے دے کر بھجوا دیا تھا جسے ذوق نے بڑے آرام سے شیشے میں اتار لیا تھا۔ پہلی بار زائد شے کے پیسے چندہ کے بکس میں نہیں گئے تھے وہ رشوت کے بطور اس کے بھائی کی جیب میں رہ گئے تھے۔ ذوق نے تعلق کی پٹڑی پر ٹرین کو دھکیل دیا تھا دیکھنا یہ تھا کہ ٹرین چلتی بھی کہ نہیں۔

☆......☆

دن پر لگائے اڑ رہے تھے۔ ذوق کی دکانداری میں پختگی آگئی تھی۔ ابا سے ہوئے معرکوں میں کمی واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ ذوق نے ادھار بند ہے کا اشتہار جو لگا دیا تھا۔ سو منافع کی شرح ابا کو مطمئن کر دیتی تھی۔ چاشنی کی دکان پر آمد بہت کم ہو گئی تھی۔ امینہ کے ذریعے اسے پتا چلا تھا کہ اس نے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ سارا گھر سنبھالتی تھی اور بچوں میں لگی رہتی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی سامان خریدنے آتا تھا ذوق کی عادت جوں کی توں تھی۔ زائد شے اب بھی چاشنی کے دربار میں جاتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ تب چاشنی اس کی قیمت دیئے ضرور آتی تھی اور اب وہ شے بناء قیمت کے قبول کر لی جاتی تھی۔ ایک روپے کی ایک معمولی شے نے ایک بڑے کھیل کی ابتداء کر دی تھی۔ چاشنی محلے بھر کے کپڑے بھی سلائی کرنے لگی تھی امینہ کو اس کی سلائی پسند تھی اور باقی درزیوں کے مقابلے میں کم پیسے لینے کا فائدہ بھی حاصل تھا۔ یہاں بھی ذوق کی عادت برقرار تھی۔ ہمیشہ سلائی کے تین سو روپوں کے ساتھ دس روپے ایکسٹرا ڈال کر چاشنی کے بھائی کو دیتا تھا۔ چاشنی اصل قیمت شیخانی کے ہاتھ پر رکھتی تو زائد روپے اپنے روپے جمع کرنے کے بکس میں ڈال دیتی اسے بھی اب ذوق کی اس عادت کی گویا عادت سی ہو چلی تھی۔

کچھ کہا نہیں گیا تھا کچھ سنا نہیں گیا تھا اور حکایت بیان ہوتی جا رہی تھی منزل دھندلی تھی۔ مسافر کمزور مگر ٹرین گھسک گھسک کے چلتی جا رہی تھی یہ جانے بنا کہ آخر اسٹیشن ہے کون سا؟

☆......☆

آج کے دن غیر متوقع ملاقات نے اس کے دل کی کلی کھلا دی تھی۔ محلے میں واحد ان کا گھر تھا جہاں گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔ شیخ صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ محلے والوں کی ایما پر ذوق انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر مقامی اسپتال لے گیا تھا۔

کارڈیک اٹیک تھا۔ ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ شیخانی تو خود کو سنبھال لیتی تو بہت تھا واحد بڑی ہستی چاشنی اسپتال میں موجود تھی اور اسے دیکھنے کی چاہ لیے زمانے بھر کا ہمدرد ذوق بھی اس کے شانہ بشانہ تھا اگرچہ دکان بے وقت بند کرنے پر ابا سے اچھی خاصی لے دے ہوئی تھی مگر وہ یہ نادر موقع گنوانے کو تیار نہیں تھا۔

علاج کے سارے انتظامات چاشنی کی بھائی کی آمدن سے بخوبی حل ہو رہے تھے مگر اسے اسپتال میں کھانا اور چائے مہیا کرنے کی ذمہ داری از خود ذوق نے اٹھا رکھی تھی۔

چاشنی چائے پیتی نہیں تھی مگر ذوق جب لا کر دیتا تو از رائے تشکر لے لیتی اور آدھا کپ پی بھی لیتی۔ شیخ صاحب کو پھیکی چائے دینے کے بعد وہ اس کے لیے شکر ڈالتا وہ ایک چمچ کہتی مگر وہ ایک چوتھائی چمچ ایکسٹرا ڈال دیتا چاشنی اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پاتی تھی۔ عجیب عادت تھی اس کی وزیٹنگ آور میں اس کے گھر کے افراد ملنے آئے تھے ننھے شیطانوں کو دیکھتے ہی وہ جان گیا کہ اب چاشنی کی پریڈ شروع ہو جائے گی۔ وہ فوراً منظر سے ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر میں لوٹا تو حسب توقع منظر سامنے تھا وہ سیڑھیوں پر دیوانہ وار انہیں پکڑنے کے لیے دوڑ رہی تھی۔ ذوق نے فوراً سے بیشتر ہاتھ میں تھامے ریپرز بچوں کو تھما کر مصروف کر دیا تھا۔ چاشنی آخری سیڑھی پر پاؤں تھامے بیٹھی تھی۔ ذوق پاس چلا آیا۔ اس کے پاؤں پر بھاگم بھاگ میں کسی بچے کا ناخن لگ گیا تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ ذوق کی پھرتی قابل دید تھی۔ میڈیکل اسٹور سے سنی پلاسٹ لا کر اس کے پاؤں پر چپکا دیا تھا۔ وہ اس کی ممنون تھی جو اخلاقیات کے یا انسانیت کے جانے کون کون سے اصول نبھا رہا تھا۔ اسے سہارا دینے کے لیے جھجکتے ہوئے ذوق نے ہاتھ بڑھایا تھا مگر چاشنی ایسی بے تکلفی کی روادار نہ تھی۔ سر جھکائے آگے بڑھنے لگی تو ذوق نے اس کی جانب ایک اور سنی پلاسٹ بڑھا دیا تھا۔ وہ یہاں بھی ایکسٹرا دینے سے باز نہیں آیا تھا۔ چاشنی کے مسکراہٹ ضبط کرتے لب دیکھ کر وہ کھل اٹھا تھا اور وضاحت دینے لگا۔

"وہ میں نے سوچا اگر ایک نے کام نہ کیا تو دوسرا......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وضاحت بے کار تھی۔ چاشنی کے لیے اپنے جذبات کے اظہار کی ایک انوکھی راہ نکالی تھی اس نے وہ نگاہوں سے پیام نہیں دیتا تھا اور نہ ہی زبان سے حال دل بیان کرتا تھا مگر اس کی ایک وکھری عادت نے اس کی عرضی چاشنی کے دل کے پوسٹ بکس میں ارسال کر دی تھی اور چاشنی کی نرم مسکراہٹ نے وصولی کی رسید بھی کاٹ دی تھی۔

☆......☆

جان نثار دکاندار اور معصوم خریدار کا بے غرض لین دین جاری تھا مگر پہاڑوں کی تہہ میدانی زمین اور محبت کے آسمان پر زلزلے بھی بتا کر نہیں آتے، فریقین خواب خرگوش میں گم ہوتے ہیں اور تباہی سر پر آن بیٹھتی ہے۔ کتنی معمولی سی عادت تھی اس کے نزدیک کہ وہ اظہار شوق کے تحت کوئی نہ کوئی زائد شے اس کے دامن میں ڈال دیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک عام حرکت تھی جس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ہمارے معاشرے اور روایات میں فرق پڑنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ سو فرق پڑ گیا تھا۔ وہ ایک عام سا دن تھا۔ کچھ دیر قبل چاشنی روز کی طرح خریداری کر کے گئی تھی۔ ایک ایسی زائد ثانی کے ساتھ جس کی قیمت اب وہ ادا نہیں کرتی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے۔ کب ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔ شیخ صاحب

چاشنی کو بازو سے گھسیٹ کر اس کی دکان تک لے آئے تھے۔ مغلظات اور لعن طعن کا شغل کرتے ہوئے چاشنی کے بکھرے بال اور لال سرخ چہرہ خطرے کا الارم دے رہے تھے۔ ذوق لق دق اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

''سچ سچ بتانا ذاکر کے پتر یہ ٹافی اس نے تیری دکان سے چوری کی ہے یا تو نے خود اسے دی ہے جلدی بول۔''

شیخ صاحب کو اسپتال سے آئے مہینہ بھر ہو گیا تھا مگر ان کی دھواں چھوڑتی ناک کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انہیں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بچوں میں شاپر بانٹتے ہوئے وہ ایک بے ضرر زائد ٹافی ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ جس نے انہیں پتا نہیں کیا سوجھا دیا تھا کہ وہ آپے میں نہ رہے تھے۔ ذوق کے لیے عجب مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ چاشنی کے والد کو شبہ تھا کہ اس نے چوری کی ہے۔ اگر وہ خاموش رہتا تو چاشنی کو چوری کرنے کی سزا بھگتنی پڑتی اور اگر کہہ دیتا کہ اس نے خود دی ہے تو دونوں پر جانے کیا کیا الزام لگ جاتے۔ دونوں صورتوں میں چاشنی کے لیے اذیت تھی۔ ہاں ذوق کے لیے ایک صورت میں رہائی تھی کہ وہ خاموش رہے تب اس کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھتی، محلہ جمع ہو گیا تھا اور سب کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ سبھی کا تقریباً یہی خیال تھا کہ چاشنی نے چوری کی ہے اس کا باپ اسے اخلاقیات سکھانے کے چکر میں خود اخلاق سے عاری ہو گیا تھا۔ زمانے بھر کے سامنے بیٹی کو مجرم بنا کر جانے تربیت کا کون سا پل طے کیا جا رہا تھا۔ دنیا واہ واہ کر رہی تھی کہ شیخ نے اپنی بچی کی غلطی پر اچھی طرح تنبیہہ کی مگر بچی کے لیے زندگی کتنی کٹھن ہونے والی تھی اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔

ذوق کٹہرے میں کھڑا تھا اس کی گواہی پر چاشنی کا کیس منحصر تھا۔ چاشنی کے لیے تو سزا ہر دو صورت میں مقرر تھی۔ تو کیا ذوق کو خود کا دامن بچا لینا چاہیے تھا وہ شش و پنج میں پڑا تھا اور شیخ صاحب اور دیگر محلے داروں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ سچ بیان کیا جائے۔ نئی افتاد آ پڑی تھی ذاکر دین بھی شور سن کر آ گئے تھے اور اب کڑے تیوروں سے ذوق کو تک رہے تھے اگر وہ کہہ دیتا کہ زائد شے ڈالنے کی اسے عادت ہے تو اس عادت کے پس منظر اور محرکات کو بیان کرنے کے بعد ان گھورتے اباؤں سے کیسے نجات ملے گی؟

ذوق کو عقل نے آواز دی کہ خاموش رہے اس صورت میں زیادہ سے زیادہ چاشنی کو اس کے ابا ایک دو تھپڑ لگائیں گے اور بات آئی گئی ہو جائے گی مگر دوسری صورت میں دونوں کی اچھی خاصی درگت بنتی دنیا افسانے میں رنگ بھرتی اور لعن طعن کی ایک نئی کہانی جنم لے لیتی۔ مگر ذوق اپنے دل کا کیا کرتا جو چاشنی کو تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

''بولتا کیوں نہیں ہے تو گونگ لگ گئی ہے تیرے منہ کو کیا یہ روز تیری دکان سے چوری کرتی ہے۔''

ذاکر دین نے اسے اچھا خاصا جھنجھوڑ دیا تھا اور زبردستی بات کو مزید سنسنی خیز بنا رہے تھے۔

''چاہے یہ میری اولاد ہے مگر اس نے چوری کی ہے تو میں اسے سزا ضرور دوں گا۔'' شیخ صاحب اپنی دانست میں ایک قابل فخر کردار ادا کر رہے تھے۔ سینہ ٹھونک کر مردانہ وار بولے۔

''بول دے اس نے چوری کی ہے۔''

''نہیں۔'' ذاکر دین کے اصرار پر اس کے منہ سے نکلا تھا مجمع پر خاموشی طاری ہو گئی تھی چوری نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟

''اس نے چوری نہیں کی میں نے خود ایک ٹافی زائد ڈال دی تھی محلے دار سمجھ کر۔''

اس کی آخری بات کو محلے والے کیا درست مانتے، کیونکہ یہ مہربانی اور کسی محلے دار پر کب کی تھی

اس نے اور پہلی بات سے تو چہ میگوئیوں کو راہ مل گئی تھی۔ ایک مرد دکاندار کی ایک خاتون گاہک کو زائد شے دینا خواہ وہ ٹافی کیوں نہ ہو کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ وہ دونوں تو شاید اچھی طرح نہ جانتے ہوں مگر جہاندیدہ افراد کے لیے سمجھنا دشوار نہ تھا۔

☆......☆

ایک لمحہ جو تبدلِ حیات کے لیے مختص ہے جس کے بارے میں صدیوں سے سنتے آئے ہیں چاہے وہ الف لیلیٰ کی داستان ہو یا ایڈونچر ناول ایک لمحہ زندگی بدلنے کا موقع ضرور دیتا ہے اور نصیب متعین کرتا ہے کہ وہ لمحہ سنوار سے بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے۔ یا بگڑی کو بنا دیتا ہے جلد یا بدیر وہ لمحہ ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے اور اس کی زندگی میں بھی وہ لمحہ اچانک بنا آہٹ بنا دستک کے آ گیا تھا۔

اس ایک لمحے نے سفرِ حیات متعین کر دیا۔ چاشنی غیر معمولی کوئی اپسرا نہیں تھی عام شکل وصورت کی سادہ مزاج لڑکی تھی ذوق آوارہ صفت تھا نہ مادر پدر آزاد، دو خاندانوں کے رائج نظام میں گندھے وہ دونوں عام سی زندگی گزار رہے تھے ہوا کا رخ بدلا اور دیکھنے کا انداز بھی۔

ذوق کو چاشنی کی معصومیت بھا گئی جذبات ادائیگی کے لیے مچلے تو ذہن نے ایک نئی راہ نکال لی چاشنی شاید وہ زائد شے استعمال بھی نہ کرتی ہو شاید پھینک دیتی ہو مگر وہ اپنی حرکت مستقل مزاجی سے نبھانے لگا۔ مقصود یہی تھا کہ اسے جتلائے کہ وہ اس کے لیے باقی سب سے الگ ہے۔ وہ اسے ایسے نہیں دیکھتا جیسا باقی گاہکوں کو دیکھتا ہے۔ صرف اتنی سی کہانی تھی ابھی تو اس نے خود میں جھانک کے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ ابھی تو محبت چاہت کے لفظ اس نے سیکھے بھی نہیں تھے۔ سکھانا تو دور کی بات تھی ابھی تو صرف چاشنی نے اس کی عادت سے سمجھوتہ کیا تھا۔ نادان کہہ کر یا بدھو کہہ کر وہ اس کی وکھری عادت پر کھلکھلانے لگی تھی۔ کب انہوں نے ایک دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں باتیں کی تھیں کب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر حکایتِ دل بیان کی تھی۔ دعوے قسمیں نہ ہوئی تھیں مستقبل کے سہانے سپنے دیکھنے شروع نہیں کیے تھے۔ موبائل پیکیجز کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ سنگ جینے مرنے کے دعوے نہیں ہوئے تھے کہ یکا یک لمحۂ فیصلہ بیچ چوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

ذوق اور چاشنی عشق کے سمندر میں اترے بھی نہ تھے کہ ساحل نے دامن چھڑا لیا تھا۔ کیا کرتا ذوق جب سڑک پر عدالت لگ گئی تھی کچھ نہ کہتا تو بات وہیں جا پہنچتی جہاں سے چلی تھی۔ چاشنی اپنے گھر واپس لوٹ جاتی اس کا باپ چوری کی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرتا۔ آئندہ سے وہ اس کی دکان پر نہ آتی محلے والے اپنے کام دھندوں میں لگ جاتے اور بس قصہ ختم۔

وہ پھر سے چاشنی کے چھوٹے بھائی کے ذریعے اپنی عادت کو جاری رکھتا کچھ عرصے بعد چاشنی کے ابا کا غصہ کم ہوتا یا گھر والے بھول جاتے کہ ہوا کیا تھا تو شاید بات آگے بڑھ جاتی اور روایتی انداز میں ان کی شادی بھی ہو جاتی مگر نہیں یہ سب مفروضات تھے وہ خیال تھے جن میں زبردستی کے رنگ بھرے جا رہے تھے۔ حقیقت تو یہی تھی کہ اس نے تبدلِ حیات کے لمحہ کا فائدہ اٹھایا تھا اس نے اپنی ہمت کو آزمایا تھا۔ سڑک کی عدالت پر وہ کہا تھا جو سچ تھا لوگوں کی آنکھوں میں استہزاء تھا۔ نفرت تھی بدکاری کے طعنے تھے اباؤں کے ہاتھ میں لغزش تھی اور نگاہوں میں شعلے۔

شیخ صاحب جتنے تن فن کر کے آئے تھے جاتے ہوئے اتنے ہی بوجھل قدم تھے چاشنی کی آنکھوں میں شکوہ تھا نہ تشکر وہ بنجر دکھتی تھی۔ کچھ کہ وہ کچھ نا کردہ کی پاداش میں معتوب ٹھہری تھی۔ ذاکر دین

نے دکان کا شٹر گرا کر آج زبان سے نہیں ہاتھ سے گولے برسائے تھے۔ سب ویسا ہی ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا نہ توقع کے خلاف نہ استطاعت سے زیادہ۔

اگر کچھ ہوا تھا تو قسمت کا فیصلہ ذوق کی ایک لحہ کی ہمت نے کئی سالوں کی بزدلی کو شکست دے دی تھی۔ محلے میں سرخرو رہنے کے لیے ذاکر دین نے وہ فیصلہ کرلیا تھا جو شیخ صاحب کی بھی ضرورت تھی۔ دو ماہ کی ذہنی اور جسمانی اذیت کے بعد راہ مل گئی تھی بڑوں کو بات بنانے کی۔

چاشنی سرخ پیرہن میں لرزاں پھول بنی ذوق کے کالر کی زینت بن گئی تھی۔ بے منزل ٹرین کو آدھے ہی سفر میں خود بخود منزل آن ٹکرائی تھی۔ صرف ایک ہمت کا ٹکٹ کٹانے پر۔

''دل چاہتا ہے تمہیں مفت میں دل دے دوں
اتنے معصوم خریدار سے کیا لینا دینا''

ذوق کی شاعرانہ آمد ہوئی تھی۔ ایمنہ نے دروازے پر سوال کیا تھا کہ ایک اچھے دکاندار کی طرح اپنی معصوم خریدار سے حق مہر پہلے سے طے کرلے جس کا جواب اپنے انداز میں دیتا ہوا وہ چاشنی کے پہلو میں آن بیٹھا تھا۔ جس کی زیرلب مسکان گھونگھٹ کی آڑ سے دکھائی دے رہی تھی۔

''کیوں جی تم سے کچھ لیتا دیتا اچھا لگوں گا؟''

ذوق نے گھونگھٹ الٹنے کے بجائے گرا ہی دیا تھا نوخیز کلی سامنے تھی تو تلاطم شدہ جذبات بھی زوروں پر تھے۔

''لیکن مجھے تو چاہیے حق بھی اور زائد بھی۔''

چاشنی کی گل باشی اسے نہال کر گئی۔ بہت کم اس سے تکلم کا موقع ملا تھا مگر جب بھی اس نے کچھ کہا تھا اسے انوکھا ہی کہا تھا۔ جیسے کہ اب کی فرمائش اس سے سمجھ آئے بھی نہ آئی تھی۔

''مطلب حق مہر کے ساتھ منہ دکھائی دے تو رہا ہوں اور زائد کیا دوں؟'' ذوق منجھے ہوئے دکاندار کی طرح گویا تھا۔ نگاہیں اس کے وجود پر پیوست کیے بانہوں کا گھیرا اس کے گرد تنگ کیے وہ زائد پیار دے بھی رہا تھا اور وصول بھی کر رہا تھا۔

''عادت بگاڑ دی ہے آپ نے، اب کچھ بھی مکمل نہیں لوں گی ہر چیز میں زائد......'' چاشنی پراعتماد تھی وہ اس کے عشق میں فنا نہیں تھی مگر اس کی ہمت پر فدا ہوگئی تھی اس نے ساتھ نبھانے کا وعدہ نہیں کیا تھا مگر ساتھ نبھایا تھا۔

ذوق زائد پر زائد دے رہا تھا۔ وہ فرمائش کرکے بوکھلا گئی تھی۔ کہنا اور مانگنا جتنا آسان تھا بھگتنا اتنا ہی مشکل، ذوق اسے خود میں سموئے ایسے بکھیر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ ڈھیروں مسرتیں بھی اس کی بانہوں میں چلی آئی ہوں اور پھولوں کی طرح بکھر گئی ہوں۔

''چاشنی! میں تو تمہیں دل بھی اکیلے نہ دوں ساتھ میں زائد شے دوں گا۔''

''کیا......؟''

ذوق کی سرگوشی پر اس نے متعجب ہوکر کہا تھا بھلا دل کے ساتھ ایکسٹرا کیا ہوسکتا تھا نانی اور مٹھائی تو ہونے سے رہی۔

''اپنی جان۔'' ذوق اپنی جان پر اپنی جان وارنے کو تیار تھا۔ چاشنی کہنا چاہتی تھی کہ اس کی جان فاضل نہیں اس کے لیے بہت قیمتی ہے مگر کیسے کہتی؟ جذبات ذوق پر حاوی تھے اور وہ خود چاشنی پر کہنے سننے کا وقت گزر گیا تھا۔ ان کی لو اسٹوری شارٹ کٹ سے مکمل ہوگئی تھی۔ جس افسانے کو انجام کے لیے پاپڑ بیلنا تھا، انہیں ایک لحہ کی عطا نے خوشگوار اختتام دے دیا تھا۔ منزل خود مسافر کے پاس آگئی تھی۔

......☆......

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین

افسانہ

شکستہ آرزو

''آنٹی! کیا میں گندی ہوں؟'' دعا نے اپنی توتلی زبان میں پوچھا۔

''نہیں بیٹے! آپ تو بہت اچھی ہو''۔ میں نے دعا کو گود میں بٹھاتے پیار سے کہا۔



''تو ماما مجھے کیوں گندی کہتی ہیں؟ اور کہتی ہیں کہ میں بدصورت اور منحوس ہوں، جبکہ ایمان (دعا کی چھوٹی بہن) اور شاذل (دعا کا بھائی) خوبصورت اور ذہین ہیں''۔ دعا نے ایک بار پھر روتے ہوئے مجھے کہا اس کی بات سن کر میرا دل دہل گیا۔

''یہ فائزہ بھابھی اس معصوم، ننھی پری کے ذہن کو اس طرح کی زہریلی باتیں کر کے آلودہ کر رہی ہیں کیا ہوگیا ہے ان کی سوچ کو؟ میں تو انہیں کافی سمجھدار اور باشعور خاتون سمجھتی تھی، نہیں مجھے ان کی سوچ کو بدلنا ہوگا، ورنہ دعا احساس کمتری اور نفرت کی فضا میں پروان چڑھ کر ایک اعتماد سے عاری اور باغی بچی کا روپ دھار لے گی''۔ میں نے دعا کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ 6 سالہ دعا اب میری گود میں چاکلیٹ کھاتے کھاتے سوگئی تھی، مجھے اس معصوم فرشتہ پر ٹوٹ کر پیار آیا اس کی ذہانت سے چمکتی شریر آنکھیں جب اپنی توتلی زبان میں مجھے آنٹی کہتیں، اپنے اسکول کی ٹیچرز کی نقل کرتی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ مانا دعا اپنے باقی بہن بھائیوں میں کم صورت اور گندمی مائل رنگت کی مالک تھی، مگر اس کی ذہانت اور معصومیت اسے ایک خاص روپ دیتی ہر کسی کو اس پر ٹوٹ کر پیار آتا، وہ زیادہ



وقت میرے ساتھ ہی گزارتی تھی مجھے بھی اس ننھی پری میں اپنا بچپن نظر آتا، ان تین مہینوں میں اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ میں نے اسے ماتھے پر پیار کیا جس پر اس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ آرام سے اسے لٹا کر میں فائزہ بھابھی کے پورشن میں چلی آئی۔ بھابھی شاید ابھی نہا کر نکلی تھیں ان کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔

"السلام علیکم بھابھی!" میں نے انہیں سلام کیا جس کا انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوشدلی سے جواب دیا۔

"ارے آؤ، آؤ سحرش، بہت دن بعد چکر لگایا"۔ انہوں نے برآمدے میں ہی پیڈسٹل فین چلاتے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صبح سے لائیٹ گئی ہوئی تھی اور اب شام کے وقت تھوڑی گرمی کی شدت میں کمی تھی، برآمدہ کھلا اور روشن ہونے کی وجہ سے آتی ٹھنڈی ہوا دل ودماغ کو سکون پہنچا رہی تھی۔

"بس بھابھی؟" "آپ کو تو معلوم ہے میری جاب کا، اسکول سے آنے کے بعد اتنا تھک جاتی ہوں پھر گھر کے کام اور شام میں کوچنگ، پھر ہمت ہی نہیں ہوتی"۔ میں نے مسکرا کر وضاحت دی۔

"ہوں! واقعی تم ایک باہمت اور پراعتماد لڑکی ہو، مجھے تو تم پر رشک آتا ہے"۔ فائزہ بھابھی نے خوشدلی سے جواب دیا، جس پر میں نے دل میں اٹھتی اذیت کی لہر کو بمشکل دبایا انہیں نہیں معلوم تھا کہ مجھ جیسی کامیاب لڑکی کے پیچھے ایک ناکام اور نافرمان بیٹی کا مسخ شدہ چہرہ ہے، جو اس کے خونی رشتوں کی مرہون منت ہے۔

"دعا تمہاری طرف گئی ہوگی، ارے عاجز آ گئی ہوں اس لڑکی سے، باقی دونوں بچے مجھے اتنا تنگ نہیں کرتے، جتنا اس دعا نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ پتہ نہیں شکل اور عادت میں یہ کس پر چلی گئی ہے، آج بھی ضد کر رہی تھی کہ مجھے ایمان کی طرح ریڈ فراک دلائیں، جس میں سلور ستارے ٹکے ہیں، اب تم ہی بتاؤ، سحرش! دعا کی دبتی رنگت پر ریڈ کلر سوٹ کرے گا؟ بس اسی پر میں نے ڈانٹ دیا تو منہ پھلا کر تمہاری طرف چلی گئی"۔ فائزہ بھابھی نے ہمیشہ کی طرح بیزاری سے دعا کی شکایت لگائی، مگر آج ان کا اس طرح دعا کے بارے میں تضحیک آمیز لہجہ سن کر میرے سارے زخم ہرے ہونے لگے، ان پر جمی کھرنڈ آہستہ آہستہ ہٹ کر نفرت وذلت کے درو سے دوچار کر رہی تھی۔ فائزہ بھابھی شاید شربت بنانے چلی گئی تھیں اور میں اپنے تلخ ماضی کا سفر بڑی تیزی سے طے کر رہی تھی۔

"لو سحرش! شربت پیو گرمی بھی تو بہت ہے"۔ میں نے بے دلی سے ان سے گلاس لیا اور پھر انہیں اپنے ماضی سے روشناس کرانے کے لئے ہمت مجتمع کرنے لگی۔

"بھابھی! آج میں آپ کو اپنی کہانی سنانے جارہی ہوں، مجھے یقین ہے میری آپ بیتی سننے کے بعد آپ کا رویہ دعا کے ساتھ بدل جائے گا، مجھے معلوم ہے آپ اس کی ماں ہیں اور کوئی بھی ماں اپنی اولاد سے نفرت نہیں کرسکتی، مگر آپ کی خودساختہ نفرت اور احساس کمتری بچوں کی شخصیت کو عدم اعتمادی اور بغاوت کے زہر سے آلودہ کردیتی ہے"۔ فائزہ بھابھی نے چونک کر سحرش کی طرف دیکھا۔

"ہم پانچ بہن بھائی تھے، میں سب سے بڑی ہوں مجھ سے چھوٹی تین بہنیں اور بھائی ہیں، جو شکل وصورت، مزاج میں ددھیال پر گئے تھے، میری بہنیں بہت خوبصورت اور پیاری تھیں، جبکہ میں بالکل عام سی شکل وصورت کی مالک ایک بالکل عام سی لڑکی تھی۔ مگر میرا دل بہت خوبصورت تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنی والدہ کو بدصورتی کا طعنہ دیتے سنا۔ وہ مجھے بدصورت، بھدی جیسے لقب سے پکارتی تھیں، جس پر میں بھی دعا کی طرح رونے لگ جاتی اور ایک آس اور امید سے امی کی طرف دیکھتی کہ شاید وہ آکر مجھے گلے لگائیں، مجھے پیار کریں مگر آہستہ آہستہ میری آس اور امید ٹوٹنے لگی، بس میری والدہ کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی اور کبھی کسی چیز کی کمی نہیں کی، مگر میری طلب مادی آرائش نہیں بلکہ ان کا پیار وشفقت تھا۔ کبھی کبھی وہ ممتا کے فطری جذبے سے مجبور ہوکر مجھے پیار کرتیں تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب لڑکی سمجھتی، میں تعلیم میں شروع سے ہی بہتر تھی، اسی طرح تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے میں نے بچپن سے شعور کی دنیا کی طرف قدم رکھا اب ان کے طعنوں اور نفرت آمیز رویوں

پر رونا نہیں آتا تھا، بلکہ میرے اندر ایک حساس اور کم گو لڑکی کی جگہ ایک بدزبان اور باغی نافرمان بیٹی نے جنم لینا شروع کردیا۔ اب اگر وہ مجھے کسی بات پر ڈانٹتیں، میری بے عزتی کرتیں، تو میں بھی پلٹ کر انہیں جواب دیتی، ان سے گستاخی کرتی۔ بعد میں مجھے احساس ہوتا تو گھنٹوں اللہ کے آگے روتی، گڑگڑاتی اپنے گناہوں کی معافی مانگتی، خود سے عہد کرتی کہ اب امی میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں، میں ان سے زبان نہیں چلاؤں گی، مگر اگلی بار پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوجاتی جس پر میرا صبر کا دامن لبریز ہوجاتا، اس طرح میری شخصیت تباہ ہونے لگی۔ میں اپنے اسکول میں اپنی دوستوں میں ایک خوش گفتار اور خوش اخلاق لڑکی مشہور تھی، اور گھر میں اس کے بالکل متضاد شخصیت کی مالک، جب گھر میں مجھے نفرت ملنے لگی تو باہر والوں سے محبت اور جھوٹی ہمدردی بٹورنے کے لئے میں ان کے ہر طرح سے کام آتی، ان سے میں اخلاق سے پیش آتی۔ میری بہنیں بھی کبھار میرے حق میں امی سے لڑتیں تو امی انہیں بھی ڈانٹ کر رکھ دیتیں، آہستہ آہستہ انہوں نے بھی مجھ سے ہمدردی کرنا چھوڑ دی، انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں میرے حق میں بولنے سے امی ان کے ساتھ بھی ناانصافی نہ کریں۔ لہٰذا اب وہ امی کے غلط رویے پر ان کا ہی ساتھ دیتیں، جس پر میں اور تنہا اور مایوس ہونے لگی امی کے ناروا سلوک کو دیکھتے میری سب سے چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ بدتمیزی کرنے لگی تھی۔ جو الفاظ امی میرے لئے استعمال کرتیں وہی تضحیک آمیز اور رکیک الفاظ میری چھوٹی بہن بھی مجھے کہتی۔ دن اسی طرح گزرتے گئے وقت کا بے رحم پہیہ زندگی کی سفا کی وخوشی کو روندتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ اب میں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی میں اپنے اندر بھرنے والے زہر کو اپنی شاعری اور ڈائری میں منتقل کرنے لگی، کوشش کرتی کہ امی سے کم سے کم سامنا ہوتا کہ کوئی تلخ کلامی نہ ہو۔ یہ سب بھی مجھے کسی نہ کسی طرح برداشت تھا، مگر اس دن میری قوت برداشت سلب ہوگئی، جب امی نے مجھ پر میرے ماموں زاد کے حوالے سے گھٹیا الزام لگایا، میرے کردار پر بہتان لگا کر میری ذات پر کیچڑ اچھالا۔ علی جو میرا ماموں زاد مجھ سے پانچ سال چھوٹا بالکل میرے بھائی کی طرح تھا، ماموں کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری اس پر آ گئی تھی۔ وہ باپ کی شفقت سے محروم تھا اور میں ماں کے ہوتے ہوئے ان کی ممتا سے محروم ہم دونوں کا مشترکہ درد ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا، میں اپنے دل کی ہر بات، ہر غصہ ہر انتقام اب اس سے شیئر کرنے لگی۔ وہ مجھے ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح سمجھاتا کبھی مجھے اس نے ورغلایا نہیں۔ مگر امی کو ہماری یہ بے ضرر سی دوستی بھی برداشت نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ بہتان باندھ کر مجھے میری نظروں میں گرادیا، مگر میں اپنے بھائی اور پاپا کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرا ساتھ دیا مجھ پر اعتبار کیا، اسی طرح زہریلی فضا میں پروان چڑھتے چڑھتے میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور جاب کرکے گھر کی ذمہ دار سنبھال لی۔ اب میں کوشش کرتی کہ فارغ اوقات میں بھی کوئی نہ کوئی پارٹ ٹائم جاب مجھے ملتی رہے بے شک جسمانی مشقت سے مجھے دوچار ہونا پڑے گا، مگر کچھ تو ذہنی سکون نصیب ہوگا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا میرا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا، مگر مجھ جیسے ڈھیٹ لوگوں کو موت بھی گلے نہیں لگاتی"۔ یہ کہہ کر سحرش خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، بھابھی نے تاسف سے اس ٹوٹی بکھری لڑکی کو دیکھا اس کے لبوں سے زبردستی شربت کا گلاس لگایا تھوڑی ڈھارس بندھی تو پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

"اگر میں کوئی بھی بات کرتی بالکل عام سی بات، جو عموماً گھروں میں ہوتی ہے، اس پر میری ماں اتنا فساد پھیلاتی کہ آخر تنگ آ کر میں بھی ان سے بدتمیزی پر اتر آتی اور میری بہنیں بھی ان کا ساتھ دیتیں، بھائی کبھی میری طرفداری کرتا کبھی امی کے حق میں ہوجاتا وہ تو لڑکا تھا باہر پناہ ڈھونڈ لیتا، مگر میں لڑکی ہونے کی بھاری قیمت ادا کر رہی تھی، کئی بار انہوں نے مجھے گھر چھوڑنے کا بھی حکم دیا مگر اپنی عزت وناموس کے تحفظ کے لئے بے غیرت بن کر رہتی رہی اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ ان

کے ہاتھ میں رکھ دیتی، میری آرزوئیں، خواہشیں تو احساس کمتری میں دب گئی تھیں۔ کبھی اچھی ڈریسنگ کرنے پر میری دوستیں اور اسٹوڈنٹ تعریف کرتے تو مجھے لگتا یہ لوگ بھی میری بدصورتی کا مذاق اڑا رہے ہیں، آہستہ آہستہ میں نے خود پر توجہ دینا چھوڑ دی۔ ایک مشینی، حساس سے عاری زندگی گزارنے لگی۔ مگر اب مجھ میں ایک اور منفی تبدیلی آئی کہ اپنی ماں کا دیا ہوا زہر، تلخ باتیں، نفرت وحقارت بھرا رویہ میں اپنی چھوٹی بہن پر انڈیلنے لگی، جس کی وجہ سے وہ بھی مجھ سے پہلے سے زیادہ گستاخی و بدتمیزی کرنے لگی۔ یعنی ایک میری والدہ کے غلط رویئے کی وجہ سے میرے ساتھ ساتھ باقی بہن بھائیوں پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ اس پر ستم ظریفی کہ میرا رشتہ نہیں ہو رہا تھا، جو بھی آتا وہ میری اعلیٰ تعلیم اور جاب کا سن کر پلٹ کر نہیں آتا، ان کے خیال میں جاب کرنے والی لڑکیاں شاید گھر نہیں بسا سکتیں۔ اس کا بھی مجھے طعنہ ملتا اور کہا جاتا کہ میری بدصورتی اور پختہ عمر کی وجہ سے کوئی رشتہ نہیں کرنا چاہتا مگر اللہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے، میں اللہ سے فریاد کرتی اپنا درد اس سے کہتی۔ وہ جو شہ رگ سے بھی قریب ہے، جو اپنے بندوں پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اپنے بندے کو تنہا نہیں چھوڑتا جس نے ہر جاندار کا جوڑا بنایا ہے، بالآخر میری کم مائیگی و احساس ذلت کی زندگی میں ایک ہوا کا جھونکا آیا۔ میری اندھیری قسمت کو ایک روشنی کی کرن نصیب ہوئی، میری پرنسپل کے توسط سے میرا رشتہ ایک اچھے اور شریف گھرانے میں ہو گیا، جس پر میری والدہ کو اطمینان ہوا تو مجھے بھی سکون ملا کہ شاید اب ان کی طنزیہ باتوں سے چھٹکارا مل جائے، شاید اب وہ میری جدائی کی وجہ سے مجھ پر محبت نچھاور کرنے لگیں، مگر جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے، ان کا تلخ رویہ واپس لوٹ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا مجھے اس گھر سے رخصت نہیں کیا جا رہا بلکہ میرے جنازے کو کندھا دیا جا رہا ہے۔ بالآخر بغیر ماں کی دعاؤں اور بہنوں کی شرارتوں کے خوشگوار یادوں کے بغیر میں رخصت ہو کر اس گھر میں آ گئی مجھے کوئی امید نہیں تھی اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے کوئی خوش گمانی نہیں تھی، جس لڑکی کو اپنے خونی رشتوں خاص طور پر ماں سے محبت و مان نہ ملا ہو، وہ غیروں سے کوئی اچھی امید نہیں باندھ سکتی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میرے ساتھ جتنا بھی برا سلوک ہو اپنی ماں کو اس سے بے خبر رکھوں گی۔ ورنہ وہ مجھے ہی طعنہ دیں گی کہ سسرال میں بھی اپنی بدزبانی کی وجہ سے جگہ نہیں بنا سکی۔ لیکن اللہ پاک واقعی بہت مہربان ہے، جس نے مجھ جیسی گستاخ اور نافرمان لڑکی کو اتنے محبت کرنے والے لوگ اور شوہر عطا کیا۔ آنٹی، آپ، اور ارسلان کی محبت میں، میں اپنی ماضی کو بھولنے لگی، آج بھی میں یہ تمام تلخ یادیں آپ کے سامنے عیاں نہ کرتی، اگر آپ بھی دعا کے ساتھ وہی سلوک نہیں کرتیں جو میرے ساتھ میری ماں نے کیا۔ پلیز بھابھی وعدہ کریں! دعا کی معصوم شخصیت کو اپنی نفرت وحقارت سے آلودہ نہیں کریں گی، اسے ایک اور سحرش نہیں بننے دیں گی۔ بھابھی اولاد تو سب برابر ہوتی ہے، خوبصورتی تو اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اگر کوئی عام صورت کا ہے تو اس میں اس بچے کا کیا قصور مگر ہم اپنے اچھے رویئے سے اس کے کردار کو تو خوبصورت بنا سکتے ہیں، جس کی دنیا مثال دے۔ آپ کو میری کامیاب زندگی پر رشک آتا ہے، مگر میں اندر سے کتنی ناکام اور شکستہ ہوں آج آپ کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا"۔ یہ کہہ کر سحرش بھابھی کے گلے لگ کر رونے لگی، بھابھی کی آنکھیں بھی نم تھیں بھابھی نے اسی وقت عہد کیا کہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک رکھیں گی۔

"دعا کے ساتھ ناانصافی نہیں کروں گی اس کی شخصیت کو مکمل اعتماد اور کامیاب بناؤں گی"۔ جہاں آرا بیگم جو سحرش کو اس کے پورشن میں نہ پا کر اسی طرف آ رہی تھیں، اندر سے آتی سحرش کی دردناک آواز سن کر باہر ہی رک گئیں، جیسے جیسے وہ اس کی باتیں سنتی جا رہی تھیں ان پر آگہی کا در وا ہو رہا تھا، انہوں نے نفرت وحقارت کی وجہ سے سحرش کی ذات میں ایک خلاء پیدا کر دیا تھا۔ جو شاید اب ان کی محبت بھی نہ بھر سکے۔ وہ وہیں سے شکستہ قدموں کے ساتھ واپسی کے راستے پر ہارے ہوئے مسافر کی طرح لوٹ گئیں۔

......☆......

حمیرا قریشی

افسانہ

محبت جرم تھا میرا



شام کے سائے تاریکی کی چادر میں مدغم ہونے لگے تھے، نیلگوں آسمان پر سیاہی پھیلنا شروع ہو چکی تھی، جگمگ کرتے بے شمار ستاروں کے جھرمٹ میں اکلوتا چاند علیبہ کی بے قراری کا مزہ لے رہا تھا۔ علیبہ بے چینی کے احاطے میں گھری مسلسل ٹہل رہی تھی۔ چھت پر تنہائی کے ہمراہ منتظر محبوب تھی، نگاہیں ہنوز برابر والی چھت پر لگی تھیں، کچھ لمحے سرکے تو نگاہوں کو یکدم قرار آیا۔ وہ دبے قدموں سے اسی کی سمت آرہا تھا۔ چھتوں کی دیوار آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ دیوار پھلانگ کر علیبہ کے روبرو آ کھڑا ہوا، نگاہیں مچل مچل کے محبوب کے دیدار سے سیراب ہو رہی تھیں۔

"کب سے انتظار کر رہی ہوں اتنی دیر لگا دی۔" علیبہ نے معصوم سا شکوہ کیا۔

"کھانا کھا رہا تھا، کھانا کھاتے ہی سیدھا تیرے پاس آ گیا۔ مجھے پتا تھا میری رانی میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔" عاشق بے باک نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔ علیبہ خود میں سمٹ کر رہ گئی۔

"میرے پاس آ دور کیوں کھڑی ہے۔" استحقاق سے بھرپور لہجہ تھا۔ بنا کسی جھجک کے اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ کاٹن کے میرون اور وائٹ سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ باریک شیفون کا ڈائی ہوا دوپٹہ شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ پشت پر بکھرے بال عائق کو مزید گستاخی پر اکسا رہے تھے۔

"یہ لے تیرے لیے لایا تھا۔" جیب میں سے پان اور چاکلیٹس نکال کر علیبہ کو دیتے ہوئے بولا۔ اس نے لینے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو عاشق نے مزید خود سے قریب کر لیا۔ اتنا قریب کہ کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ علیبہ کی سانسیں اس کی سانسوں میں گھلنے لگی تھیں۔ اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیے عالمِ مدہوشی میں اس کے چہرے سے چہرہ لگائے کھڑا تھا۔ علیبہ کی کمر پر رینگتا عائق کا ہاتھ احساسات کی دنیا میں ہلچل برپا کر رہا تھا۔ جذبے منہ زور ہوتے معلوم ہو رہے تھے۔ علیبہ مدہوشی میں بہکنے لگی تھی۔ عائق کا قرب اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔ دونوں نہ جانے کب تک اسی طرح ایک دوسرے میں الجھے رہتے، نیچے سے آتی دادی ماں کی نحیف آواز پر علیبہ چونکی جھٹ عائق سے جدا ہو گئی۔ شانے سے پھسلتا دوپٹہ برہنہ سر پر جما لیا۔

"آئی دادی ماں!" بے ترتیب سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے دقت سے بولی۔ عائق کی گستاخ نگاہیں ابھی بھی اس کے دلکش سراپے سے الجھی تھیں۔

"میں جا رہی ہوں دادی ماں بلا رہی ہیں۔" دھیمے لہجے میں بولی۔

"کتنا سرور آ رہا تھا تمہاری بانہوں میں، جی چاہتا ہے ساری عمر تمہاری بانہوں میں ہی گزر جائے۔" علیبہ مسکراتے ہوئے جانے کو پلٹی اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی گھنیری پلکوں میں جنبش ہوئی۔

"جانے دو عائق!" منت بھرے لہجے میں بولی۔ ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد ہوا تو دوڑتی ہوئی نیچے آئی سیڑھیوں کے عین وسط میں دادی ماں کھڑی تھیں۔

"کتنی بار تجھے کہا ہے علیبہ! رات میں چھت پر مت جایا کر پر تیری سمجھ میں نہیں آتا، خدانخواستہ کہیں کوئی آسیب پیچھے لگ گیا تو......" دادی ماں زیر لب آیۃ الکرسی پڑھ کر اس پر دم کرنے لگیں۔ اس بات سے بے خبر کہ آسیب تو بہت پہلے ہی پیچھے لگ چکا تھا۔

"پھولوں کی طرح تجھے پالا ہے، کیسے کانٹوں کے حوالے کر دوں؟ یہ محبت نہیں ہے، علیبہ! لالچ ہے اس گھر کا خواب اسے تجھے اپنانے پر اکسا رہا ہے تو سمجھ کیوں نہیں رہی میری بچی، محبت کے نام پر وہ بدبخت تجھے فریب دے رہا ہے تیرے نوخیز معصوم جذبوں سے کھیل رہا ہے چھل کر رہا ہے وہ، میں نے تو تجھے دھوپ میں پاؤں بھی نہ رکھنے دیا اور تو ہے کہ تپتے آسمان اور جھلستی زمین پر رول جانا چاہتی ہے۔ مجھے دکھ مت دے علیبہ یہ عمر دکھ سہنے کی تو نہیں ہے۔" دادی ماں گلوگیر لہجے میں بولیں۔

آنکھیں شدتِ غم سے بھیگی ہوئی تھیں۔ علیبہ کے معصوم چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی آنکھیں کھلے عام بغاوت کا نعرہ لگا رہی تھیں۔ دادی ماں کا دل دہل گیا۔

"علیبہ! پرانے درخت اور بزرگ دونوں ہی اپنے وجود سے فائدہ دیتے ہیں، بھلا میں تیرا برا چاہ سکتی ہوں۔ تیری خوشی سے عزیز مجھے کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ مگر تو آگ میں کودنا چاہتی ہے تو کیا میں تجھے کود جانے دوں، ارے بچے تو ہوتے ہی نادان ہیں۔ خاص کر لڑکیاں، نادانی میں نہ جانے کیا کچھ کھو بیٹھتی ہیں۔ پھر پچھتاوا حیات ناسور کی صورت دھڑکنوں میں پلتا ہے۔ ہر سانس میں کرب انڈیلتا ہے۔ تیری وفا کی بہت قدر ہے میرے دل میں علیبہ پر وہ محبت برباد ہو جاتی ہے جو غلط شخص کو سونپ دی جائے۔ تو سمجھ کیوں نہیں رہی۔"

"دادی ماں! چاہو تو میری جان لے لو پر میں شادی عائق سے ہی کروں گی۔ مر جاؤں گی میں اس کے بغیر بہت چاہتی ہوں میں اسے دادی کیسے سمجھاؤں آپ کو۔" علیبہ بے بسی سے بے بس ہو کر رو پڑی تھی۔

دو دن سے مسلسل بھوک ہڑتال کر رکھی تھی دادی کی تمام نصیحتیں قدموں تلے روند ڈالی تھیں۔ اس پر تو فقط محبت کا بھوت سوار تھا۔ دادی ماں جانتی تھیں محبت کا تعلق عقل کے بجائے جذبات سے زیادہ ہوتا ہے۔ شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے علیبہ کے پاس آ بیٹھیں۔ انتہائی کرب سہتے ہوئے شکست تسلیم کر لی۔

☆......☆

ہر دن عید اور ہر رات شب برأت تھی۔ علیبہ عائق کا ساتھ پا کر کھل اٹھی تھی لیکن پھر بہت جلد علیبہ کی آنکھوں پر بندھی محبت نام کی پٹی اتر چکی تھی۔ دادی ماں کی تمام باتیں سچ کا لبادہ اوڑھے علیبہ کے روبرو آ کھڑی ہوئیں اس کی نام نہاد محبت پر خوب قہقہے لگائے علیبہ دنگ رہ گئی تھی۔ عائق کے بدلتے رویے سے بدلتی زبان سے جو کل تک اسے جی جان سے چاہتا تھا آج وہ ہی اس کی ٹھوکروں کی زد پر تھی۔ ابلتے جذبات سرد پڑے تو دل دماغ کی دہلیز پر جا کر رو دیا۔ وقت کا کام گزرنا ہے۔ سو گزرتا گیا۔ وہ تپتے صحن میں پسینے میں شرابور ہوئے چٹنی پیس رہی تھی۔ سارا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ ننگے پیر تپتی زمین پر ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت پر، شاید وہ عادی ہو گئی تھی۔ آج ٹھیک دو دن بعد اسے روٹی نصیب ہوئی تھی۔ وہ بھی چٹنی کے ساتھ۔ عائق کی پول پوری طرح کھل چکی تھی۔ آج کل وہ نئی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا۔ دن برے دوستوں کی صحبت میں برباد کرتا تو راتیں چھت پر علیبہ ہر رات گیلی لکڑی کی مانند سلگتی تھی۔ دادی ماں بہت شدت سے یاد آیا کرتی تھیں۔ پر وہ وہاں جا چکی تھیں۔ جہاں سے لوٹ کر نہیں آیا جاتا، اکثر عائق گھر سے غائب رہنے لگا۔ ہفتہ گزر جاتا تو بھی لوٹ کر نہیں آتا۔ علیبہ نے جو بویا تھا وہ ہی کاٹ رہی تھی۔ تپتی زمین بلکتے دو معصوم بچے بری طرح رو رہے تھے۔ دو بچے علیبہ کی محبت کی نشانی تھے۔ پروردگار نے اسے جڑواں بیٹوں سے نوازا تھا۔ بھوک کی شدت ان معصوموں کو رونے پر مجبور کر رہی تھی۔ علیبہ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے بچوں کی سمت آئی بچے ماں کا لمس پاتے ہی مزید بلک اٹھے۔ علیبہ دونوں کو سینے سے لگائے بلک اٹھی تھی، بچوں کا رونا اسے کند چھری سے ذبح کر رہا تھا۔ ناقابلِ برداشت دکھ وہ اپنی رگوں میں دوڑتا محسوس کر رہی تھی۔ محبت کے نام پر ملنے والا ہر گھاؤ علیبہ نے سہہ لیا تھا۔ پر ممتا پر پڑنے والے زخم اسے لہولہان کر رہے تھے۔ گہری اذیت سے دوچار کر رہے تھے۔ علیبہ نے محبت کی، انجام پایا پر ساتھ دو معصوم جانیں بھی رل گئی تھیں۔ علیبہ نے کہیں پڑھا تھا پر ایمان اب لائی تھی۔

کیونکر بسر ہو سکتی تھی حیات آسودگی سے
معمولی تو نہیں محبت جرم تھا میرا

......☆......



اے بے خبر

ریمل آرزو

افسانہ

رات کے ڈھائی بجے وہ دل میں ڈھیروں ارمان لیے سرخ گلابوں سے سجے خوشبوؤں سے مہکتے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے شاہانہ انداز سے براجمان اپنی نئی نویلی دلہن کو محوانتظار پا کر اس کے لبوں پر رقصاں مسکان مزید گہری ہوگئی۔ اس لمحے قدموں کی چاپ پر دلہن کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ اب اس کے پہلو میں آن بیٹھا تھا۔

''آداب بیگم صاحبہ!'' اس نے خوش دلی سے گفتگو کا آغاز کیا تو جواب بھی اسی کے انداز میں آیا۔

''تسلیمات!'' اس نے مسکرا کر اس کا نرم و نازک حنائی ہاتھ تھام لیا تو گھونگھٹ میں جھکا سر لاج سے مزید جھک گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک مخملی سرخ ڈبیا نکالی اور اس میں سے گولڈ کے دیدہ زیب کنگن نکال کر اسے پہنا دیے۔

''یہ آپ اپنی منہ دکھائی قبول کیجیے۔'' اس نے کہا۔

''مگر آپ نے تو مجھے ابھی دیکھا ہی نہیں۔'' وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے حیرت زدہ ہو کر معصومیت سے بولی تو اس کا بے ساختہ قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ جھینپ سی گئی۔

''جان ریان! آپ کو دل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے خیر کیسے لگے کنگن؟'' وہ اس کی کلائی تھام کر کنگن کو گھما کر مخمور لہجے میں بولا۔

''بہت اچھے۔'' وہ دھیرے سے کہتی ہوئی شرما کر مسکرا دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھایا وہ کرنٹ کھا کر ساکت و جامد رہ گیا۔ وہ جو اپنے سراہے جانے کی منتظر تھی۔ ریان کی حیرت کے سمندر میں ڈوبی گرج دار آواز پر بری طرح چونک کر لرز گئی۔

''تم...... کون ہو تم؟'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اس اچانک پیش آنے والی صورت حال پر بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔

''مم...... میں ہوں۔'' وہ بمشکل بول پائی۔ اپنے سامنے ایک اجنبی لڑکی کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر ریان کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

''بولو اب بولتی کیوں نہیں ہو کون ہو تم اور یہاں اس حلیے میں میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟'' وہ دھاڑا تو وہ مزید سہم کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''میں...... عن...... عنابیہ ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔

''شٹ اپ...... تم عنابیہ نہیں ہو۔ میں تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو بہت گھٹیا مذاق کر رہی ہو۔'' ریان کا مارے غصے کے برا حال ہو رہا تھا اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''میں...... میں مذاق نہیں کر رہی۔ خدارا میرا یقین کیجیے میں ہی عنابیہ ہوں۔ آپ کی بیوی عنابیہ ریان۔''

''بکواس بند کرو۔ ابھی اور اسی وقت میرے کمرے سے نکلو۔'' ریان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا اس نے اس کی کلائی تھامی اور اسے کمرے کے دروازے کی جانب گھسیٹا اور کمرے سے باہر دھکا دیا اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ دھکے کے باعث وہ دور جا گری تھی۔ اس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ کر کلائی میں پیوست ہو کر کلائی کو زخمی کر گئیں تھیں وہ ہمت کر کے اٹھی اور اپنا بھاری بھر کم لہنگا سنبھالتے ہوئے دروازے تک آئی اور روتے بلکتے دروازہ پیٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"پلیز ریان! دروازہ کھول دیں، میرا یقین کریں میں ہی عنابیہ ہوں۔ خدارا میری بات سنیں۔ میرا نہیں تو گھر والوں کا ہی خیال کریں، وہ سب کیا سوچیں گے۔ خدا کے لیے آج کی رات کمرے میں پناہ دے دیں۔ دروازہ کھول دیں ریان پلیز ریان۔"

وہ بے تحاشا روتے ہوئے پاگلوں کی طرح اس ستمگر سے فریاد کر رہی تھی مگر وہ سن ہی کب رہا تھا اس کے چاروں طرف تو صرف ایک ہی لفظ کی بازگشت تھی۔

"دھوکا...... ریان سے دھوکا۔"

☆......☆

دادی جان تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے اٹھیں تو ان کا گزر ریان کے کمرے کے سامنے سے ہوا تو وہ سامنے کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو ساکت رہ گئیں۔ سامنے فرش پر ان کی لاڈلی پوتی عنابیہ بے ہوش پڑی تھی۔ ان کے قدموں تلے زمین نہ رہی انہیں اپنی نظر پر یقین نہ آیا وہ دوڑ کر عنابیہ کے قریب آئیں، دادی جان نے سب گھر والوں کو شور مچا کر اکٹھا کر لیا تھا سب ہی لوگ آنکھیں ملتے ہوئے عنابیہ تک پہنچ گئے تھے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ عنابیہ کو پانی کے چھینٹوں سے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی مگر رائیگاں گئی۔ عنابیہ کو اس کی چچا زاد بہن عنبر اپنے بھائی احمر کی مدد سے اس کے کمرے تک لے گئی۔ پھر سب کو ریان کا خیال آیا، وہ ہی بتا سکتا تھا اس معاملے کی وجوہات مگر جب اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی گئی تو وہ بنا کچھ کہے سنے گھر سے نکل گیا اس کے تیور بتا رہے تھے کہ معاملہ سنگین ہے۔ مہمانوں سے بھرا گھر، شام کو ولیمے کی تقریب، بخار میں تڑپتی بے ہوش دلہن اور دلہا غائب، ایسے حالات میں مارے پریشانی کے سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ریان سے رابطے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ فی الحال اس کی کہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ ریان کو اپنی شادی کے سلسلے میں پاکستان آئے ہوئے ابھی چند روز ہی تو ہوئے تھے۔ اس کی یہاں کسی سے کوئی جان پہچان بھی نہ تھی جہاں سے اس کی خیریت کی کوئی اطلاع مل سکتی، رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ دادی جان عنابیہ کے سرہانے بیٹھی قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھیں۔ دادی کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ عنابیہ کو ہوش آ گیا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ گلاب کی کلی مرجھا کر زرد پڑ گئی تھی۔

"شکر ہے میرے مالک۔" تشکر سے دادی جان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

"میری گڑیا کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وقار حسن اپنی اکلوتی بیٹی کے بال سہلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے اور وہ ان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے نقاہت سے بولی۔

"بابا جان! دادی اماں آپ مجھے بتائیں۔" وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

"جی دادی کی جان بولو کیا بات ہے؟" دادی نے پیار سے کہا۔ عنابیہ کے ہوش میں آنے کا سن کر گھر کے باقی لوگ بھی کمرے میں آ گئے تھے سوائے اس کے تایا ابرار حسن کے وجہ شرمندگی تھی جو انہیں اپنے بیٹے ریان کی وجہ سے اٹھانی پڑ رہی تھی۔

"دادی اماں! میں...... میں عنابیہ ہوں ناں۔"

عنابیہ کی یقین و بے یقینی کی کیفیت میں درد میں ڈوبی بھیگی آواز کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔ سامعین کو اس کی دماغی حالت پر شبہ گزرا وہ سب یہی سمجھے صدمے کی وجہ سے ایسا بول رہی ہے مگر صدمہ کس بات کا ہے وہ ابھی تک اس بات سے انجان تھے۔ ڈاکٹر نے بھی منع کیا تھا کہ ابھی فی الحال عنابیہ سے ایسی ویسی کوئی بات نہ کی جائے۔

"ہاں میری چندا تم میری پیاری سی شہزادی عنابیہ ہو۔ اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے آرام کرو۔" دادی جان نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تو دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر تکیہ بھگو گئے۔

"عنابیہ! یہ سب کیا ہو گیا؟" عنبر نے نرمی سے

اس کا ہاتھ تھام کر فکرمندی سے کہا تو عنابیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور ایک کہر آلود نگاہ عنبر اور احمر پر ڈال کر رخ پھیر لیا۔

"دادی اماں! ان سے کہہ دیں یہ دونوں یہاں سے چلے جائیں میں ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" عنابیہ نے کہا اور وہاں موجود تمام افراد کو حیرت نے گھیر لیا۔

"عنابیہ! ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ عنابیہ بیٹا کیا ہوا ہے؟" وقار حسن اس سے استفسار کر رہے تھے اور عنبر اور احمر کا رنگ فق ہو رہا تھا چچا چچی بھی بے چین ہوئے تھے۔

"بابا جانی! میرے ساتھ جو بھی ہوا ہے ان دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان کے ایک مذاق نے میری زندگی کو مذاق بنا دیا ہے۔ تماشا بن گئی ہوں سب کے سامنے کہیں کا نہیں چھوڑا انہوں نے مجھے میری ساری خوشیاں چھین لیں۔ میں کبھی معاف نہیں کروں گی انہیں۔ کبھی بھی نہیں۔" عنابیہ بولتے بولتے بے حال ہو کر زار و قطار رونے لگی تھی۔ دادی سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ عنبر اور احمر کو تو سانپ سونگھ گیا تھا۔

☆......☆

حسن ہاؤس کی سربراہ بیگم عذرا حسن جب شدید علیل ہوئیں تو ان کو اپنے بڑے صاحبزادے ابرار حسن کی یاد شدت سے ستانے لگی۔ ابرار حسن کا داخلہ وہ بیس بائیس برس قبل حسن ہاؤس بند کر چکی تھیں کیونکہ جب عذرا بیگم نے اپنے سرتاج حسن احمد کی وفات کے بعد ابرار حسن کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجا تو انہوں نے وہاں اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ رچا لیا جب کہ ابرار حسن کی نسبت اپنی خالہ زاد ستارہ سے طے تھی۔ عذرا بیگم اس قدر ابرار حسن سے ناراض ہوئیں کہ دوبارہ کبھی بھی ان کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھا لی۔ ان کے چھوٹے بیٹوں وقار حسن اور حماد حسن نے ماں کو بہت سمجھایا مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی۔ بہن اور بھانجی کی محبت کے سامنے انہیں کچھ دکھائی نہ دیا تب ہی انہوں نے اپنی بھانجی ستارہ کی شادی اپنے منجھلے بیٹے وقار حسن سے کر دی مگر عذرا بیگم کو اپنی لاڈلی بہو ستارہ کا ساتھ زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوا ستارہ اپنی بچی کو جنم دیتے ہوئے چل بسیں تھیں پھر عذرا بیگم نے ہی اس بچی کی پرورش کی جس کا نام وقار حسن نے عنابیہ رکھا تھا۔ وقار حسن نے دوسری شادی نہ کی انہوں نے اپنی زندگی اپنی بیٹی عنابیہ کے نام کر دی تھی۔ کچھ عرصے بعد حماد حسن کی بھی شادی ہو گئی سائرہ بہت اچھی بہو ثابت ہوئی تھی خدا نے انہیں دو پھولوں سے نوازا تھا احمر اور عنبر کی صورت میں حسن ہاؤس کے مکین اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے بظاہر تو سب ٹھیک تھا مگر ابرار حسن کی یاد عذرا بیگم کو اندر ہی اندر کھائے جائے رہی تھی جو بھی تھا آخر وہ تھیں تو ماں، عمر کے آخری حصے میں آ کر وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں انہیں اپنی غلطی کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ ادھر ابرار حسن بھی تڑپتے تھے گھر والوں سے ملنے کے لیے ان کا اپنے بھائیوں سے فون پر رابطہ رہتا تھا مگر ماں کے ڈر سے کبھی پاکستان نہ آئے اب جب ماں کی طبیعت کا سنا تو ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے وقار حسن سے کہہ کر ماں سے واپس آنے کی اجازت مانگی تو عذرا بیگم مان گئیں۔ ابرار حسن پاکستان آ گئے تھے حسن ہاؤس کے باسیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ابرار اکیلے ہی آئے تھے کیونکہ ان کی شریک حیات چند برس قبل ہی ان کو داغِ مفارقت دے گئی تھیں اور ان کا اکلوتا بیٹا ریان ان دنوں امتحانات میں مصروف تھا اس لیے وہ ابرار حسن کے ساتھ نہ آ سکا۔ برسوں بعد حسن ہاؤس میں بہار آ گئی تھی۔ ہر چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا، بچھڑے ہوئے اپنوں کے ملن کا منظر ہر آنکھ کو خوشی سے نم کر رہا تھا۔ ابرار حسن کا اپنی بھابی اور بھتیجے بھتیجیوں سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے عنابیہ کو تو پہلی ہی نظر میں اپنے بیٹے ریان کے لیے پسند کر لیا تھا۔ انہیں حماد حسن کے شرارتی سے ہنس مکھ

بچے احمر اور عنبر بھی بہت اچھے لگے تھے۔ عنابیہ، عنبر اور احمر بھی اپنے پروقار سے تایا جان سے مل کر بہت خوش تھے اور اپنے کزن ریان سے ملنے کو بے تاب تھے۔ ابرار حسن نے ریان کی بات اسکائپ پر ان سے کروا دی تھی تمام گھر والوں نے ریان سے بات کی سوائے عنابیہ کے کیونکہ ایک تو وہ قدرے کم گو شرمیلی سی لڑکی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ جان گئی تھی کہ ابرار تایا جان نے اس کا ہاتھ اس کے بابا جان سے ریان کے لیے مانگ لیا ہے اور بابا نے ہاں بھی کر دی ہے۔ شادی چند ماہ بعد متوقع تھی۔ ریان کی احمر اور عنبر سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ عنبر تو ریان کو چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہو گئی ریان اکثر عنبر سے عنابیہ کے بارے میں پوچھتا تو عنبر نے اسے عنابیہ کا نمبر دے کر کہا خود بات کر لیا کریں۔ پہلے تو عنابیہ ریان سے بات کرنے سے ہچکچائی مگر پھر وہ دونوں اکثر بات کرنے لگے ریان کی باتیں عنابیہ کے دل میں اترنے لگیں۔ یوں عنابیہ نے ریان کو اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا کر ڈھیروں خواب آنکھوں میں سجا لیے تھے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ جن سپنوں کی وہ پرستش کر رہی ہے وہ ایک دن یوں ٹوٹ کر بکھریں گے کہ اس کی روح تک کو گھائل کر جائیں گے۔

☆......☆

''ریان! مجھے تم سے ایسی گھٹیا حرکت کی امید ہرگز نہیں تھی۔'' ابرار حسن غم و غصے سے چلا رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔

''تم نے مجھے اماں جان اور وقار سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا، تمہیں کچھ اندازا بھی ہے کہ کس قدر ذلت و شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہمیں ولیمے کی تقریب ملتوی کرتے ہوئے لوگوں کی طرح طرح کی باتیں اور اس معصوم پر لوگوں کی تہمتیں دل چیر کے رکھ گئیں مگر تمہیں کہاں احساس۔ تم نے تو شادی کو کسی کھیل یا مذاق سے زیادہ نہیں جانا۔''

''ڈیڈی! مذاق تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ آپ میری بات تو سنیں۔'' ریان نے ہمت کر کے لب کشائی کی تو انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

''اب سننے کو رہا ہی کیا ہے، ریان! تمہیں اگر عنابیہ پسند نہیں تھی تو پہلے بتایا ہوتا۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ کسی معصوم کی زندگی تباہ کرو اس کی تذلیل کرو؟'' ابرار حسن نے تاسف سے کہا تو ریان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''پلیز ڈیڈی! بس کر دیں بس۔'' وہ چلا اٹھا اور پھر اپنی گستاخی محسوس کر کے قدرے نرمی سے گویا ہوا۔

''ڈیڈی! آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے عنابیہ کو بنا دیکھے ہی پسند کر لیا تھا۔ کیونکہ مجھے آپ کے انتخاب پر بھروسا تھا اور ویسے بھی ڈیڈی بات پسند و ناپسند کی نہیں ہے۔ بات سچ اور جھوٹ کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے جھوٹ سے کس قدر نفرت ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر جھوٹ ہرگز نہیں میرے جذبات و احساسات کا خون کیا گیا ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولا گیا ہے ڈیڈی جھوٹ۔'' وہ کرب سے بولا۔

''کیسا جھوٹ ریان؟'' ابرار حسن حیران ہوئے تو وہ کہنے لگا۔

''وہ لڑکی جس سے میں فون پر بات کرتا تھا جسے میں چاہنے لگا تھا جس سے آپ نے میرا رشتہ طے کیا تھا وہ یہ ہے ہی نہیں جس سے میرا نکاح ہوا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ابرار حسن نہ سمجھے تو وہ بولا۔

''وہ عنابیہ نہیں ہے۔''

''وہ عنابیہ ہی ہے ریان بیٹا۔'' حماد چچا کی آواز کمرے میں گونجی تو ابرار حسن اور ریان نے ان کی جانب چونک کر دیکھا۔ ندامت کے رنگ حماد حسن کے چہرے پر نمایاں تھے۔ ان کے ہمراہ سائرہ چچی اور عنبر، احمر بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''آخر یہ معاملہ کیا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ابرار حسن نے سر تھام لیا تھا اور ریان بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔

''بھائی صاحب! میں سخت شرمندہ ہوں یہ سب کیا دھرا میری نالائق اولاد کا ہے۔'' حماد حسن نے ایک قہر آلود نگاہ احمر اور عنبر پر ڈالی جو پہلے ہی ان کی زبردست ڈانٹ کھا کر آئے تھے اور اپنی مزید عزت افزائی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

''کم بختو! اب بتاؤ بھی ساری بات اپنے تایا جی اور ریان کو اور ان سے معافی بھی مانگو۔'' سائرہ چچی نے سر جھکائے بیٹھے ان دونوں سے کہا تو انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ طے کیا کہ کون اپنے کرتوت بیان کرے گا۔ سو عنبر نے ہی ہمت کر کے لب کشائی کی اور کہا۔

''تایا جان! پلیز ہمیں معاف کر دیں اور ریان بھیا سے بھی خفا نہ ہوں کیونکہ جو ہوا اس میں ریان بھیا یا عنابیہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ دراصل بات یوں ہے کہ ایک دن میری وٹس ایپ پر ریان بھیا سے بات ہو رہی تھی کہ باتوں ہی باتوں میں ذکر عنابیہ کا چل نکلا اور ریان بھیا نے عنابیہ کو دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ اس وقت احمر میرے پاس ہی بیٹھا تھا میں نے اسے بتایا تو وہ اور میں بہت حیران ہوئے کہ ریان بھیا نے ابھی تک عنابیہ کو نہیں دیکھا۔ جب کہ ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔ ایک ماہ بعد شادی ہے اور ریان بھیا ابھی تک اپنی ہونے والی شریک حیات کے دیدار سے محروم ہیں۔ ایسے میں احمر کو شرارت سوجھی اس نے کہا کہ ریان بھیا کو کسی کالی کلوٹی سی لڑکی کی تصویر بھیج دو دیکھتے ہیں کہ بھیا کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ریان بھیا تصویر دیکھتے ہی شادی سے انکار کر دیں گے اور پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ یہ عنابیہ نہیں ہے ہم نے آپ کو ماموں بنایا ہے مگر حیرت انگیز طور پر ہم نے جو تصویر بھیجی تھی اپنی کام والی ماسی کی بیٹی فریدہ کی وہ تصویر ریان بھیا کو پسند آ گئی تھی ہم سخت حیران ہوئے کہ امریکہ میں پلا بڑھا ہینڈسم لڑکا ایک عام سی شکل و صورت کی سانولی سی لڑکی سے شادی کرنے کی حامی کیسے بھر سکتا ہے۔ میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار ریان بھیا سے بھی کر دیا تو انہوں نے کہا کہ ''میرے نزدیک خوبصورتی کی نہیں خوب سیرتی کی اہمیت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے پاپا کی خوشی کی'' ہمارے دل میں بھیا کی یہ بات اتر گئی پھر ہم نے سوچا کہ جب بھیا پاکستان آئیں گے تو ان کو بتائیں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ مذاق کیا ہے اور ان کو دکھائیں گے کہ ان کی ہمسفر کتنی حسین ہے۔ ہم نے یہ سب عنابیہ کو بتایا تو وہ ہم سے سخت خفا ہوئی اور کہنے لگی یہ سب غلط ہے۔

میں ابھی ریان کو بتا دیتی ہوں

کہ وہ تصویر میری نہیں ملازمہ فریدہ کی ہے مگر ہم نے عنابیہ کو قسم دے دی کہ تم ریان بھیا سے کچھ نہیں کہو گی چپ رہو گی۔ ہم نے عنابیہ کو منا لیا تھا کہ یہ بس ایک چھوٹا سا مذاق ہے، جو صرف چند دن ہی جاری رہے گا کیونکہ ریان بھیا کی آمد جلد ہی متوقع تھی ہم نے عنابیہ کو پورا یقین دلایا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ مگر وہ نہ ہوا جو ہم نے سوچا تھا ریان بھیا کو پاکستان آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ شادی سے صرف چند روز قبل ہی آئے تھے اور تب تک عنابیہ کو مایوں بھی بٹھا دیا گیا تھا، دادی اماں نے ان دونوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی تھی کہ اب یہ ایک دوسرے سے شادی کے بعد ہی ملاقات کریں گے اور شادی کے ہنگاموں میں ہم دونوں یہ بات بالکل ہی بھول گئے تھے کہ ریان بھیا کو ہم نے کچھ بتانا ہے۔ ہمارا چھوٹا سا مذاق اتنا بڑا طوفان لائے گا ہمیں بالکل خبر نہیں تھی۔ یقین کیجیے ہم نے یہ سب نہیں چاہا تھا۔ ریان بھیا پلیز آپ عنابیہ سے خفا نہ ہوں۔ اس بے چاری کا دوش نہیں وہ تو آپ کو بہت چاہتی ہے۔ آپ دونوں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر لیں اور پلیز ہمیں معاف کر دیں۔''



☆......☆

"تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمہیں غم کی قسم اس دل کی ویرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو سہی یہ دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو"

نیم تاریک کمرے میں اس کا من پسند گیت گونج رہا تھا اور وہ آنکھیں موندھے بیٹھی سوچوں میں گم ریان کے دیئے ہوئے کنگن سے کھیل رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ عنابیہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے ہاتھ سے کنگن چھوٹ کر گرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتے ریان کے قدموں میں جا گرا تو اس نے نیچے جھک کر کنگن اٹھا لیا۔ مسکان اس کے لبوں پر رقص کر رہی تھی عنابیہ نے اس سے نظریں چرالیں اور جلدی سے آڈیو پلیئر بند کر دیا۔

"میں یہ کنگن تو نہیں لینے آیا جو آپ نے آتے ہی میرے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔" ریان نے مسکرا کر کنگن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا یہاں اور ہے بھی کیا کنگن کے سوا۔" وہ جل کر بولی تو ریان کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"کنگن والی تو ہے ناں۔" وہ شوخ لہجے میں کہتا ہوا اس کے قریب ہوا تو وہ "ہونہہ" کرتے ہوئے اس سے دور کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ کھڑکی کے باہر کا منظر اسے خوشگوار حیرت و مسرت میں مبتلا کر گیا۔ حسن ہاؤس کے تمام مکین شام کی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

زندگی کا حسن رشتوں سے ہے اگر رشتے غلط فہمی کی نذر ہو کر کمزور پڑ جائیں تو زندگی کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ اس بات کا اندازہ حسن ہاؤس کے مکینوں کو خوب ہوا تھا اور اب باہر کا منظر اسے باور کروا رہا تھا کہ غلط فہمیوں کی گرد چھٹ چکی ہے اور زندگی ایک بار پھر حسن ہاؤس میں مسکرا اٹھی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد سب کو ایک ساتھ خوش دیکھ کر عنابیہ کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اپنا دکھ بھول گئی تھی۔

"آہم...... میری کنگن والی کیا سوچ رہی ہو؟" ریان نے کہا وہ چونک کر پلٹی وہ آنکھوں میں ڈھیروں محبتیں سموئے کھڑا اسی کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی کنگن والی فریدہ ہے۔ اس رات بھی آپ نے مجھے فریدہ سمجھ کر کنگن پہنائے تھے۔ اب بھی جائیں آپ اسی کے پاس اسی کو پہنائیں کنگن۔" وہ نروٹھے لہجے میں بولی۔ وہ جانتی تھی کہ جو ہوا اس میں قصور ریان کا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اس سے خفا تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اسے منائے اور وہ منا رہا تھا۔

"پلیز عنابیہ! ایسا مت کہو جو بھی ہوا وہ غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا۔ میں اس رات اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ پایا اور تمہارے ساتھ بہت غلط کیا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف سہنا پڑی میں سخت نادم ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔" ریان کے معافی مانگنے پر وہ پگھل گئی۔

"ریان! آپ معافی مت مانگیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔" عنابیہ نے کہا تو اس کے دل سے بوجھ اتر گیا۔

"عنابیہ! زندگی کے وہ حسین لمحات جس کا خواب ہر کسی کی آنکھوں میں بسا ہوتا ہے۔ وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا بھی تو میری بے خبری و غلط فہمی کی نذر ہو کر اپنا حسن کھو بیٹھا۔ میں وہ لمحات واپس تو نہیں لا سکتا مگر اپنی پوری کوشش سے تمہاری زندگی کے آنے والے لمحات کو اس قدر دلکش بنا دوں گا کہ تم ان بیتے ہوئے لمحات کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو گی اگر تم میرا ساتھ دو تو۔"

ریان کے لہجے کی صداقت پر عنابیہ کا دل ایمان لے آیا تھا۔

"عنابیہ! تم میرا ساتھ دو گی ناں۔"

ریان نے ہاتھ میں پکڑا کنگن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے استفسار کیا تو اس نے نگاہیں جھکا کر اپنا ہاتھ ریان کی جانب بڑھا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور ریان نے مسکرا کر عنابیہ کو کنگن پہنا دیا۔ خوشی و سکون کی ایک لہر ان دونوں کے اندر سرائیت کر گئی تھی۔ ☆☆

صالحہ محمود

افسانہ

خواب ریزہ ریزہ

شام کا پہر تھا۔ سامنے والی اونچی دیوار سے سورج اس پار اتر گیا۔ تبھی ہارن کی آواز پر گارڈ نے بڑا سا گیٹ کھول دیا تھا۔ آہٹ بتا رہی تھی احمد آچکا تھا۔ گھر کے اندر اماں اور آپا جان ایک سکتے کے عالم میں بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا امی! خیریت؟'' احمد انہیں دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔

''نہیں خیریت نہیں آمنہ کو طلاق ہو گئی ہے۔''

''کیوں امی کیوں؟'' وہ بھی گھبرا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بس وہی کہ پانچ سال ہو گئے کہ کوئی بچہ نہیں ہوا۔''

اچانک احمد کے دل میں آمنہ کے لیے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔

''اب کہاں ہے آمنہ؟'' احمد پوچھ رہا تھا۔

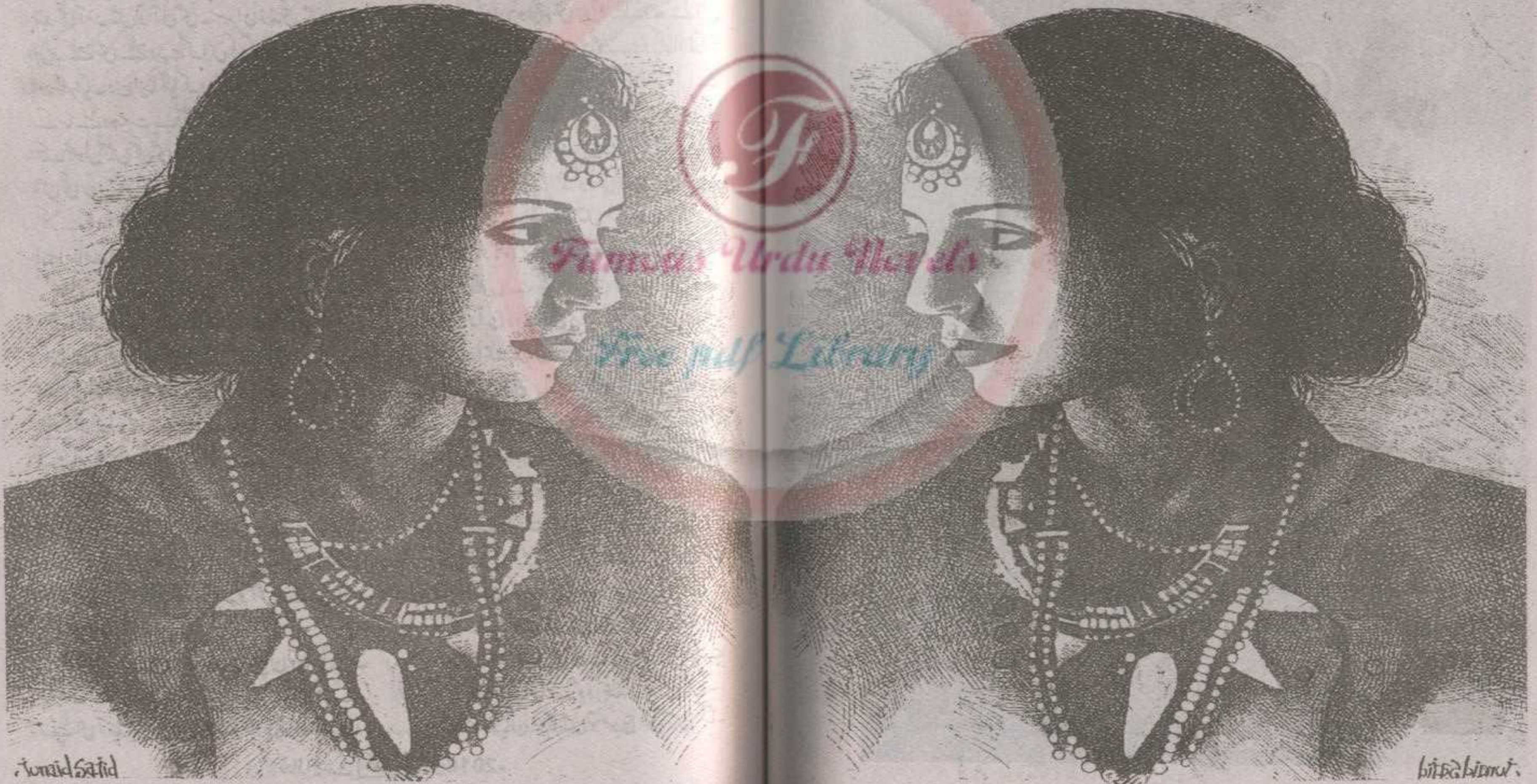
''کہاں ہو گی ماں کے گھر آ گئی ہے۔'' بھانجی کے دکھ پر امی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''ارے امی آپ اتنی اداس اور پریشان کیوں ہیں اور آمنہ تو اتنی اچھی ہے اسے پھر کوئی مل جائے گا۔''

''ہاں درختوں پر رشتے لٹک رہے ہیں ہاں جب چاہو جسے چاہو توڑ لاؤ۔''

''چلیں چھوڑیں امی! آپ خالہ کے پاس گئیں؟ چلیں اٹھیں میں آپ کو لے کر چلتا ہوں۔'' احمد بول رہا تھا۔

مغرب کا پہر تھا جب احمد اپنی ماں اور بہن کو لے کر خالہ کے گھر گیا تھا۔ خالہ، احمد کو دیکھ کر آبدیدہ تو ہوئیں لیکن انہوں نے منہ پھیر لیا اگر احمد راضی ہوتا اور شادی آمنہ سے کر لیتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہیں ملتا۔



’’ہے کہاں آمنہ؟‘‘ احمد نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اٹھ کر آمنہ کے کمرے میں چلا آیا۔

’’کیا ہوا آمنہ؟‘‘

آمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر احمد کی جانب دیکھا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں سے تواتر سے آنسو بہنے لگے۔ پھر جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

’’کیسے ہو احمد؟‘‘ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ احمد ویسے کا ویسا تھا وجیہہ، ہینڈسم، اسمارٹ لگتا تھا پانچ سال ایک پل میں گزر گئے ہوں۔ البتہ تھوڑی بہت تبدیلی آمنہ میں تو آئی تھی۔ سسرالی زندگی میں اسے ہر لمحہ طعنے ہی ملتے رہے کہ اس کی گود ہری نہیں ہوئی اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ لوٹ کر میکے آگئی۔ احمد کے سامنے وہ بہت بے بسی سے بیٹھی تو تھی لیکن وہ ابھی تک بھول نہیں سکی تھی اس کاری ضرب کو جو احمد نے اس کی روح پر لگائی تھی کہ وہ آمنہ سے شادی نہیں کرے گا۔ آمنہ کیا اس نے کسی سے بھی شادی کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اماں منتیں کرتیں۔ بہن بھی سمجھاتی لیکن احمد نے ٹھان لی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ لوگ حیران تھے کہ ایسا احمد میں کیا تھا کہ وہ کہتا ہے کہ اسے شادی ہی نہیں کرنی اور تو اور چھوٹے بھائی کی شادی کے بعد سے ہی احمد نے گھر میں اودھم مچادیا تھا کہ وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ نہیں رہے گا کہ اُسے گھر میں شور شرابہ پسند نہیں ہے۔ اس لیے وہ ماں اور بڑی آپا کے ساتھ الگ رہ رہا تھا۔ کئی دنوں سے احمد صرف آمنہ کے بارے میں ہی سوچے جارہا تھا کہ آمنہ تنہا رہ گئی۔ پھر اسے کئی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آمنہ تو اس کے لیے ایک پرفیکٹ آئیڈیل ہے۔

’’چلو کھرے اور کھوٹے کی پہچان تو ہوئی ایک پرفیکٹ لائف گزر سکتی تھی لیکن یہ کیا کیا احمد تم نے۔ اپنے ہی آئیڈیل کو خود سے دور کردیا تھا اور جب وہ لوٹ کر آئی تو اب تم کیا سوچ رہے ہو جاؤ جا کر اماں سے کہہ دو کہ خالہ پریشان نہ ہوں۔‘‘

☆......☆

جس نے سنا وہ حیران رہ گیا کہ احمد، آمنہ سے شادی کررہا ہے۔ احمد بہت ہی سلجھا ہوا محبت کرنے والا انسان تھا۔ آمنہ تو خود حیران رہ گئی کہ احمد اس پر ترس کیوں کھا رہا ہے۔ ہر آنے جانے والے احمد کو بہت تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

’’احمد! تم مجھ پر رحم کھا رہے ہو۔ میں تمہارے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔‘‘

’’تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو آمنہ؟‘‘ احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے بہت غور سے دیکھا احمد کتنا بدل چکا تھا۔ محبت میں پور پور ڈوبا ہوا احمد اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اتنا پرسکون چہرہ اور اتنی خوابوں بھری آنکھیں کہ ایک پل کے لیے آمنہ کو بھی یقین نہ آیا۔ آہستہ آہستہ احمد خود ہی اس سے دور ہوتا چلا گیا تھا اور جب بات گھر میں شادی کی چلی تو وہ ساری محبتوں کو بھلا کر مکر گیا۔ آمنہ نے اس کو فلرٹ جانا اور گھر والوں نے کچھ اور یوں برسوں پرانی بات ختم ہوگئی اور آج وہ برسوں پرانے رشتے جوڑنے آیا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ آج وہ اپنی ماں کو بھی منا کر لے آیا تھا۔ ماں، بہن پرانے رشتے کا حوالہ دے رہی تھیں۔ سب تو یہی سمجھتے تھے کہ آمنہ بالکل سیدھی سادی ہے اور احمد باہر سے پڑھ لکھ کر آیا ہے۔ آمنہ اس کے قابل نہیں۔ جو فرق کل تھا وہ آج بھی ہے۔ آمنہ کی ماں بے بسی سے بولیں۔

’’میں احمد کے کہنے پر ہی آئی ہوں۔‘‘ چھوٹی بہن ساجدہ بہت سوچ کر بولیں۔

’’یہ فیصلہ اب آمنہ نہیں مان رہی میں مجبور ہوں۔‘‘

’’تم ماں ہو تم اسے سمجھاؤ اب اگر احمد مان گیا ہے تو اسی کو اس کا نصیب جانو۔‘‘ وہ سمجھا کر جاچکی تھیں۔

’’اللہ اتنا مہربان ہوگا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔

آمنہ تو بنی ہی میرے لیے تھی پھر میں یہ غلطی کیسے کر گیا۔‘‘

کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس اسٹیٹس سب کچھ تو تھا ہر لڑکی کی خواہش احمد کو پالینے کی تھی۔ اس کا بس ایک ہی جواب ہوتا۔

’’امی مجھے شادی نہیں کرنی، بس کہہ تو دیا۔‘‘ تو پھر بس تو بس ہی رہی اور آج اچانک وہ بضد تھا کہ مجھے شادی کرنی ہے تو آمنہ سے ہی۔ ہر قیمت پر اسے آمنہ چاہیے تھی۔ وہ بہت تیز رفتار گاڑی سے آمنہ کے خیالوں میں گم گھر لوٹا۔ گارڈ نے جونہی دروازہ کھولا سامنے سے گھر کی ماسی اپنا چھوٹا سا بچہ اٹھائے ہوئے نظر آئی تو اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا۔

’’احمد! بہت بری بات ہے گناہ کبیرہ ہے کسی غریب کو دیکھ کر منہ پھیرنا۔‘‘ ماں آہستہ سے بولیں۔ احمد پر اس وقت ایک وحشت سی طاری تھی وہ جلدی سے اتر کر اندر آیا۔

’’کیا ہوا احمد! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ کیا آمنہ نے انکار کردیا؟‘‘

’’نہیں!‘‘ وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

☆......☆

سنجیدہ سا احمد آج کل بڑے موڈ میں گھوم رہا تھا۔ شوخ کپڑے، دھیمے سروں میں میوزک، بار بار سی ڈی پلیئر پر۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

مہدی حسن کی سریلی آواز میں آمنہ کا ہیولا آہستہ آہستہ سگریٹ کے دھوئیں میں نظر آتا۔ شام ہوتی تو وہ گاڑی لیے ہوئے وہ خالہ کے دروازے پر ہارن دیتا۔

’’آمنہ! چلو آؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔‘‘

’’نہیں احمد! آپ کیوں نہیں سمجھتے اپنی اور میری پچویشن کو۔ خاندان کیا محلہ بھی جانتا ہے کہ تم میرے منگیتر تھے اور اب ٹھکرائے جانے کے بعد میں تمہارے ساتھ کہیں جاؤں گی تو لوگ کیا سمجھیں گے۔‘‘

’’سو واٹ لوگ کیا سمجھیں گے، Who Cares۔‘‘ احمد کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔

’’احمد! ہم بہت سارا وقت اپنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔‘‘ وہ اپنا رخ پھیر کر بولی۔

’’کوئی نہیں وقت کبھی نہیں گزرا تم ایسا مت سوچو۔‘‘ اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

’’احمد پلیز! مت کرو ایسا میں تمہیں کچھ نہیں دے سکوں گی۔‘‘ اس نے نظر بھر کر احمد کو دیکھا تو احمد بول پڑا۔

’’مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے ایمی۔‘‘ احمد کی شوخ آنکھیں اس کے چہرے کو ایک تپش دے رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ تو احمد نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کرلیا۔ اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہوگئیں۔

’’پلیز ایمی! مجھے معاف کردو ایک بار۔ مجھ سے ہوگئی غلطی تم میری زندگی میں ایک بار آ کر تو دیکھو احمد تمہیں ساری خوشیاں دے گا۔‘‘ آمنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ احمد گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آمنہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

’’اوکے ایمی اوکے۔ میں تو سمجھا تھا کہ اللہ مجھ پر مہربان ہو رہا ہے۔‘‘ وہ کمرے سے جلدی سے باہر نکل گیا۔ ایمی نے سر اٹھا کر دیکھا لیکن وہ جاچکا تھا۔

خوشی اور دکھ اچانک وارد ہوتے ہیں وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ زندگی جب کروٹ بدلتی ہے تو حادثات خوشی اور غم کے اپنے ہی آپ چلے آتے ہیں۔ سو آج بھی احمد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ایمی کی عدت کے بعد آمنہ کا نکاح احمد سے ہے۔

☆......☆

آمنہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ سب اس کی قسمت پر رشک کررہے تھے کہ وہ احمد کی جیون ساتھی بننے جارہی تھی۔ کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ آمنہ دلہن بن کر احمد کے گھر آگئی۔ رنگ برنگے ہوا

میں اڑتے آنچل بڑے سے لان میں درختوں میں لگے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ احمد کی نظریں بار بار آمنہ کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس باریک دوپٹے سے جھانکتا ہوا اس کا چہرہ چھوٹی سی ماتھے پر بندیا نظر آرہی تھی۔ احمد اور آمنہ کی جوڑی پر سب کو اس وقت رشک آرہا تھا۔ آمنہ کے سارے دکھ دھل گئے تھے۔

"حسن اور محبت ہی تو ہر چیز نہیں ہوتی ماں نے دولت کے انبار لگا دیئے تھے لیکن چھوڑنے والوں نے ایک پل میں آمنہ کو نکال دیا تھا۔ سنا ہے کوئی معمولی سی لڑکی کو وہ لے بھی آئے۔ دیکھو اب یہاں کیا ہوگا۔" کوئی دل جلی خاتون آمنہ کے بہت قریب بیٹھی ڈسکس کررہی تھی۔ آمنہ کا دل آہستہ آہستہ دھڑ کنے لگا تھا۔

"اگر احمد کو بھی میری خالی گود کا احساس ہوگیا تو......"

لیکن احمد اس کے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ احمد اسے پاکر بہت خوش تھا اور آمنہ بھی بہت مطمئن سی تھی۔

چھ مہینے بعد ہی کسی خاتون نے احمد کی ماں سے آمنہ کے سامنے ہی پوچھ لیا تھا۔

"کوئی خوش خبری ہے کیا؟"

"ایسی ہماری قسمت کہاں۔" امی بولیں۔ آمنہ کے اندر ایسا لگا کچھ دھڑ سے گرا ہے۔ تو وہ چکرا کر پلر کے ساتھ لگ گئی تو مائدہ نے پلٹ کر آمنہ کو دیکھا تھا۔

"اوہ آمنہ! تم تو ایسے چکرا کر گری ہو جیسے ماں بننے کی پہلی نشانی ہو۔" خالہ اب خالہ نہ تھیں وہ ایک ساس تھیں۔

"خالہ! پانی دے دیں۔"

"بی بی اٹھو اور سامنے فریج ہے جا کر پی لو پانی مجھے تو یہ ڈرامے پسند نہیں اگر اکلوتی ہو تم اپنی ماں کی تو میں کیا کروں۔ میں نے تو ایک ساتھ چار بچے پالے ہیں۔ تمہاری ماں کے بھی بہت نخرے تھے۔" وہ چائے کا کپ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

"کیا ہوا امی! تمہارا چہرہ کیوں اتنا پیلا ہو رہا ہے۔" احمد شام کو اس سے پوچھ رہا تھا۔

"پتہ نہیں احمد! کل سے بار بار مجھے چکر آرہے ہیں اور میں جوس پی لیتی ہوں شاید بی پی لو ہوگیا ہے۔"

"تو چلو ڈاکٹر سے چیک اپ کروالو۔"

"ابھی تو گھر میں کام ہیں۔ کل تک اور دیکھ لوں۔" وہ ساس کے خوف سے بہانہ بنا گئی۔

"کیا ہوا آمنہ! کیا تمہاری زیادہ طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ تم آج ناشتے پر نہیں آئیں۔" خالہ بولیں۔

"خالہ! مجھے بار بار متلی محسوس ہو رہی ہے۔"

"ہاں تو ہر وقت تم احمد کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو تو کھا لیا ہوگا کچھ۔" وہ عجیب سے طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"نہیں خالہ نہیں۔" وہ جلدی سے بول پڑی۔

"تو جاؤ ڈاکٹر کے پاس دوا لے لو۔ چلو آؤ میں تمہیں لے کر چلتی ہوں۔ پھر تم احمد کو نخرے دکھاؤ گی وہ پورے شہر میں تمہیں لیے لیے پھرے گا۔" ساس بہت غصے میں ڈاکٹر کے پاس اسے لے گئیں۔

"ارے بھئی چلو کیا رینگ رینگ کر چل رہی ہو۔"

"خالہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کئی دن سے مجھے بخار آرہا ہے۔" وہ بہت نقاہت سے بولی۔

"اچھا بھئی آجاؤ۔" وہ بیزار کن لہجے میں بولیں۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد مائدہ کو مبارک باد دی تھی۔

"بی بی آپ دادی بننے والی ہیں۔"

"ہیں......" مائدہ نے حیرانگی سے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔

"کیا کہا آپ نے کیا کہا۔" انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ آمنہ کا ہاتھ تھام کر گاڑی تک لائیں تھیں۔

"آہستہ چلو آمنہ آہستہ تم نے تو ہمیں اتنی بڑی خوشی دے دی۔" آمنہ کو خود یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ گھر پہنچنے میں کافی دیر ہوگئی تھی۔ احمد ٹہل ٹہل کر انتظار کررہا تھا۔ ہارن کی آواز ہوئی تو احمد چائے کا کپ لیے جلدی سے باہر آگیا تھا۔ مائدہ، آمنہ کا ہاتھ تھامے ہوئے نظر آئیں تو احمد گھبرا کر بولا۔

"امی! تم ٹھیک تو ہو؟"

"ارے احمد! خوشی کی بات ہے امی ماں بننے والی ہے۔" امی کے بجائے مائدہ بول پڑیں۔

"واٹ......!" احمد کو کرنٹ سا لگا اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا تھا۔ امی نے مسکرا کر احمد کی طرف دیکھا۔

احمد تو ایک سیکنڈ میں اندر جا چکا تھا۔ مائدہ اور آمنہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے بڑھیں۔

"کچھ نہیں آمنہ! تم آرام سے چلو۔" مائدہ اس کو اس کے کمرے تک چھوڑ کر گئی تھیں۔

"کیا ہوا احمد! تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" امی کی ہنستی ہوئی آنکھیں ایک لمحے میں بجھ گئیں وہ......وہ احمد ہی نہیں تھا۔ شدید غصے میں اس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔

"خوشی......!" احمد غصے سے کھڑا ہوگیا۔

"آمنہ! تم نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔"

"فراڈ......!" امی حیران سی ہو کر بولی۔

"میں نے تم سے صرف اس لیے شادی کی تھی کہ تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں اور میں اس عورت کو چھو ہی نہیں سکتا جو ماں بنے اس کے وجود سے جو بچے کی خوشبو آتی ہے میں اس سے الرجک ہوں۔" احمد نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں تھیں۔

"احمد! تم مذاق کررہے ہو اس خوشی کے موقع پر۔"

"تو میں ایک پل بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" اس کا چہرہ وحشیوں کی طرح ہوگیا تھا۔ اس نے بازو پکڑ کر اسے بیڈ سے پکڑ کر کھڑا کردیا۔

"تم جاؤ اسی وقت دوسرے کمرے میں۔"

"خالہ......!" وہ زور سے چیخی۔

"چھوڑو احمد! اس کا ہاتھ کیا ہوا؟ میں جانتی تھی کہ تم یہی کرو گے میں تمہاری ماں ہوں۔" انہوں نے آمنہ کو ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کرلیا۔

"خالہ......!" آمنہ نے گھبرا کر اپنی خالہ کو دیکھا تھا جو یہ کہہ رہی تھیں کہ میں جانتی تھی کہ تم یہی کرو گے۔

"میں کہہ رہا ہوں تم اس وقت نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" وہ بری طریقے سے دہاڑا۔ آمنہ گھبرا کر باہر نکلی۔

"احمد! تمہاری ضد تھی کہ میں آمنہ کو لے کر آؤں گا میں اسی وقت سمجھ گئی تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسی لڑکی ہمارے گھر آئے جو ہماری نسل کو آگے نہ بڑھا سکے لیکن اب یہ اللہ کا خاص کرم ہے تم پر اور اس بار تمہاری ماں تمہارے ساتھ نہیں ہے یہ جان لو تم۔" احمد نے آگے بڑھ کر ماں کے لیے دروازہ کھول دیا تھا کہ آپ باہر جائیں۔ احمد دروازہ بند کر کے اپنا سر دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر روتا رہا۔ گھر میں ایک اداس فضا قائم تھی۔ آمنہ کی برسوں پرانی ایک خواہش کہ وہ ماں بن جائے احمد نے ایک پل میں اٹھا کر اسے گہرے گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر مائدہ کے روم میں زندگی گزار رہی تھی۔

"وہ بہت ضدی ہے۔ میری بات بھی نہیں سن رہا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"پھر خالہ! آپ اسے سمجھائیں یہ کیسے ممکن ہے جو احمد چاہ رہا ہے۔" امی رو پڑی تھی۔

"بس یہ ہماری بدنصیبی ہے اور کچھ نہیں۔ احمد کو کوئی بات سمجھ نہیں آرہی۔" خالہ تڑپ کر بولیں۔

"میں کہیں چلی جاؤں گی چھپ کر رہ لوں گی مگر میں اپنے بچے کو نہیں مار سکتی۔ وہ کہتا ہے یہ بچہ دنیا میں نہیں آئے گا میں اپنے بچے کو نہیں مار سکتی خالہ۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں آمنہ! تم کہیں جا کر چھپ جاؤ۔ جب بچہ پیدا ہوگا ناں تو یہ مان جائے گا۔"

"نہیں خالہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ صرف دو ہی راستے ہیں بچہ یا طلاق۔ امی کہتی ہیں تم طلاق لے لو۔ آپ بھی یہی کہتی ہیں لیکن میں دوبارہ طلاق یافتہ نہیں بن سکتی۔ ہوگا وہی جو احمد چاہتا ہے۔"

"تو کیا تم اس بچے کو مار دو گی؟" مائدہ حیران سی ہو کر بولیں۔

"نہیں بالکل نہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گردن میں ڈال کر خود کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ وہ دبے قدموں احمد کے کمرے میں چلی تو آئی تھی احمد آج ہاں اور ناں کا جواب چاہ رہا تھا۔

"احمد پلیز!" اس نے احمد کے دونوں پیر تھام لیے تھے لیکن اس نے بے رحمی سے امی کو جھٹک دیا تھا۔

پھر ہوا وہی جو احمد چاہتا تھا۔ احمد وہ بلا تھا جو اپنے ہی بچے کو کھا گیا تھا اور آمنہ نے دوسری بار طلاق یافتہ ہونے سے خود کو بچالیا تھا۔

آمنہ کی ماں اس غم میں سال بھر بھی نہ جی سکیں لیکن احمد کو کوئی دکھ نہ احساس تھا وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھا۔ دوسری بار پھر ایسا ہوا اور اس بار امی نے نہ کوئی احتجاج نہ حجت نہ بحث کچھ بھی نہ کیا اس بار پھر احمد جنگلی بلا بن کر اپنے ہی بچے کو کھا گیا۔ امی چپ چپ رہتی کوئی پوچھتا کہ کتنے بچے ہیں تو وہ بہت حسرت سے کہتی۔

"دو بچے تھے احمد نے مار دیئے۔" لوگ فوراً اس کی کہانی سننے بیٹھ جاتے اور وہ ہر ایک کو اپنی کہانی بتانے لگتی۔

"احمد کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔" صائمہ نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کبھی تمہارے درمیان اس ٹاپک پر بات نہیں ہوتی۔" تو وہ جواب نفی میں تھا۔ گہری گرے آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔

"تمہیں یہ کھیلتے ہوئے بچے اچھے نہیں لگتے۔" صائمہ بولی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں جب احمد راضی نہیں۔" اس کی نظریں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔

گرے آنکھوں میں سرمئی بادل سے اتر آئے۔

ہلکی ہلکی سنہری دھوپ پورے لان میں اتر آئی تھی۔ آمنہ احمد کے ساتھ بیٹھی چائے پیتے ہوئے بولی۔

"احمد! دونوں بچے اتنے کیوٹ ہیں بالکل سفید ایک گلاوڈی کی شکل ہے اور ایک زی کی شکل ہے۔ گلاوڈی تو اپنے بچوں کو چھپائے ہوئے بیٹھی ہے۔ بالکل ان کے پاس سے ہٹ نہیں رہی۔ احمد پتا ہے جب اسے پین ہو رہا تھا تو وہ بار بار میرے قدموں پر لوٹ رہی تھی۔ شاید میں اسے اس تکلیف سے بچالوں۔" احمد زور سے ہنسا تھا۔

"امی! تم بلیوں کے پیچھے دیوانی ہو، بچپن میں بھی تم نے ایک بلی پالی تھی مجھے آج تک یاد ہے۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بولا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" امی بڑے اداس لہجے میں بولی۔

"لیکن تمہارا بلا بہت لالچی کیا ضرورت تھی اس روڈ کراس کر کے قصائی کی دکان پر جانے کی۔ چھوڑو امی اداس مت ہو۔ افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا تھا۔ بس روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ بے چارہ بوبا۔" احمد ہنسا لیکن امی بہت اداس تھی۔

"ارے......ارے۔" امی چیخی۔

"یہ کیا کر رہا ہے زی او مائی گاڈ یہ بلا اپنے ہی بچے کو مار کر کھا رہا ہے۔" امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لان کے دوسرے کونے پر زی میل بچے کو مروڑ کر پھینک چکا تھا اور دوسرے بچے کو منہ میں دبا کر لے جا رہا تھا۔

"او مائی گاڈ! احمد......احمد یہ وحشی بلا اپنے ہی بچے کو کھا رہا ہے۔ احمد اس نے اپنے ہی بچے کو مار دیا۔" وہ سکتے کے عالم میں احمد کو دیکھے جا رہی تھی۔ احمد کی نظریں جھکی کی جھکی رہ گئیں اور امی یک ٹک احمد کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا احمد اور بلے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کی باڈی لینگویج چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"دیکھو احمد دیکھو اس کو میں نے خود پالا کتنی محبت کی اور آج وہ خود ہی اپنے بچے کو منہ میں دبا کر ٹنکی کے پاس پھینک کر آیا ہے۔ وحشی درندہ۔" امی چیخ چیخ کر بول رہی تھی اور احمد شرمندہ سا رخ پھیر گیا۔

......☆......

قرۃ العین سکندر

ناولٹ

میری ہر خوشی کا آغاز تم ہو

''اماں! بس اب دیر مت کریں۔ بہت ہی اچھے لوگ ہیں لڑکا اتنا قابل ہے رشتے والی بتا رہی تھی کہ اور بھی کئی لوگ بیاہنا چاہتے ہیں۔ یہاں اپنی بیٹیوں کو جیسے ہی ہاں ہو آپ بھی جلد بیاہ دینا۔'' شبانہ



ماں کے کندھے سے لگی انہیں اپنے نادر مشورے سے نواز رہی تھی۔

''اے لو، تو کیا میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی جلد اپنے گھر کی ہو جائے مگر دل کو تسلی بھی تو ہو جلدی جلدی کے چکر میں کہیں ہمیشہ کا پچھتاوا نہ دھرا رہ جائے۔'' زہرہ بیگم کی بات پر شبانہ برے برے منہ بنانے لگی۔

''پورے چھبیس کی ہو گئی ہے اپنی شہزا اور آپ کو ابھی بھی یہ سب جلدی لگتا ہے اور وہ جو فریال کو گھر میں گھسا لیا ہے آپ نے۔ ہم لاکھ انکار کریں مگر کیا اس کی خوب صورتی اور کم عمری کے سامنے شہزاء کا رشتہ ہو سکتا ہے کہیں؟''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر میں کیا کروں تمہارے ابا کو ہی ہمدردی کا بخار چڑھا ہے۔ سال ہونے کو آیا ہے، کہتے تھے کہ اس کے باوا کے دور کے بھائی لگتے ہیں کوئی کزن، وہاں چھوڑ آئیں گے سال کے بعد مگر اب مجھے تو یہ سب نرا دھوکہ اور جھوٹ ہی لگتا ہے ان کا۔'' زہرہ بیگم نے بے بسی سے جواب دیا۔

''ہے کہاں یہ فریال اس وقت؟ آپ کو معلوم ہے ناں اسفند نے رات کھانے پر آنا ہے خوب اہتمام ہونا چاہیے ورنہ سو طرح کی باتیں سننا پڑیں گی مجھے۔'' شبانہ نے ٹوہ لینے کے ساتھ ساتھ آرڈر بھی جاری کر دیا۔

''ہو گی کہاں؟ یہیں کچن میں ہو گی مفت کی روٹیاں توڑتی رہتی ہے سارا دن۔'' زہرہ بیگم نے زہرخند لہجے میں جواب دیا لہجہ نفرت سے پُر تھا۔

''اب ایک کپ چائے ہی پلوا دیں، کب سے آئی بیٹھی ہوں مگر یہاں تو کسی کو پروا ہی نہیں میری ایک وہ شہزاء ہے توفیق نہیں ملتی کہ آ کر سلام ہی کر لے۔'' شبانہ نے سخت کوفت کے عالم میں کہا۔ وہ جب بھی آتی تھی اس کے یہی لگے بندھے شکوے ہوتے تھے۔ کوئی بھاگ کر پانی پیش کر کے ساتھ ہی آ کر چمٹ کر بیٹھ جائے تا کہ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں کی پوری رپورٹ لے سکیں۔ شبانہ ان لوگوں میں سے تھی جن کو شادی کے بعد بھی اپنی گھر گرہستی سے زیادہ میکے میں ہونے والی سرگرمی سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

''ارے نہیں بیٹا! شہزاء تو کمرے میں ہو گی اور میں ابھی کہے دیتی ہوں چائے پانی کا۔'' زہرہ بیگم نے محبت پاش لہجے میں اسے کہا تو وہ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

''اماں! دانیال کی اتنی اچھی جاب لگ گئی ہے۔ اس کا بھی اب رشتہ ڈھونڈیں کہیں۔'' شبانہ کے پاس مشوروں کی کمی نہ تھی۔

''پاگل ہوئی ہو کیا؟ ابھی کر دی ناں اس کی شادی تو یہ جو تیرے عیش ہیں ناں یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ جب تک شہزاء کی شادی نہیں ہو جاتی تم نام بھی مت لینا دانیال کی شادی کا۔'' زہرہ بیگم کا پارہ ایکدم ہی ہائی ہو گیا تھا۔

''فریال! کہاں مر گئی ہو نامراد۔''

اب سارا غصہ فریال پر ہی اترنا تھا زہرہ بیگم کا، شبانہ فقط کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''اری او فریال۔'' زہرا بیگم کی تیز گونج دار آواز پر فریال جو ابھی ابھی برتن دھو کر فارغ ہوئی تھی تیزی سے کچن سے نکل کر زہرہ بیگم کے سامنے حاضر ہو گئی۔

''کہاں دفعان ہو گئی تھیں۔ اتنی دیر سے تمہارے نام کی صدا لگا رہی ہوں۔'' زہرہ بیگم نے شعلہ بار نگاہوں سے فریال پر نگاہ ڈالی۔ سرخی مائل سفید رنگت بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گھنیری پلکیں، بکھری لٹیں لیے وہ ہراساں نظروں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نامراد اپنی مری ماں پر گئی ہے وہ بھی کم بخت یوں ہی حسین تھی۔'' زہرہ بیگم نے دل میں فریال کو کوسا۔

''اماں! آپ بھی ناں جانے کن خیالوں میں کھو

گئی ہیں اب کہہ بھی دیں جو کہنا ہے، سچ مجھے تو اس منحوس کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ خود ہی کھا گئی اپنے ماں باپ کو۔'' شبانہ نے ماں کو ٹوکا۔

ماں باپ کے نام پر فریال کی آنکھوں میں واضح نمی آ گئی تھی مگر خاموشی سے ہمہ تن گوش تھی۔

''ہاں وہی کہنے جا رہی ہوں تم ایسا کرو فریال شام کے کھانے میں بریانی اور ٹرائفل بنا لو، کباب بھی تیار کر لینا۔ سلاد دو طرح کے بنانا۔ میرا خیال ہے اتنا کافی ہو گا۔'' زہرہ بیگم نے ساتھ بیٹھی بیٹی سے مشورہ طلب کیا۔

''جی ہاں امی! مگر میرے بچے تیز مرچوں والی بریانی نہیں کھاتے ان کے لیے پلاؤ بنوا لیں اور بھئی تم جاؤ بچوں کے لیے نوڈل اور میرے لیے چائے کا کپ لاؤ۔'' شبانہ نے حکیمہ انداز میں کہا۔ تو فریال سعادت مندی سے سر ہلا کر کچن میں آ گئی۔

اتنا کچھ بنانا تھا اور وقت بھی کم رہ گیا تھا۔ پھر شبانہ آپی آئی ہوئی تھیں۔ ان کو ہر کام وقت پر ملنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ اس قدر تذلیل کرتی تھیں کہ فریال کو اپنے بکھرے وجود کی کرچیاں سمیٹنا ہی دو بھر ہو جاتا تھا اس کا کام تھا کوہلو کے بیل کی طرح جُت جانا۔ سو وہ جُت گئی اور لگاتار ایک کے بعد ایک کام کرتی چلی گئی۔ فریال کی کمر بری طرح دکھ رہی تھی اک ٹیس سی اٹھی تھی جس کو دباتے ہوئے وہ دوبارہ تندہی سے کام میں لگ جاتی، کھانے کی مہک چار سو پھیل گئی تھی سارا کھانا تیار ہو چکا تھا۔ ایک دم انجانی سوچ نے فریال کے چہرے کو تر کر دیا۔

☆......☆

''نہیں ناں بابا جانی مجھے آج کھانا بنانے دیں ناں، میرا دل کرتا ہے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بابا کو کھانا بنا کر کھلاؤں۔'' فریال نے لاڈ سے اپنے بابا کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

''نہیں بالکل نہیں۔ میری ''کومل پری'' تو کھانا کھانے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور پھر ابھی پڑھائی مکمل نہیں ہوئی جب ہو گی تو بھئی ہرگز منع نہیں کروں گی نت نئی ڈشز بنا بنا کر کھلانا اپنا بابا جانی کو۔''

بابا پیار سے اپنی بیٹی کو کومل پری کہا کرتے تھے مگر جب بابا نے فریال کی اتری ہوئی شکل دیکھی تو زیر لب مسکرا اٹھے۔

''اچھا ٹھیک ہے اگلے سال سے گھر میں کھانا صرف میری بیٹی بنایا کرے گی مگر اس وقت تو چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ جاؤ جا کر اچھی سی چائے بنا لاؤ۔'' بابا کی بات سن کر وہ ایکدم کھل اٹھی تھی اور کھلکھلاتی ہوئی کچن کی جانب چل دی اپنے پیارے بابا جانی کے لیے چائے بنانے مگر وقت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس کی یہ خواہش کہ وہ اپنے بابا جانی کے لیے کھانا بنائے ایک مجسم حسرت ہی رہ گئی۔

''آہ کتنے پیارے پیارے عزیز رشتے کھو دیئے ہیں میں نے۔'' تنہائی کا احساس شدت اختیار کر گیا تو اس کے گال خود بخود تیزی سے بھیگنے لگے۔

''ارے یہاں تو ٹسوے بہائے جا رہے ہیں۔'' شبانہ آپی کچن میں داخل ہوئیں تو اس کو یوں روتا دیکھ کر ناگواری سے بولنے لگیں۔

''چار کام کیا کہہ دیئے تمہیں تمہارا رونے دھونے کا پیریڈ اسٹارٹ ہو گیا، احسان مانو ہمارا کہ ہم نے تمہیں پناہ دی ہوئی ہے۔ دو کام کر کے کون سا احسان کر دیا تم نے ایک ہم ہیں مجال ہے جو کبھی اف بھی کی ہو۔ ہزار کام نمٹا کر آتے ہیں اپنے سسرال کے۔ تب کہیں جا کر خلاصی ملتی ہے جان چھوٹتی ہے کہ جاؤ اب جہاں جانا ہے۔'' شبانہ آپی تیز تیز لہجے میں بولنے لگیں تو فریال ایک دم گھبرا کر اپنے تر چہرے کو دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

''نہیں آپی! ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہے۔'' فریال نے گھٹی گھٹی آواز میں وضاحت پیش کرنا چاہی مگر یہاں کسی کو اس کی وضاحتوں کی ضرورت

تھی نہ حاجت۔

''نہ تو پھر کس خوشی میں بہہ رہے ہیں یہ زاروقطار آنسو؟'' شبانہ آپی نے باقاعدہ کمر پر ہاتھ ٹکا کر لڑنے والے انداز میں پوچھا۔

''شبانہ آپی! آپ کب آئیں؟'' دانیال کی آمد کی وجہ سے ان کی ساری توجہ اب دانیال کی جانب ہوگئی تھی۔ دانیال نے اشارے سے فریال کو وہاں سے جانے کو کہا۔ وہ خاموشی سے کچن سے نکل گئی۔ جمع جوڑ کا کوئی کلیہ کوئی قاعدہ اس کی زندگی میں لاگو نہیں ہوتا تھا۔ سوائے دکھوں اور ذلتوں کے جمع جوڑ کے۔

ابھی اس نے بی اے آنرز ہی کیا تھا کہ اس کے عزیز از جان بابا اور امی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہمیشہ کے لیے اسے تپتی دھوپ میں تنہا چھوڑ گئے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ خوب نازوں پلی، خوشیوں کے جھولے میں جھولا جھولتی ہوئی وہ بڑی ہوئی تھی۔ کوئی آرزو کوئی خواہش تشنہ لب نہ رہی تھی۔ نامعلوم کیسے کوئی خواہش لب پر آنے سے پہلے ہی اس کے والدین جان جاتے تھے مگر اس جان لیوا حادثے کے بعد اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ تنہا تھی اور سامنے ایک سنگدل دنیا تھی۔ اس کے بابا بھی اس کی طرح اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ دور پرے کے ایک چچا تھے مگر وہ معاشی لحاظ سے اس قدر کمزور تھے کہ اس کی کفالت کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے تھے یوں وہ خود بخود اپنے اکلوتے ماموں کی ذمہ داری بن گئی۔ ماموں نے اس کے سر پر دست شفقت تو رکھا مگر حقیقی سائبان نہ بن سکے۔ ممانی سے ہزار بحث ومباحثہ کے بعد اسے ماموں کے گھر میں ایک چھت ایک آسرا تو مل گیا تھا مگر صبح سے شام تک وہ کاموں میں جتی رہتی اور ہزار طعنے ملتے تھے شبانہ آپی دانیال بھائی اور چھوٹی شزاء سب کے سامنے وہ ادب سے رہتی ایک پکار پر حاضر ہو جاتی تھی شاید اس گھر کے مکینوں کے دل اس کے لیے وسیع ہو جائیں مگر حالات جوں کے توں تھے۔

''اب چھوڑ بھی دو بچی کو کیا جان سے مار ڈالو گی؟'' فرید ماموں نے ممانی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ممانی فریال کو بری طرح پیٹ رہی تھیں تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش برسا رہی تھیں۔

''سارا دن کام کاج کے بعد رات کو یہ انعام یہ صلہ ملا تھا۔

''بچی! یہ بچی ہے ناگن ہے یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آج شزاء کو دیکھنے لڑکے والے آ رہے ہیں اور پھر بھی یہ منہ اٹھائے چلی آئی ڈرائنگ روم میں کیا یہ اتنی ہی بچی ہے؟''

ممانی کا پارہ بہت ہائی تھا۔ آج جو لوگ شزا کو پسند کرنے آئے تھے وہ فریال کو پسند کر گئے تھے اور نہ صرف پسند کر گئے تھے بلکہ جھٹ منگنی اور پٹ شادی کا سندیسہ بھی دے گئے تھے۔ کیونکہ لڑکے نے جلد ہی امریکہ پلٹ ویزے پر جانا تھا۔ ممانی کا تو دکھ اور صدمے سے برا حال تھا۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل گیا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ فریال کو اس سارے معاملے کی قطعاً خبر نہ تھی کہ آج شزاء کو دیکھنے لوگ آ رہے ہیں۔ شبانہ آپی کے بڑے بیٹے حیدر نے آ کر فریال سے کہا کہ نانو آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ جو ممانی کے ایک بلاوے پر جن کی طرح حاضر ہو جاتی تھی کیسے جائے بنا رہتی مگر اندر ڈرائنگ روم کا منظر تو اس کے اندازوں سے بالکل مختلف نکلا۔ دو خواتین اور ایک بزرگ مرد اور ساتھ ساتھ ماموں ممانی بیٹھے تھے۔ شزاء ان خواتین کے درمیان سر پر دوپٹہ جمائے بیٹھی تھی۔

''جی ممانی! آپ نے مجھے بلایا تھا؟'' فریال نے سعادت مندی سے پوچھا تو ممانی کو تو ایکدم جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔ ان خواتین کی اب ساری دلچسپی شزاء سے مفقود ہو کر فریال کی سمت مرکوز ہوگئی تھی اور وہ گہری نگاہوں سے فریال کا جائزہ لے رہی تھیں پھر انہوں نے باقاعدہ فریال کو پکار لیا اور ساتھ بٹھا لیا اور فریال سے مختصر سوال پوچھنے لگیں۔ فریال گھبرائی سی سوالوں کے جواب دینے لگی۔

''ارے بہن! یہ ہیرا کہاں چھپا رکھا تھا۔ ماشاء اللہ کس قدر حسین ہے۔ نگاہ ہی نہیں لوٹتی چہرے پر سے۔'' خواتین اپنی خوشی کا برملا اظہار کرنے لگیں۔

''فریال! جاؤ تمہیں کچن میں کچھ کام تھا شاید۔'' ممانی حالات کی کایا پلٹ پر بہت کڑھ رہی تھیں اور پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں مگر بے بس تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا فریال کو یہاں سے غائب کر دیں۔ فریال ممانی کے ساتھ اتنے عرصے میں رہ کر ان کے اشارے سمجھنے لگی تھی۔ ان کی تنبیہہ پر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور سیدھی باہر نکل آئی مگر ان خواتین کے دل سے نہ نکل سکی اور ان خواتین کو فریال اس قدر بھا گئی کہ شزاء کی جگہ فریال کا ہاتھ مانگنے لگیں۔ ممانی نے طریقے سے سوچ کر جواب دینے کا کہہ کر بات ختم کر دی۔

فریال نے بتایا بھی کہ حیدر نے بلایا تھا مجھے مگر شبانہ آپی نے صاف کہہ دیا۔

''اس گھریلو سیاست میں میرے بچوں کو استعمال نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' یوں بھی یہاں تھا ہی کون جو اس کی بات سنتا اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

''جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ اپنے زخمی وجود اور زخمی روح کے ساتھ اسٹور نما کمرے میں آگئی جو یہاں اس کا مستقبل ٹھکانا ٹھہرا تھا۔ چھلنگا سی چارپائی بچھا دی گئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر ڈھے سی گئی اور گرم سیال آنسو تکیہ بھگونے لگے۔ نارسائی کا گہرا دکھ اس کی ذات میں منجمد ہو گیا تھا۔ تبھی آہٹ پر وہ چونک سی گئی۔ دانیال تھے۔ ٹرے اٹھائے ہوئے اندر کی جانب آ گئے۔

''فریال! میں جانتا ہوں تم صبح سے کاموں میں لگی ہو اور بھوکی ہو گی، میں امی کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں پلیز یہ کھانا کھا لو......''

فریال اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی روئی روئی سوجی آنکھیں دیکھ کر دانیال نے دل میں گہرا دکھ محسوس کیا۔

''پلیز آپ یہ کھانا لے جائیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' فریال نے بے دلی سے جواب دیا۔

''اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بھی بھوکا مارو گی کیا؟ حیدر نے سب کے سامنے اعتراف کر لیا ہے کہ اسے شزاء خالہ اور فریال خالہ میں سمجھ نہ آئی کہ کس کو بلانا ہے۔ یوں یہ ساری غلط فہمی ہوئی تھی۔ ابھی شزاء آئی ہی تھی ڈرائنگ روم میں کہ اُدھر تم بھی آ گئیں۔''

دانیال دھیرے دھیرے اسے ساری بات بتانے لگے۔ دانیال کے دل میں فریال کے لیے گہری محبت تھی، یہ سلسلہ تو جانے کب سے تھا شاید جب احساس کی پہلی کونپل ان کے دل میں پھوٹی تھی تبھی اسی لمحے فریال کا نام ان کے نہاں خانوں پر رقم ہو گیا تھا پھر انہوں نے فریال کو کھانا کھلا کر ہی دم لیا۔ کھانا کھاتے کھاتے فریال کی نگاہ دانیال کے چہرے پر پڑی تو وہ ایکدم گھبرا سی گئی گہری نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ بہت پزل ہو گئی تھی۔ کتنے رنگ کتنے جگنو تھے ان ڈارک براؤن آنکھوں میں، وہ مزید سکت نہ پاتی تھی۔ ان نگاہوں میں دیکھنے کی اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔

''او کے تم کھانا کھاؤ آرام سے میں چلتا ہوں۔'' دانیال نے اس کی فطری شرم محسوس کر لی تھی۔

☆......☆

نیا طلوع ہونے والا دن بھی گزشتہ دنوں کی طرح ہی تھا۔ کچھ نیا پن نہ تھا۔ وہ صبح خیزی کی عادی تھی۔ سو نماز فجر میں جائے نماز بچھائے خاصی دیر تک بارگاہ ایزدی میں سربسجود رہی۔ آنسو بہتے رہے اور اس کا وجود لرزیدہ پتے کی مانند کانپتا رہا۔ مالک

کائنات رب دو جہاں کو بتانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا اس کے پاس وہ تو جانتا تھا اس کے پاس صرف آنسو تھے جو بارگاہِ خداوندی میں بہتے چلے جارہے تھے۔ دل ہلکا ہو گیا تو جائے نماز قرینے سے طے کر کے رکھی۔ اپنے کپڑوں کی سلوٹوں کو سیدھا کرتی وہ باہر کی جانب چل دی۔ ماموں جان ناشتے سے پہلے چائے کا کپ پیتے تھے۔ اس نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو دانیال تھے، گہری ڈارک براؤن آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا رقم تھا کہ اس کی نگاہیں شرم کے بوجھ سے جھکتی چلی گئیں۔

''آپ کو کچھ چاہیے تھا؟'' فریال کی آواز نے ان کا سارا سحر توڑ دیا تھا اور وہ چونک سے گئے۔

''ہاں! ایک کپ چائے۔'' دانیال نے مسکرا کر کہا۔

''جی!'' فریال نے کہا۔

''سنو......'' وہ ہمہ تن گوش تھی۔

''خوش رہا کرو، حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ جلد یا بدیر بدلتے ضرور ہیں۔ وعدہ رہا ایک دن تمہارے اچھے دن ضرور آئیں گے۔ تمہیں مجھ پر یقین تو ہے ناں؟'' دانیال کی گھمبیر آواز میں بہت کچھ تھا۔ آس، امید، دلاسا اور آنے والے کل کی نوید۔ وہ صرف سر جھکا کر رہ گئی وہ یہ کہہ کر رکے نہیں تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے کچن سے باہر نکل گئے۔

شزاء کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ لڑکے والوں کو کہلوا دیا گیا تھا کہ فریال کی بات بچپن سے ہی طے ہے یوں یہ بات ختم ہو گئی اور شزاء کے لیے ان لوگوں نے ہاں کا عندیہ دے دیا۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں کیونکہ کچھ دن بعد ہی لڑکے نے واپس امریکہ چلے جانا تھا۔ بات بے بات کھلکھلاتی شزاء اچانک ہی بہت ہنس مکھ ہو گئی تھی۔ ہر وقت خوشگوار موڈ میں رہنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ فریال سے بھی ہنس کر بات کر لیتی تھی۔ چند دن پہلے ہی شزاء کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ شزاء کے اصرار پر ہی ممانی جان کو فریال کے لیے کپڑے لینے پڑ گئے۔ ورنہ ان کو تو یاد تک نہ تھا کہ فریال بھی اس گھر میں رہتی ہے۔ وقت بہت کم تھا۔ یہ فرض دانیال کے ذمے سونپ کر وہ بری الذمہ ہو گئیں تھیں۔ جس قدر معمولی رقم انہوں نے فریال کے کپڑوں کے لیے دی تھی اس میں شادی کے موقع کی مناسبت سے لباس ملنا ناممکن تھا۔ دانیال نے اپنی طرف سے رقم شامل کر کے نہایت عمدہ طرز کے دو قیمتی سوٹ فریال کے لیے خریدے، جو سلے سلائے تھے، وہ بے حد خوش تھے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے فریال کے لیے کچھ خریدا تھا۔ دانیال نے وہ شاپر فریال کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''دیکھو تو سہی اگر پسند نہ آئیں تو میں چینج کروا دوں گا۔'' دانیال کے سامنے اس نے شاپر کھولا۔ دو سوٹ تھے ایک سرمئی کامدار سوٹ تھا دوسرا پرپل کلر کا نفیس سا کڑھائی کا کام والا سوٹ تھا۔ دونوں بہت ہی قیمتی اور خوب صورت لباس تھے۔ فریال کی آنکھیں تشکر کے جذبات سے بھر آئیں۔

''بہت ہی اچھے ہیں۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ براہ راست اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گئے۔

''ہر بات پر رونا اچھی بات نہیں ہوتی ہے پاگل لڑکی، اب اچھی طرح تیار ہونا۔'' دانیال نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ دانیال واقعی اس کے لیے خلوص بھرے جذبات رکھتے تھے۔ ورنہ باقی سب رشتے تو مجبوری کے تھے اور مجبوریاں تو اس کے مقدر میں اسی دن لکھ دی گئیں تھیں جب شفیق ہنستے وجود بابا جانی کی صورت اور ممتا بھری خوشبو لیے امی کی ہستی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چل دی تھی، خوشیوں کے

بدلے لازوال دکھوں کا سودا طے ہو گیا اور والدین سے دائمی جدائی جیسے غم کا کوئی مداوا ہی نہ تھا۔ شزاء کی بارات شادی ہال میں آنی تھی، شزاء ریڈ کامدار سوٹ لہنگا میں واقعی بہت اچھی اور خوش لگ رہی تھی۔ فراز بھی خوبرو لگ رہا تھا۔ فریال شزا کو دیکھ کر بہت مطمئن تھی۔ کیونکہ اس کی ذات شزا کی خواہشوں میں رکاوٹ نہ بنی تھی۔ شزاء اور فراز ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کا فوٹو سیشن ہوا پھر مووی میکنگ ہوئی اور سبھی فرداً فرداً دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھ رہے تھے۔ فریال نے پرپل سوٹ زیب تن کیا تھا۔ لڑکیوں میں سے کسی من چلی لڑکی نے فریال کو پکڑ کر لپ اسٹک لگا دی تھی۔ وہ یوں بھی بہت حسین تھی مگر اتنی ہی تیاری کے بعد نہایت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ دانیال، فریال کے حسن جاوداں میں کھو سے گئے تھے۔ انہیں آج بہت فخر ہو رہا تھا کہ فریال ان کی چاہت ہے۔ دانیال کن اکھیوں سے فریال کو دیکھتے اور زیر لب مسکراتے رہے۔ یہ سب کچھ ممانی جان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہیں آنے والے خطرات کا قبل از وقت اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا اکلوتا سپوت فریال کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے اور ان کو دانیال کی نظروں کے تعاقب میں فریال کا دمکتا وجود بھی دکھائی دے رہا تھا۔ فریال نے جس قدر قیمتی لباس پہن رکھا تھا اس کے پیچھے دانیال کی چاہت کو بھی وہ بخوبی سمجھ چکی تھیں۔

مگر ایسا موقع نہ تھا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار برملا کرتیں، بالآخر شزاء ماں باپ کی دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہو کر پیا دیس سدھار گئی۔ گھر ایک دم ہی سونا سونا سا لگنے لگا تھا۔ شبانہ آپی بھی شام تک اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ ہر سو جامد خاموشی چھائی تھی۔ پھر یہ خاموشی ممانی جان کے ایک زلزلے سے ٹوٹ گئی۔ ان کا فیصلہ تھا کہ فریال کو ابھی اور اسی وقت ماموں اس کے ددھیال میں چھوڑ کے آئیں۔ ماموں جان عجیب کشمکش کا شکار تھے۔ ایک طرف عزیز بھانجی تھی اور دوسری طرف بیگم تھیں۔

''بس بہت ہو چکا سال بھر کا کہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ عمر بھر کے لیے سینے پر مونگ دلنے کے لیے آئی ہے۔'' ممانی ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر با آواز بلند بول رہی تھیں۔

''اری نیک بخت کچھ تو خوفِ خدا دل میں رکھ، وہ یتیم و بے آسرا بچی کہاں جائے گی؟ دو وقت کی روٹی کے سوا کیا مانگتی ہے وہ، پھر وہ میری ذمہ داری ہے میں سگا ماموں ہوں اس کا۔'' ماموں جان فریال کی وکالت کر رہے تھے مگر لہجہ اس قدر کمزور تھا جیسے خود پر یقین ہی نہ ہو کہ وہ یہ منوا بھی سکیں گے کہ نہیں۔

''یہ میرا آخری فیصلہ ہے یہ لڑکی اب مزید اس چھت کے نیچے نہیں رہے گی۔'' ممانی جان نجانے کیوں اتنی سخت دل ہو گئیں تھیں۔ ہر دلیل ہر جواز ان کے سامنے بے سود تھا۔

مگر دانیال سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے فی الوقت وہ خاموش تھے کہ ماموں جان تو بول ہی رہے تھے اپنی بھانجی کے حق میں۔

''ابو! امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور پھر ہم نہیں چاہتے کہ اس لڑکی کی منحوسیت کا سایہ ہم سب پر پڑے۔'' شبانہ نے جاہلیت سے کہا۔ دانیال کو یہ بات سخت ناگوار خاطر گزری۔

''امی جان! میں کافی عرصہ سے آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔ کسی اچھے موقع کے انتظار میں تھا۔ میرا خیال ہے آج وہ موقع آن پہنچا ہے میں فریال کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اب وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں اسی گھر میں رہے گی۔''

دانیال نے بالآخر وہ بات کہہ دی جسے عیاں کرنے سے وہ خود بھی ڈرتے تھے کہ فریال کی زندگی پہلے ہی کس قدر کٹھن دشوار گزار تھی۔ ان کی محبت کے معلوم ہونے کے بعد حالات مزید نہ بگڑ جائیں۔ ماموں جان کے چہرے پر خوشی کے رنگ رقصاں تھے۔ انہیں اپنے بیٹے سے اتنی اچھی بات سننے کی شاید توقع نہ تھی مگر وہیں زہرہ بیگم نے سخت برا منایا۔

''دیکھ رہے ہیں آپ، آپ کی عزیز از جان بھانجی نے کیسے ڈورے ڈالے ہیں میرے بیٹے پر۔ کس قدر بے شرمی سے ماں کے سامنے اظہار محبت کر رہا ہے یہ تربیت کر کے مری ہے اس کی ماں۔'' زہرہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

''امی! مجھے فریال نے کچھ نہیں سکھایا میں تو خود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سب کہہ رہا ہوں۔ آپ کا اور سب گھر والوں کا ناروا سلوک تو میں کافی عرصے سے دیکھ اور برداشت کر رہا ہوں مگر فریال کے کردار کے حوالے سے کوئی بات کرے میں یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ اس معصوم کو تو معلوم بھی نہیں کہ میں اسے کتنی شدتوں سے چاہتا ہوں۔'' دانیال کا لہجہ جذبات کی شدت سے بھاری ہو گیا تھا۔

''تو یہ زہر بھرتی رہی ہے وہ تمہارے دل میں ہم سب کے خلاف۔'' زہرہ بیگم کا غصے سے برا حال تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دھکے دے کر فریال کو گھر سے بے دخل کر دیں۔ فرید صاحب کبھی بیوی اور کبھی بیٹے کا منہ تک رہے تھے۔ وہ اس نئی صورت حال سے سخت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ ابھی اور اسی وقت اس منحوس کو چلتا کریں، ورنہ میں خود اسے دھکے دے کر باہر نکال دوں گی۔'' ممانی جان کا طیش سے برا حال تھا۔

''امی! میری بھی ایک بات سن لیں اگر آپ نے ایسا کیا تو میں ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' زہرہ بیگم بیٹے کے الفاظ سن کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ فریال جو دوسرے کمرے میں موجود یہ ساری باتیں سن رہی تھی کمرے میں داخل ہو گئی اور اپنے دوپٹے کے کنارے سے انگلی لپیٹنے لگی۔

''ممانی جان! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں بھی اپنے چچا کے یہاں جانا چاہتی ہوں اور دانیال بھائی نے جو کہا وہ بھی میں نے سن لیا ہے مگر میرے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں ان سے شادی کی خواہاں ہوں۔ یہ ان کا یکطرفہ فیصلہ ہے جو مجھے منظور نہیں میں ابھی اور اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔ چلیں ماموں جان مجھے ابھی چھوڑ آئیں۔''

فرید صاحب اپنے بیٹے کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ تک رہے تھے وہ ایک پل میں ہی جان چکے تھے کہ ان کا بیٹا فریال کی محبت میں کس قدر آگے بڑھ چکا ہے۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زہرہ بیگم نے طمانیت کا سانس لیا اور ایک فاتحانہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر رقصاں تھی۔ یہ مات جیت کا چکر تھا۔ نہ جانے کس کی مات تھی اور کس کی جیت۔

☆......☆

یہ ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ کوئی گنجان آباد جگہ نہ تھی۔ سر شام ہی لوگ سو جاتے تھے۔ وہ بہت طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد یہاں پہنچی تھی۔ یہاں غربت و افلاس کا ڈیرا تھا۔ وہ اس کے بابا کے کزن تھے۔ دور پرے کے چچا جن کی اپنی سات اولادیں تھیں اور وہ خود معذور ہو چکے تھے اور پنشن پر گزارا ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک اور وجود کا اضافہ ان لوگوں کے لیے سخت گراں گزرا ہوگا۔ ماموں جان نے اس کے چچا کو معقول رقم بطور خرچہ دی جسے بہت اصرار کے بعد چچا جان نے قبول کر لیا۔ فریال کے سر پر چچا جان نے ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ فریال کو اب یاد آ رہا تھا کہ وہ بابا جانی اور امی کے ساتھ بہت عرصہ قبل یہاں آ چکی ہے مگر تب چچا جان معذور اور اس قدر ضعیف نہ تھے چچی جان نے اسے کمرہ دکھایا۔ کل دو ہی کمروں کا یہ مکان تھا۔ ایک میں چچا اور چچی کے علاوہ تین لڑکے سوتے تھے اور دوسرے کمرے میں چار لڑکیاں پہلے ہی سوتی تھیں جہاں اس کے لیے بھی گنجائش نکال دی گئی۔ بڑی کا نام سحر پھر مہک، شفق اور مہوش تھا۔ سب نہایت ملنسار لڑکیاں تھیں۔ سحر نے فریال کو ایک تھالی میں ساگ اور مکئی کی روٹی لا کر دی۔ فریال کو یاد آیا کہ اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب رات ہو چکی تھی اس نے باہر صحن میں آ کر نلکے کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔

فریال نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو تروتازگی کا احساس اجاگر ہوا۔ پھر کمرے میں آ کر اللہ کا نام لے کر اس نے کھانا کھانا شروع کیا بے حد لذیذ ساگ تھا۔ اس نے پوری روٹی کھائی اور رب کریم کا شکر ادا کیا جس نے ہر طرح کے حالات میں بھی رزق عطا کیا، کچھ دیر بعد چچی کمرے میں آئیں تو وہ باادب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے طائرانہ نظروں سے فریال کا جائزہ لیتی رہیں، پھر گویا ہوئیں۔

''بیٹا! میں بھی چار بیٹیوں کی ماں ہوں اور اللہ سے ڈرتی ہوں خدا کبھی کسی پر بھی برا وقت نہ لائے۔ ہمیں تمہارے آنے سے کوئی مسئلہ نہیں جو یہ بچیاں کھاتی ہیں تم بھی کھا لیا کرو مگر صرف ایک بات یاد رکھنا اس گھر کی عزت کو اپنی عزت خیال کرنا۔'' چچی جان کو نہ جانے کون سے خوف لاحق تھے مگر وہ ان کی تسلی کی خاطر بس اتنا ہی کہہ پائی کہ ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ رات گئے اسے کسی وقت نیند آئی تھی۔ نئی جگہ نیا ماحول اور تنہائی کا احساس غالب تھا۔

صبح مہوش اور دو لڑکے اسکول پڑھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ بڑی لڑکیاں گھر کی صفائی ستھرائی کرنے لگیں اور بڑا لڑکا مکینک کا کام جانتا تھا۔ وہ کام پر چلا گیا۔ فریال نے گھر کے کام کرنے کی حتیٰ الوسیع کوشش کی مگر وہ لوگ خود ہی اپنے کام کرنے کے عادی تھے۔ یوں اسے فراغت ہی فراغت رہی۔ کچھ دن تو وہ یہ سب دیکھتی رہی پھر اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اس گھر کے حالات سنوارے گی۔ یہاں اسے حقیقی اپنائیت اور عزت ملی تھی وہ بھی اس گھر کے مکینوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ سو ایک دن جب بچے اسکول جانے لگے تو اس نے بھی چچی سے اجازت طلب کی، انہوں نے بہ خوشی اجازت دے دی وہ اپنی اسناد ساتھ لے کر چل دی۔ بچوں کو کلاس روم میں چھوڑ کر وہ خود آفس میں آ گئی۔ عمر رسیدہ نیک دل خاتون اسکول کی پرنسپل تھیں۔ اس نے اپنی اسناد کی فائل سامنے رکھ دی۔ جسے دیکھ کر پرنسپل نے بہت سراہا اور معقول تنخواہ کی پیشکش کی۔ فریال بے حد خوش تھی۔ یوں اس کی زندگی نے ایک نئی جہد اپنا لی۔ صبح کے وقت وہ جاب کرتی اور شام کے وقت وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی، جس دن اسے پہلی تنخواہ ملی اس نے آ کر وہ چچی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ منظر دیکھ کر چچی بہت آبدیدہ ہوئیں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشیوں کی دعا دی۔ فریال کی آنکھیں بھی نم تھیں، سارا دن تو مصروفیت سے گزر ہی جاتا تھا مگر رات کو جب بھی بستر پر سونے کے لیے لیٹتی تو دو ڈارک براؤن آنکھیں شکوہ کناں ہو جاتی تھیں۔ ان آنکھوں کے جگنو نہ جانے کیوں مرجھائے سے لگتے۔ وہ اعتراف محبت سے ڈرتی تھی مگر یہ وہی جانتی تھی کہ وہ بھی مکتب عشق میں داخل ہو چکی ہے، ایک نام تھا جو اس کے دل پر نقش ہو چکا تھا۔ ''دانیال''۔

فریال کے جانے کے بعد دانیال کی زندگی جیسے تھم سی گئی تھی۔ سوگواریت چار سو پھیلی تھی۔ غم ہجراں نے اس کو اذیت ناک پلوں سے دوچار کر دیا تھا۔ زیست میں نارسائی کا یہ روگ نیا تھا، جہاں محبت کو پانے کی چاہ اور طلب کا سوال بن کر بھی وہ تپتے صحرا

کی مانند پیاسا تھا دانیال صبح کا گھر سے نکلتا تو شام ڈھلے ہی گھر لوٹتا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتا، اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ جتنا وقت بھی گھر میں بسر ہوتا سخت تکلیف دہ ہوتا ہر طرف فریال چلتی پھرتی دکھائی دیتی۔

فریال سے انس و محبت کا یہ ناطہ آج سے تو نہیں جڑا تھا، بہت سال پہلے جب وہ پھوپھا جان کی طرف جاتا تو فریال سے بھی ڈھیروں باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی معصوم باتیں دانیال سے شیئر کرتی تھی۔ اس کے اسکول میں آج کیا ہوا اس کی کتنی فرینڈز ہیں۔ وہ بھی تنہائی سے تنگ آتی تھی۔ اس کا بھی دل کرتا تھا کہ وہ کسی سے ڈھیروں باتیں کرے۔ اس لیے جب بھی دانیال آتے وہ ان سے فرینڈز کے قصے تک شیئر کرلیا کرتی تھی۔ دو پونیاں کیے فراک میں کسی گڑیا کی مانند اِدھر اُدھر بھاگتی وہ فریال ان کو بے حد عزیز تھی۔ اسے پھوپی جان کا گھر ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا پھوپی جان بھی دانیال کو پیار سے ہر شے کھلاتی رہتی تھیں مگر دانیال کی امی جتنی دیر وہاں ٹھہرتیں تھیں ان کا انداز احساس عظیم کرنے کے مترادف ہوا کرتا تھا۔ انہیں پھوپی کا یہ انداز نرا دکھاوا ہی لگا کرتا تھا۔ پھر ان لوگوں کا پھپھو جان کے گھر جانا خاصا کم ہوگیا۔ کافی عرصے سے اس کی جل پری سے بھی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ جب عرصہ کے بعد جانا ہوا تو وہ کومل پری اب ایک اپسرا میں بدل چکی تھی۔ اس قدر حسین اور جاذب نظر ہو چکی تھی۔ دانیال، فریال کے حسن جاوداں کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک جھجک سی تھی جو دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔ پھر جب کبھی بھی جاتے بس گاہے بہ گاہے فریال کو تکتے رہتے اور پھر واپس آجاتے۔ دل میں شدت سے خواہش جاگی تھی کہ وہ فریال کو اپنی شریک حیات بنائیں گے مگر قبل اس کے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا، اس کی پیاری پھپھو دارفانی سے کوچ کر گئیں اور

وہی دانیال اب بے بسی کی تصویر بنا تھا اور فریال پر ہونے والے مظالم کو خاموش آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہی فریال اب اس گھر سے بے وقعت اور بے عزت کر کے نکال دی گئی تھی۔ یہ ناقدری فریال کی نہیں درحقیقت ان کی اپنی ذات کی تھی۔ گھر کی ساکن فضا اور جامد خاموشی کو شزاء کی آہوں اور سسکیوں نے توڑا۔ شزاء کے سسرال والے فراڈ نکلے تھے۔ فیضان کی یکے بعد دیگرے شزاء سے پہلے پانچ شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ جہیز وغیرہ لوٹ کر سب کو طلاق دیتے رہے۔ بعض فیملیز سے باقاعدہ فراڈ کے ذریعے نقد رقم بٹورتے رہے۔ اب شزاء کو بھی گھر کی لاڈلی اور چھوٹی بیٹی سمجھ کر بہت کچھ دیا گیا تھا۔ وہ سب وہ لوگ بیچ باچ کے فرار ہو گئے تھے اور طلاق نامہ دے گئے تھے۔ شزاء کا سارا زیور بھی فیضان نے بہانے سے اپنے پاس رکھ لیا۔ فقط دو انگوٹھیاں بچی تھیں جو شزاء کے ہاتھ میں رہ گئیں تھیں۔ شزاء کے آنسو گرتے رہتے تھے اور کبھی وہ بالکل جامد سکتے کی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی۔ زہرہ بیگم اس کو دیکھ دیکھ کر روتی تھیں تو شزاء ایک دن چلا ہی اٹھی۔

''امی! آپ کیوں روتی ہیں؟ یہ سب فریال کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے، ہم سب فریال کی بددعاؤں کے حصار میں ہیں، دیکھ لیں آپ نے فریال کی جگہ مجھے بیاہ دیا اور یہ سب غم آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے مقدر میں رقم کردیے اور یہ تمغہ طلاق کا طوق ملا ہے مجھے۔''

زہرہ بیگم کا دل دکھ سے پارہ پارہ تھا۔

''بیٹا! ایسا تو مت کہو۔'' اپنی سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر وہ بلک بلک کر رو دیں۔ ابھی تو دانیال کی خستہ حالی دیکھ کر ہی وہ دن رات کڑھتی تھیں۔ ان کے ہنستے مسکراتے بیٹے کو روگ لگ گیا تھا اور اب شزا وہ لاکھ پتھر دل سہی مگر دن میں ایک وقت ایسا ضرور آتا تھا جب ان کو بھی

فریال کی آواز کی صدا لگاتے لگاتے چونک جانا پڑتا تھا۔ فریال نے جس خوش اسلوبی سے گھر کو سنبھال رکھا تھا اب وہ بھی دل سے اس بات کی قائل ہو چکی تھیں۔ اب شبانہ کے بھی روز کے چکر بند ہو چکے تھے۔ گھر میں ہر روز کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔ کیونکہ اب خدمتیں کرنے والی فریال یہاں نہیں ہوتی تھی۔

ابھی زہرہ بیگم انہی صدمات کو جھیل نہ پائی تھیں کہ شبانہ کے شوہر کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ خوب چوٹیں آئیں تھیں اسپتال میں فوراً لے جایا گیا۔ زہرہ بیگم شبانہ کو تسلیاں دے رہی تھیں مگر انہیں اپنی ہی آواز کھوکھلی لگ رہی تھی۔ اسپتال کے کوریڈور میں چلتے چلتے شبانہ تھک گئی تھی۔ ابھی تک اسفند آئی سی یو میں تھے اور ڈاکٹرز کچھ بتا نہیں رہے تھے۔ انہیں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''منحوس ہے یہ لڑکی، کھا گئی ہے اپنے ہی ماں باپ کو۔''

''ارے امی اس منحوس کو تو فارغ کریں سچ اس کی شکل دیکھ کر دل کو وحشت سی ہوتی ہے۔'' ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ ندامت اور شرمندگی کے آنسو۔

''اگر آج اسفند کو کچھ ہو گیا تو کیا لوگ مجھے بھی منحوس کہیں گے۔ خدا نہ کرے۔'' دل کانپ کر رہ گیا۔ اور وہ بے ساختہ زار و قطار رونے لگی۔ زہرہ بیگم نے بڑھ کر شبانہ کو گلے لگایا۔

''حوصلہ کرو شبانہ!''

''امی! مجھے فریال کے پاس جانا ہے۔ اس سے معافی مانگنی ہے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دوں گی میرے اسفند کو کچھ نہ ہو۔ اگر ان کو کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی امی۔'' شبانہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

بس ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جو انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ وہی ایک لمحہ تھا جس نے زہرہ بیگم کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ بہ ظاہر بیٹی کے سامنے مضبوط چٹان کی مانند کھڑی تھیں مگر درحقیقت ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ آج رب حقیقی نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ آج ان کا گھر آفتوں کی زد میں آ گیا تھا۔ کسی یتیم اور بے آسرا کے سر پر ہاتھ نہ رکھنے اس کو ذلت سے گھر سے نکال دینے کی سزا تھی جو مل رہی تھی۔ اسی وقت آئی سی یو سے ڈاکٹر باہر نکلا۔

''اسفند صاحب کی حالت اب خطرے سے باہر ہے مگر خون خاصا بہہ چکا ہے اور چوٹیں بھی شدید آئی ہیں۔ وقت لگے گا انہیں مکمل صحت یاب ہونے میں۔'' شبانہ نے بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے اور اس کے ہاتھ شکرانے کے انداز میں آسمان کی جانب اٹھ گئے۔

☆......☆

اگر زندگی کو زندگی مل جائے تو وہ ایسی ہی ہوا کرتی ہے جیسے کہ اس وقت دانیال اور فریال کی تھی۔ آج ان دونوں کا دعوت ولیمہ تھا اور دونوں کے لب مسکرا رہے تھے۔ رب کریم نے آج دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا تھا۔ زہرہ بیگم اپنے بیٹے کی خوشی کس میں ہے بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ اسی لیے ہاتھ پھیلانے اور فریال کو دانیال کے لیے مانگنے اس کی چچی کے یہاں گئی تھیں۔ ان غریب لوگوں نے بہ خوشی وہاں ہاں کر دی تھی۔ یوں یہ حسین ساعت دانیال اور فریال کا مقدر بن گئی تھی۔

دانیال مدھم مدھم گنگنا رہے تھے اور فریال شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

''میرا گیت تم ہو میرا صدا ساز تم ہو
میری ہر خوشی کا آغاز تم ہو
جینے کی وجہ جو بھی رہی ہو
میری دھڑکنوں کی آواز تم ہو''

......☆......

مون شاہ

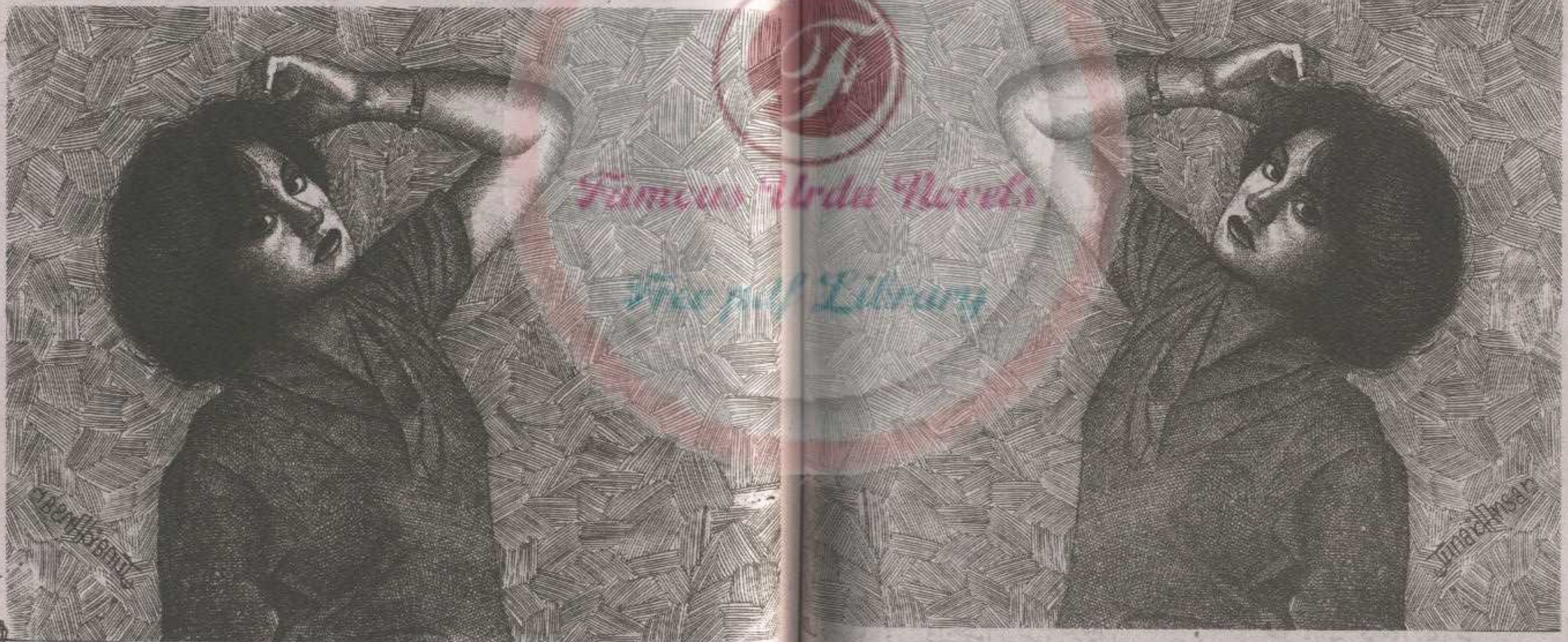
افسانہ

نگوڑی

”آداب“! معمول کے مطابق ”چاند میاں“ کی آمد پر گلناز نے چائے کی بڑی ٹرے میز پر رکھ کر ماتھے تک ہاتھ لے جا کر ”میزبانی“ کی رسم ادا کی۔ جواب میں ”چاند میاں“ نے ہمیشہ کی طرح سر ہلا دیا۔ لیکن نظریں گلناز کے سراپے پہ جمی تھیں۔ جواب دلہبار بیگم کو پان بنا کر دے رہی تھی۔ ایسی وہ کوئی حور پری نہ تھی کہ چاند میاں جو اسم بامسمی تھے، دل تھام کر رہ جاتے، لیکن پھر بھی نجانے کیوں سفید نیٹ کے آنچل تلے کھلے ہوئے اس کے کالی گھٹاؤں جیسے دراز بالوں میں ان کو اپنا دل ”گمشدہ“ مسافر کی طرح بھٹکتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔

کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کے گھیرے میں اس کا سیاہ چہرہ بھی غیر معمولی کشش یا پرکشش خال و خد سے آراستہ نہیں تھا ہاں لیکن۔

بے کشش چہرے پہ بجی اس کی بڑی بڑی زندگی سے بھرپور روشن سیاہ آنکھیں، جو گھنیری پلکوں کے بوجھ سے جھکی رہتی تھیں، کبھی کبھار جو لمحہ بھر کے لئے ان کی طرف اٹھتیں۔ تو صحیح معنوں میں چاند میاں کو تیر جگر کے آر پار محسوس ہوتے۔ ناک میں جھلملی کا ننھا سفید نگ جب دائیں بائیں حرکت کرتا تو چاند میاں کو لگتا



گویا کالی گھور رات میں ننھا سا تارا چمک کر رہبری کر رہا ہو۔

وہ بازارِ حسن میں "غزل" کی غزلوں کا چرچا سن کر آئے تھے، غزلوں کی طرح "غزل" کے حسن کی بھی دھوم مچی ہوئی تھی مگر کیا کیجیے......! غزل کی نازک اندامی، پری صورت، ناز و ادا آواز و انداز اپنی جگہ چکا چوند سہی۔ لیکن چاند میاں تو کوٹھے پہ گاہکوں کو چائے پیش کرنے والی گلناز کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ ہے ناں حیرت کی بات! کہاں گلابوں جیسی ملائم اور چاندنی جیسی شفاف غزل...... اور کہاں تاریک چہرے والی نصیب کی کالک جیسی گلناز بلا مقابلہ جیت تو غزل کی ہونی تھی، جس کے شیدائی دل قدموں پر نچھاور کرتے تھے، لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے، چنچل غزل کم گو گلناز عرف نگوڑی سے مار کھا گئی تھی۔ وہ نگوڑی جو اسی کوٹھے پر کسی پرانی طوائف کی بیٹی تھی۔ اور اب مہمانوں کو چائے پانی پیش کرتی تھی۔ یہ بات غزل کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ شکست اس کا چین و قرار چھین کر لے گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی، ایسا نہیں تھا کہ وہ مردانہ وجاہت کے حامل "چاند میاں" کو من میں بسا بیٹھی تھی، بس نگوڑی کی جیت اور اپنے حسن کی ہار اور ناقدری پہ کڑھ رہی تھی۔ اس کا غرورِ ذات کا پندار کاری ضرب سے تڑخا جا رہا تھا۔ اور دماغ یہ سوچ کر چیخ رہا تھا کہ "چاند میاں" اس کی سریلی تانوں کے دوش پہ "نگوڑی" کا چوکھٹا نظروں میں بسائے بیٹھے سر دھنتے تھے۔ غزل کے ناز و انداز اور رعنائیاں و دلربائیاں نگوڑی کی ہتھیلی میں جھولتے نگینے کی چمک کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں، اور وہ حسد کی آگ میں جل جل کر کوئلہ ہو رہی تھی۔ عاشقوں کے قصیدے آخر کار اسے پھر مرہم لگا گئے تھے، اور وہ چاند میاں کو بھول بھال کر بلکہ اپنی ناقدری کو پسِ پشت ڈال کر قدر دانوں پروانوں، اور دیوانوں کے ہجوم میں گم ہو گئی تھی۔ اور چاند میاں کئی دنوں کی طویل بحث اور ایک لاکھ کے عوض نگوڑی کو دلبہار بیگم سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ نگوڑی کی روشن آنکھوں میں حیا کی ڈوریاں کھنچ گئی تھیں۔ چاند میاں سے کورٹ میرج کے بعد "نگوڑی" گلناز چاند بن گئی تھی۔ لیکن قسمت کا کیا کیجیے کہ جب "گلناز چاند" نے چاند میاں کی ہمراہی میں گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو بانو بیگم کلیجہ پکڑ کر رہ گئیں۔

★ ★

"اے چاند میاں...... یہ "نگوڑی" کون ہے؟"

سسرال میں بھی اس کا سواگت نگوڑی کے نام سے ہوا۔ شاید بانو بیگم کو اس کی تاریک پیشانی پر کالی کمان دار بھنوؤں کے درمیان "نگوڑی" کی بندیا لشکارے مارتی نظر آ گئی تھی۔ یوں نگوڑی کی حیرانی پل بھر میں غائب ہو گئی۔ اور وہ جو نئی نئی "گلناز چاند" بنی تھی۔ اس ناز کے خمار سے نکل کر دوبارہ نگوڑی بن گئی۔

"گلناز میری بیوی ہے، میا...... میں نے اس سے شادی کر لی ہے"۔ چاند میاں نے نظریں چرا کر جواب دیا۔ بانو بیگم کے تلوؤں سے لگی سر پہ بجھی تھی۔

"میاں تمہیں اندازہ ہے کیا کہہ رہے ہو...... جاؤ اسے وہیں چھوڑ آؤ، جہاں سے لے کر آئے ہو"۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے، میں گلناز کو نہیں چھوڑ سکتا، اگر آپ نے مجبور کیا تو ہم اسے چھوڑنے کے بعد دوبارہ شادی نہیں کریں گے"۔ خاصا کمزور لہجہ تھا۔

"کہاں تو چاند میاں شادی کا نام نہیں لیتے تھے اور کہاں گلناز کو بیاہ کر لے آئے۔ بانو بیگم کے لبوں پر خاموشی کے قفل لگ گئے۔ انہوں نے کالی چادر میں لپٹی نگوڑی، کو سر تا پا دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ اور سر منہ لپیٹ کر چارپائی پر جا پڑیں۔ یہ صدمہ کم تو نہیں تھا، خاندان بھر کی حسین و جمیل لڑکیوں کو چھوڑ کر وہ بدصورت نگوڑی کو سر منڈھ لائے تھے۔ زمانے بھر کی باتوں کے خوف نے ان کا بلڈ پریشر Low کر دیا تھا۔

★ ★ ★

"چاند میاں نے شادی کر لی، وہ تو شادی کے نام سے بدکتے تھے"۔ جس نے بھی سنا انگشت بدنداں ہو کر رائے زنی کرنے لگا۔

"اب 42ویں سن میں شادی کی سوجھی تو...... اے چاند کیا چھوکریوں کا کال پڑ گیا تھا، خاندانی شرافت و نجابت کا ذرا بھر لحاظ نہ کیا"۔ دو دن تک محلے اور خاندان والیوں کا تانتا بندھا رہا، ہر کوئی نگوڑی کو یوں دیکھتا جیسے منڈی میں قربانی کا بکرا پسند کرنے آئے ہوں۔ کوئی ہاتھ پیروں پر تبصرے کرتا تو کوئی چہرے کی رنگت پر، کم عمر شوخ لڑکیوں نے تو "فیئر اینڈ لولی" استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور نگوڑی سر نیہوڑائے خاموشی سے سب سنتی رہتی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو، بانو بیگم سب کے ساتھ مل کر خوب ہنسی ٹھٹھول میں شامل ہو کر قسمت کو روتی رہتیں، اور کہتیں۔

"کالی شب اور اجلے چاند کا بھلا کیا جوڑ؟ کیسا سنگم؟" دو روز بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔ چاند میاں تو جنرل اسٹور پر چلے جاتے اور وہ بولائی بولائی سی خاندانی حویلی میں پھرتی رہتی۔ کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی بانو بیگم اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتیں۔ ان کا کہنا تھا۔

"تیرے ہاتھوں کی میل اتر کر برتنوں اور کپڑوں کو ناپاک کر دے گی"۔ وہ من ہی من میں حیران ہوئی تھی۔ آج تک اس نے تو اپنے ہاتھوں کی میل اترتے نہیں دیکھی تھی۔ اور نہ ہی دلبہار بیگم نے کبھی ایسا کہا تھا۔ بانو بیگم کا فرمان تھا۔

"سب کام صرف خاندانی عورتیں ہی کرتی ہیں اور تم کام کرنا کیا جانو"۔ سو بانو بیگم خاندانی ملازمہ کے ساتھ مل کر کام میں جتی رہتیں اور اسے دیکھ کر بڑبڑاتی رہتیں۔

"نجانے غسل بھی اچھے طریقے سے کرنا آتا ہے یا نہیں"۔ وہ لبوں کو سی کر باغیچے میں چکراتی پھرتی۔ جب تھک جاتی تو غٹرغوں غٹرغوں کرتے کبوتروں کے کابک کے پاس کھڑی ہو جاتی۔ اسے سفید بے داغ نرم پروں والے کبوتروں کی سرخ ٹانگوں میں گھومتے سبز نیلے چھلے بڑے بھلے لگتے۔ کبوتروں کے ناز نخرے۔ اور ان کے بچوں کے چونچلے...... وہ انہیں دیکھ کر مسکراتی رہتی، پھر جی بھر جاتا تو مستانہ چال چلتے موروں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ موروں کا ناچ اسے پسند تھا، اور اس کے پیر بھی تو مور جیسے ہی تھے۔ یا شاید ان میں اور نگوڑی میں رنگوں کی خوبصورتی کا فرق تھا، یہ سوچ کر وہ ہنس پڑتی، اور آنکھوں کے نم گوشے دوپٹے کے پلو سے صاف کر لیتی۔ اور ایک بار پھر موروں کا رقص اشتیاق سے یوں دیکھتی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ رنگین پنکھوں کی رنگینی میں اسے اپنے غم بہت پھیکے پڑتے محسوس ہونے لگتے۔ تخت پر چھالیہ کترتی بانو بیگم اسے "خبطی"، "دیوانی" اور "پاگل" کے القابات سے نوازے جاتیں، واحد چاند میاں کی محبت اس کے لئے حبس میں بادِ صباء کا جھونکا تھی۔ لیکن یہ جھونکا بھی اکثر اوقات بانو بیگم کی تیز نظروں کی نذر ہو جاتا۔ اور وہ چاند میاں کی میٹھی نظروں سے جی بہلا لیتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی چاند میاں مجبور سہی لیکن اسے پوری سچائی کے ساتھ چاہتے ہیں۔ انہیں امید تھی کہ بانو بیگم، گلناز کو قبول کر لیں گی۔ قبولیت کا یہ انتظار سولی پر لٹکنے کے مترادف تھا۔ چاند میاں چوری چھپے اسے صبر کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ بھلی لوک صبر کی تلقین کی خاص ضرورت مند بھی نہ تھی۔ کیونکہ صبر تو اس نے پیدائش کے ساتھ ہی کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کا معمولی وجود کوٹھے والوں کے لئے بھی کھوٹا سکہ تھا۔ خیر جو بھی تھا

بانو بیگم میں اگر خاندانی شرافت ونجابت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔تو ''صبر وشکر'' کا مادہ قدرت نے ''نگوڑی'' میں لبالب بھر رکھا تھا۔ وہ عبادتوں میں مصروف ہوگئی، لمبی لمبی دعاؤں میں نجانے کیا مانگتی رہتی، پھر یوں ہوا کہ بانو بیگم کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی، ان پر فالج کا اٹیک ہوا، خاندانی عورت بستر کی ہو کر رہ گئیں، اور نگوڑی کی محتاج بھی...... نگوڑی نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ رکھی۔ سب خاندانی کام نگوڑی کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ بانو بیگم خاموش تماشائی بنی دل ہی دل میں جلتی رہتیں۔ بہترین علاج کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ بانو بیگم جو قوت گویائی سے محروم ہوگئی تھیں، اب کچھ نہ کچھ بول لیتی تھیں۔ وہ ''بول'' نگوڑی پر طنز وطعن کے نشتروں کے سوا کیا تھے؟ خیر نگوڑی خاندانی کاموں کے کرنے کو اعزاز سمجھتے ہوئے سب کچھ سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی۔ اسے خوشی تھی، کہ وہ پالی کے سرخ منقش مٹکوں کو اپنے ہاتھوں سے بھر کر موتیے کے ہار ان کے گلوں پر سجاتی ہے۔ بانو بیگم کا پاندان تیار کرتی ہے اور تو اور چاند میاں کی محبت وقربت کے جھونکے والہانہ ریشم کی طرح گدگداتے ہیں۔ وہ رب کا شکر ادا کرتی تھی۔ چاند میاں اسے دیکھ کر مسرور ہوتے تھے آج بھی ان کے دل میں نگوڑی کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ میا کی مناسب دیکھ بھال نے اس کی ''قدر'' میں اضافہ کیا تھا۔ لیکن افسوس میا کو بستر پر بھی چین نہ پڑا، اور وہ چاند میاں کی دوسری دلہن کی تلاش میں اپنی ہمشیرہ کو دوڑانے لگیں۔ چاند میاں کے دوٹوک انکار پر بھی انہوں نے کمر کس لی تھی۔ جذباتی باتوں، وارث کی خواہش قسموں کے حربے آزما آزما کر انہوں نے چاند میاں کو منا کر دم لیا۔ چاند میاں کی دوسری نصف بہتر شگفتہ اپنے نام کی طرح شگفتہ تھی۔ خوبصورتی کا کامل نمونہ، نزاکت کا عکس...... اور سب سے بڑھ کر خاندانی ہونے کی مہر اس کی چاند ایسی جبیں پر ثبت تھی۔ شگفتہ حسن کا ایسا ہتھیار تھی، جس کے جلوے اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیں، انہوں نے چاند میاں کو مٹھی میں کرنے کے ہزار ہا جتن کئے لیکن چاند میاں تو اپنی چکوری کے دیوانے تھے۔ شگفتہ کے حسن کی بھول بھلیاں انہیں نگوڑی کے سحر سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں، شگفتہ تلملا کر کہتی۔

''کالا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے''۔ نگوڑی ہر وار چپکے سے سہ جاتی۔ شمع کی طرح جلتی رہتی، اور ملازمہ کے ساتھ عام سی کنیز بنی شگفتہ کے ہاتھوں مذاق کا نشانہ بنتی رہتی۔ چاند میاں کو بہت اکسایا کہ ''نگوڑی آپ کے قابل نہیں ہے۔ حضور اسے طلاق دیجئے''۔ لیکن چاند میاں کی ایک چپ۔ وہ شگفتہ کے حسن کے جال اور طراری کی چال میں ہرگز نہیں آئے تھے۔ وہ بھلے قیمتی پشاکیں، زیورات سے لد کر سامنے آجاتی تابناک حسن روشنیاں بکھیرتا، وہ توجہ نہ کرتے اور محویت سے نگوڑی کی سیاہیوں کو تکے جاتے۔ جس کی تھلی کا سفید نگینہ آج بھی بھولے ہوؤں کو راستہ یاد دلاتا تھا، بھٹکے ہوؤں کی رہبری کرتا تھا۔ شگفتہ رانی اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آچکی تھی، ایک طرف نگوڑی من جلاتی تھی اور دوسری طرف بیمار فالج زدہ میا...... کے احکام اسے ناگوار گزرتے۔ بانو بیگم چاہتی تھیں اب نگوڑی کام نہ کرے بلکہ خاندانی بہو شگفتہ رانی کام کاج انجام دے۔ نوکر بننا اسے کب گوارا تھا وہ تو محلوں میں رانیوں کی طرح رہنے کے لئے دنیا میں آئی تھی۔ بانو بیگم اس سے وارث چاہتی تھیں۔ مگر رپورٹ کے بعد پتہ چلا وہ ''بانجھ'' تھی...... بے شجر ثمر اتنی کامل اور یہ کمی! قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ بانو بیگم نے چپ سادھ لی، کچھ ہاتھ نہ آیا تھا، کوئی مقصد پورا نہ ہوسکا۔ اور شگفتہ بھی کون سی مطمئن تھی، دو سال بمشکل گزار کر آزادی کا پروانہ تھامے شکر کرتی میکے روانہ ہوئی تھی، نگوڑی کو بھلا ''سوت'' کے آنے جانے سے کیا فرق پڑتا''، اسے تو ہر حال میں نگوڑی بن کر جینا تھا۔ نگوڑی کی اس خزاؤں جیسی زندگی میں بہار تب آئی جب اس کا پیر بھاری ہوا، پہلی بار اس کا من چاہا وہ خوشیوں کے پنڈولے میں بیٹھ کر چاند میاں کے ہمراہ افق کے پار اتر جائے، یا دودھیا ''آسمانی چندا'' کو چھو آئے اور کچھ نہیں تو موروں کی طرح رقص کرے یا پھر غزل کی طرح کوئی غزل گائے۔ چاند میاں کو ادائیں دکھائے، لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کرسکی، لاج کے رنگوں سے تمتاتے چہرے کو ہاتھوں کی اوک میں چھپا کر وہ بس اتنا کہہ سکی۔

''پروردگار ہمیں صاحب اولاد کرنے والا ہے''۔ اور چاند میاں نے نگوڑی کے ہاتھوں کو دیوانہ وار تھام کر وارفتگی سے چوما تھا۔ نگوڑی نے شرما کر ہاتھ چھڑائے اور چاند میاں نے اس کی نیم سیاہ پیشانی پر روشن ''لمس'' عطا کیا، گویا یہ خاندانی ہونے کی سند ہو۔

''میا گلناز ثمر بار ہوگئی ہے، آپ کا وارث دنیا میں آنے والا ہے''۔ چاند میاں نے جب بانو بیگم کو بتایا تو وہ کراہ اٹھیں۔

''کیا...... ہمارا وارث نگوڑی کے بطن سے جنم لے گا، چاند میاں تم اس کو ختم کروادو...... ہم میں مزید صدمہ اٹھانے کی سکت نہیں ہے، کالے پیلے وارث مجھے نہیں چاہئیں، مجھے خاندانی عورت کے وجود سے تمہارا وارث چاہئے''۔ نگوڑی نے سسکیوں کو بمشکل گھونٹا۔ جانے اب کیا ہوگا؟ لیکن چاند میاں اس کی ڈھال بن گئے۔ اس کی ممتا کا خون ہونے سے بچ گیا وہ پہلی بار مضبوط لہجے میں بولے۔

''بھلے کالا ہو یا گورا وہ میرا خون، میرے جگر کا ٹکڑا، میرا وارث ہے، کوئی باپ اپنی اولاد کو موت کے گھاٹ بدصورتی کے خوف سے نہیں اتارتا، میں ہرگز بھی اس قبیح فعل کو انجام نہیں دوں گا''۔ نگوڑی نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب نگوڑی گل گھوتنے بچے کی ماں بن گئی۔ بچہ کیا تھا چاند کا ٹکڑا، ہو بہو چاند میاں کا عکس۔ روئی کے گالوں کی طرح نرم۔ چاند کی طرح اجلا، سرمئی آنکھیں کھول کر جب میا کو دیکھا تو ساری کثافتیں دھل گئیں...... بانو بیگم کے سارے خوف، خدشے، فکریں ختم ہوگئیں۔ انہوں نے شادمانی کے ساتھ منے کو گود میں لینے کی فرمائش کی۔ تو چاند میاں نے مسرور ہو کر منا بانو بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ میا حیرانی سے بولیں۔

''اے نگوڑی! یہ کیسا کارنامہ تو نے انجام دیا، سچ بتائیو، اتنا سندر بچہ تیرے وجود سے کیسے پیدا ہوا؟''

نگوڑی تمام درد بھلا کر ہلکا سا مسکرائی۔ ممتا کا نور اس کے چہرے کو اجال رہا تھا، چاند میاں اسے محو ہو کر دیکھ رہے تھے ان کی آنکھیں نگوڑی کو آزمائش ختم ہونے کا پیام دے رہی تھیں۔ نگوڑی نے متانت سے جواب دیا۔

''میں روزانہ سورہ یوسف کی تلاوت کرتی تھی''۔ بانو بیگم وارث ملنے کی خوشی میں بے اختیار کہہ اٹھیں۔

''آج سے میں تمہاری بھی میا ہوں، اور ہماری گلناز تو بڑی بھاگوان ہے''۔ بانو بیگم کا کہنا تھا کہ نگوڑی ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ وہ اتنا ہنسی کہ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

'' بیگم صاحب ! مجھے نگوڑی رہنے دو، کہوناں۔ نگوڑی''۔ یہ کہہ کر وہ ہنستی جاتی تھی۔ تھلی کا نگینہ حرکت کرتے کرتے کہیں گر گیا تھا، بانو بیگم حیرانگی سے اس کی پاگلوں والی حرکتیں دیکھ رہی تھیں، چاند میاں پژمردہ اور اداس بیٹھے تھے کیونکہ چاند میاں سمجھ گئے تھے کہ رہبری کا تارا کھو گیا ہے...... اور نگوڑی بھاگوان ہونا سہار نہیں پائی اس لئے ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔

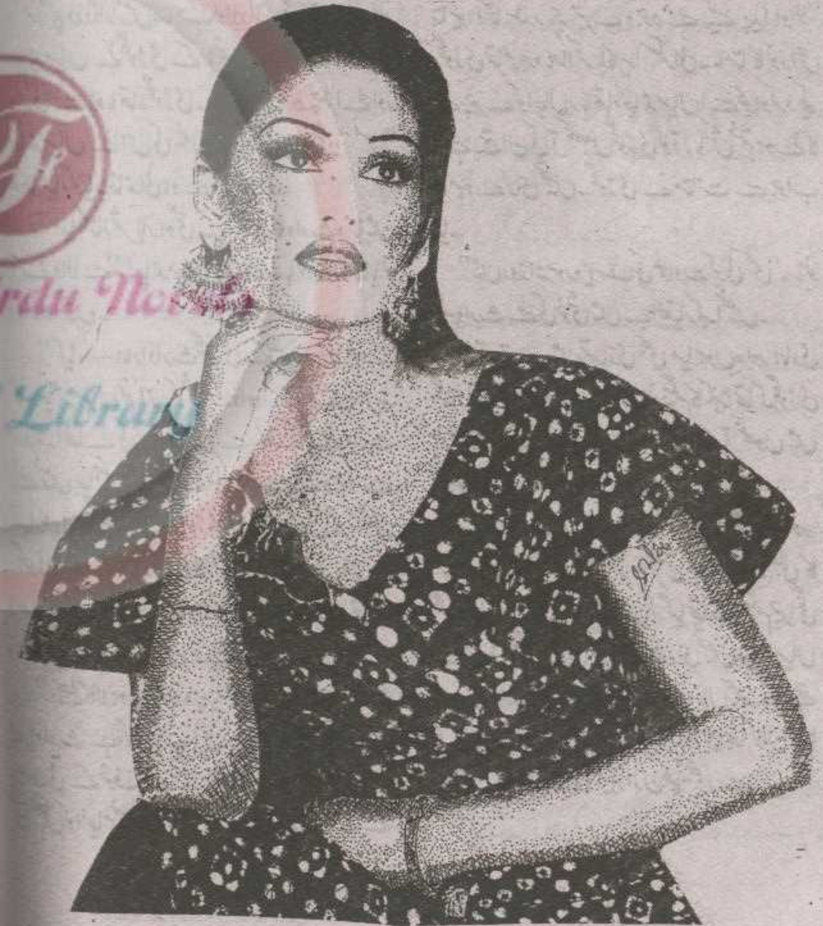
......☆......

شہلا گل سحر صالح

افسانہ

محبت دکھ دیتی ہے

دل و دماغ کی جنگ بھی عجیب شے ہے، سوچیں آبشار بن کر دل پہ گرتی ہیں بوند بوند دل کو پگھلاتی ہیں، جذبات کے مدوجزر میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، آنسو منجمد ہوجاتے ہیں، آنکھیں بے نور ہوجاتی ہیں، آنسو قطرہ قطرہ اندر گرتے ہیں مگر دل سے زیادہ ضدی کوئی چیز نہیں ہے، نہ اس کے جذبات میں فرق آتا ہے، اور نہ اس کی دماغ سے مفاہمت ہوتی ہے، چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا ہے مگر پورے کروفر سے پورے وجود پہ حکومت کرتا ہے۔ انسان بھی اکثر اس لوتھڑے کے ہاتھوں بے بس نظر آتا ہے۔ اشمل یوشع بھی تو اس دل کے ہاتھوں خوار ہوئی تھی۔ شادی کے بعد یوشع سے اس کی محبت دگنی ہوگئی تھی، مگر یوشع درانی کی والہانہ محبت بلکہ دھواں دار عشق پہ سرد کہر کیوں جمتا جارہا تھا وہ یہ نہیں جانتی تھی، حالانکہ اس کی شادی کو صرف دو ماہ ہی ہوئے تھے۔







شادی سے پہلے وہ یوشع کے نرم گرم جذبوں سے پسینہ پسینہ ہوجاتی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر وہ اسے ہوش کی دنیا میں لے آتی۔ وہ اس کا جنون تھی، اب ایک عام عادت بن گئی تھی، اشمل کی کزنز اور فرینڈز اس پر رشک کرتی تھیں، چاہے برتھ ڈے ہو یا ویلنٹائن، عید ہو یا کوئی خاص موقع، یوشع اس کے لئے تحائف کے انبار لگا دیتا، اس کی پسند کی چاکلیٹ، چپس، اسپاؤٹ کے ڈھیر لگے ہوتے اس کے پاس، دنیا کی ہر خوشی وہ اس کے قدموں میں لا کر رکھ دینا چاہتا تھا، کبھی کبھی اشمل کو اس کی دیوانگی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ خود بھی

یوشع کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی تھی، مگر ہر چیز کی زیادتی نقصان کا سبب بنتی ہے۔ وہ یہ بات بھی جانتی تھی۔

"دیکھو اشمل! شادی سے پہلے سارے جذبات لٹا دیئے جائیں تو بعد کی زندگی پھیکی پھیکی رہتی ہے، اتنا یوشع کے آگے مت جھکو قبل از وقت کہ اس کے دل میں تمہاری کشش برقرار نہ رہے، اس کی بھی مانو اور اپنی بھی منواؤ۔ بعض اوقات دوریاں قربتوں کو بڑھا دیتی ہیں، اور بعض اوقات قربتوں میں ہی دوریاں جنم لیتی ہیں، بعد کے پچھتانے سے احتیاط کا دامن تھامے رہنا بہتر ہے۔ اس کی چچازاد حمنی اکثر اسے سمجھاتی۔

"مگر یوشع کی ہٹ دھرمی کے آگے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سرنگوں ہی رہتی۔ اس نے رخ موڑ کر ایک نظر بے خبر سوئے یوشع پر ڈالی۔

"اشمل! میں سوچتا ہوں کہ شادی کے بعد تم ہر رات کو میرے پہلو میں ہو گی تو نیند کس کافر کو آئے گی"۔ یاد کا ایک کوڑا لہرایا اور ایک اداس آنسو اس کی پلکوں سے ڈھلک کر اس کے گریبان میں جذب ہو گیا۔ اس کی نیند کہیں کھو سی گئی۔ اس کی بھٹکتی سوچیں اور ماضی کی سلگتی یادیں اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے گئیں۔ اشمل لغاری کا تعلق ایک بھرے پرے اور خوشحال گھرانے سے تھا، وہ ایم اے اکنامکس کی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ایک گھر کے دو پورشن میں دو فیملیز رہائش پذیر تھیں ایک حصے میں اشمل اپنے والد ہمایوں لغاری والدہ اور دو جڑواں بھائیوں حسن اور احسن کے ہمراہ رہتی تھی۔ اور دوسرے پورشن میں اس کے چچا مامون لغاری اپنی مسز اور دو بیٹیوں حمنی اور نائمہ اور دو بیٹوں معیز اور مومن کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر صفیہ پھپھو کا گھر تھا۔ جن کے ہزبینڈ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بڑے بیٹے یوشع اور دو بیٹیوں ارم اور کرن کے ساتھ آسودہ زندگی گزار رہی تھیں۔ یوشع ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا، ارم گرلز کالج میں لیکچرار اور کرن بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اشمل کے والد اور چچا کا شراکت میں لیدر کا کاروبار تھا، اور زندگی ہر دکھ سے مبرا تھی، ان سب کزنز میں بہت پیار اور اتفاق تھا۔ اشمل کی بچپن ہی سے یوشع سے بات طے تھی وہ اس کا بے حد دیوانہ تھا۔

......☆......

"اشمل اترو نیچے کوئی اور کام بھی ہے کہ نہیں نماز بھی قضا کر دی، کم سے کم شام کے کھانے میں تو میری مدد کر دو"۔ امی کی پکار پہ اشمل گڑبڑا گئی۔

"بس ناں یوشع بند کرو ناں فون، دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں ہمیں بات کرتے ہوئے"۔ وہ یوشع کی کال آنے پر گزشتہ دو گھنٹوں سے اوپر چھت پہ ٹہل رہی تھی۔

"نہیں یار ابھی میرا دل نہیں بھرا کہہ دو اپنی والدہ محترمہ اور میری پیاری ممانی جان سے کہ میں کسی غیر سے نہیں اپنے شوہر سے بات کر رہی ہوں"۔

"آپ دن بھر بھی مجھ سے بات کرتے ہیں، اور رات نیٹ پر بھی لمبی چیٹ کرتے ہیں، گھر والے ناراض رہنے لگے ہیں"۔ اشمل روہانسی ہو گئی۔ یوشع کی وقت بے وقت کال کی وجہ سے وہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتی تھی، نہ کھانا کھا سکتی نہ نماز پڑھ سکتی نہ کسی فنکشن پہ جا سکتی۔

"او کے، او کے زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں، اس قدر عاجز آ گئی ہو تو پھر فون نہیں کروں گا۔ میرے پیار کو تو تم ویسے بھی مذاق سمجھتی ہو"۔ فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔ اور اشمل سر تھامے رہ گئی۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ تھوڑا سا آرام کی غرض سے لیٹی تھی کہ سیل پہ بجنے والی ٹیون نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔ اس نے اسکرین پہ نمبر چیک کیا۔ اس کی ماموں زاد عطیہ آپی کا فون تھا۔ اس نے بے دلی سے کال پک کی۔

"ہاں اشمل گڑیا! کیسی ہو؟" عطیہ آپی کی کھنکتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ٹھیک ہوں آپی! آپ اپنی سنائیں"۔ اس نے بھی فارمیلٹی نبھائی، نیند سے آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ رات لیٹ آور تک یوشع سے بات ہوتی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ صبح کلاس میں لیکچر بھی اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔

"ڈیئر پھپھو کا نمبر بہت ٹرائی کیا مگر بند جا رہا ہے۔ میں تم لوگوں کو انوائیٹ کرنا چاہ رہی تھی، کہ پرسوں صبح 9 بجے کی فلائیٹ سے ابو اور امی حج سے آ رہے ہیں اور سیکنڈ ٹائم ہم نے دعوت رکھی ہے، آپ سب نے ضرور آنا ہے"۔ عطیہ آپی کی بات کے دوران ہی یوشع کالنگ اسٹارٹ ہو گئی، ڈر کے مارے اس نے کال ڈراپ کر کے یوشع کی کال پک کر لی۔

"کیوں نمبر بزی تھا کس سے بات کر رہی تھیں"۔ یوشع کی غصیلی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

"وہ بڑے ماموں کے گھر سے کال تھی وہ لوگ حج سے آ رہے ہیں، تو انویٹیشن دے رہیں تھیں"۔ وہ بے قصور ہو کر بھی گڑبڑا گئی۔

"میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ تمہارے سیل پر صرف میری کال آنی چاہئے اور بس کسی ایرے غیرے کی نہیں"۔ یوشع نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ چپ ہو گئی اس کا یہ لہجہ اس کا دل کاٹ کے رکھ دیتا تھا۔

"اور ہاں سنو آرام سے اپنے گھر رہو۔ جانے کی ضرورت نہیں، حمنی آ جائے گی تمہارے پاس"۔

"مگر یوشع...... امی خفا ہوں گی"۔ اس نے احتجاج کیا۔

"بس کہہ دیا سو کہہ دیا کوئی بحث نہیں"۔ ساتھ ہی فون ڈسکنکٹ ہو گیا۔

......☆......

ہلکے فیروزی آٹھ کلی فراک جس کے گلے اور دامن پر سلور کلر کے نگوں کا فینسی کام ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور سلور کھسے پہنے اشمل ہلکے میک اپ اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی، وہ لوگ دعوت کے لئے نکلنے ہی والے تھے کہ اشمل کو بہت زور سے چکر آیا، اور وہ ادھر ہی بیٹھ گئی، امی بری طرح گھبرا گئیں۔ فریج سے جوس نکال کر اسے پلایا۔

"اشمل! طبیعت زیادہ خراب ہے تو پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں"۔ امی نے اس کا سر دبایا۔ تو بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"نہیں امی! آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی، آپ جائیں ماموں لوگ خفا ہوں گے۔ میرے پاس حمنی ہے ناں"۔ وہ حمنی کی طرف اشارہ کرتے بولی۔ تو حمنی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ کیا مذاق ہے اشمل ہے۔ تم نے یوشع کی خاطر چچی کو چند لمحوں میں کتنا پریشان کر دیا۔ وہ اب وہاں بھی مطمئن نہیں ہوں گی، بولو یوشع کہ ابھی تم ماں کے گھر ہو تم پر روک ٹوک کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ کبھی ٹیسٹ کا بہانہ، کبھی پیٹ درد کبھی بخار، کتنا جھوٹ بولو گی اس بے مروت کے لئے، سارے رشتے اس کے لئے تم تیاگ رہی ہو"۔ حمنی تنہائی ملتے ہی اس پر چڑھ دوڑی۔ اس نے نم آنکھوں سے حمنی کی طرف دیکھا جس کا صاف مطلب تھا، کہ وہ یوشع کو کسی قیمت پر بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کال بیل کی آواز پر دونوں چونکیں۔

"میں دیکھتی ہوں چچی ہوں گی شاید کچھ بھول گئی ہوں، تم مرو ادھر"۔ حمنی نے تیزی سے باہر نکل کر گیٹ کھولا، تو یوشع کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ غصہ تو بہت آیا کہ دو تین کھری کھری سنا دے۔ مگر اشمل کی وجہ سے خاموش رہی۔

"محترمہ مراقبے سے باہر آ کر اندر آنے دیں گی آپ"۔ یوشع نے اسے گم صم دیکھ کر طنز کیا۔

"چچی لوگ نہیں ہیں گھر پر دعوت پر گئے ہیں"۔ دراوزے سے ہٹتے ہوئے اسے جتا دیا۔

"میں اپنی بیوی سے ملنے آیا ہوں آپ کو کوئی اعتراض"۔ اس نے حمنی کو چڑایا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے"۔ اس نے رکھائی سے کہا۔

"تو بستر ہونے کا حق ادا کر کے ذرا آپ چائے اور پکوڑے بنانے کا اہتمام کریں گی میرے لئے موسم بھی بڑا خوشگوار ہو رہا ہے"۔ یوشع نے مزے سے آرڈر کیا۔ تو حمنی پیر پٹختی کچن میں چلی گئی۔ وہ پلکیں موندے لیٹی تھی۔ فیروزی کلر اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ خوبصورت چہرہ، ہلکے پھلکے لوازمات کے ساتھ دہک رہا تھا۔ براؤن سلکی بال اس کے چہرے پر بکھرے تھے۔ یوشع نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ بغیر آہٹ اس کے پاس آیا، اور جھک کر اس کے ماتھے سے بال سمیٹتے ہوئے آہستگی سے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اشمل نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں۔ کلون کی مہک اس کی سانسوں میں اتر گئی تھی، گل رنگ چہرے اور دھڑکن کو سنبھالے وہ بستر سے اتر کر یوشع سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہوگئی، اس نے اپنا دوپٹہ اچھے سے پھیلا لیا۔ یوشع سے نظریں ملانا سخت مشکل لگ رہا تھا، یوشع نے سارا منظر پیار سے دیکھا اور تھوڑا اس کے پاس آیا اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا کہ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یوشع مجھے قبل از وقت یہ سب پسند نہیں، پلیز خفا مت ہونا"۔ اتھل پتھل دھڑکنوں کو سنبھالتے وہ رخ موڑ گئی۔ "مگر میرا تم پر پورا حق ہے اشمل"۔

"کون سا حق آپ کا اور میرا فی الحال کوئی ایسا شرعی رشتہ نہیں ہے"۔ یوشع کی بات اس نے کاٹی، ماں کے ساتھ جھوٹ بولنے پر پہلے ہی سے اسے غصہ آیا ہوا تھا۔

"آپ رخصتی لیں پھر مجھ پر ہر قسم کا حق جتائیں"۔

"اوہ تو ٹھیک ہے جو کام چھ مہینے بعد طے پانا تھا، اب انشاءاللہ اسی ہفتے کے آخر میں انجام پذیر ہوگا۔ بہت جلد آپ اشمل یوشع بن کر میری بانہوں کی قید میں ہوں گی"۔ یوشع نے اچٹتی نظر اشمل کی پشت پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ چائے بناتی حمنی نے یوشع کے خطرناک تیور دیکھے تو چولہا بند کر کے اشمل کے لئے بھاگی۔ جو حمنی کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ اور حمنی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے تھپکنے لگی۔

☆......☆......

یوشع نے جو کہا وہ کر دکھایا، ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ روتی دھوتی اشمل یوشع بن کر اس کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ اس کا ایگزیم ادھورا رہ گیا۔ ساری رسموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اب یوشع کا انتظار کر رہی تھی۔ گلاب اور موتیے کے پھولوں سے مزین سیج اور کمرے کی ڈیکوریشن بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک اچٹتی نظر اپنے کمرے پر ڈالی اور بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگالی۔ قدموں کی آہٹ پر وہ جلدی سے سیدھی ہوئی اور گھونگھٹ میں چہرہ اور بھی جھک گیا۔ یوشع آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"خوش آمدید مسز اشمل یوشع اپنے وعدے کے مطابق ہم اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے روم اور اپنی زندگی میں بھی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں"۔ یوشع نے اس کے ہاتھ تھامے اور دو خوبصورت گولڈ کے کنگن پہنا دیئے۔ اس کے لرزتے ہاتھ یوشع نے مضبوط گرفت میں لے لئے۔ اس کا شعلہ جوالہ روپ یوشع کو شرارت پر اکسا رہا تھا۔ عروسی لباس اور ہار سنگھار سے آراستہ اشمل یوشع کی استحقاقانہ نظروں اور بے باک جسارتوں سے جیسے چھوئی موئی بن گئی۔

"اشمل یوشع کیا اب میں آپ کو شرعی حق سے چھو سکتا ہوں"۔ ساتھ اس کے چہرے پر جھک کر جو اس نے بے باک جسارت کی، تو اشمل کے تو حیا سے ہوش ہی اڑ گئے۔

"پلیز یوشع!" اشمل نے سے دھکیلنا چاہا مگر اس کی مضبوط گرفت میں بے بس ہوگئی۔ یوشع کی گرم گرم سانسوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا اور اس کی سرگوشیاں پوری رات اس کے کانوں میں رس گھولتی رہیں، سارے گلے شکوے دور کہیں کھو گئے تھے۔ شادی کے پندرہ دن یوشع کے طلسمی لمس میں کھو کر اسے کچھ نہ پتہ چلا۔ مگر دھیرے دھیرے یوشع کے مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔

"ہر چیز اس وقت تک نایاب ہوتی ہے جب وہ گرفت میں نہ ہو حصول کے بعد اور ملکیت بننے کے بعد وہ عام ہو جاتی ہے"۔ تھوڑا دیر سے اٹھنے پر یوشع کی باتیں شروع ہو جاتیں۔

"مسز یوشع اٹھ جائیں نمازیں تو ویسے بھی بخشوائی ہوئیں ہیں آپ نے کم سے کم میری ماں کا ہاتھ ہی بٹا دیا کریں"۔ اس کا طنزیہ لہجہ اسے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہ تو اس کے بے تحاشہ پیار کی عادی تھی۔ روٹین میں آکر اس نے پھپھو کے ساتھ سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ صبح کام ختم کر کے پھپھو عبادت میں لگ جاتیں تو وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتی یا پھر گھر فون کر لیتی۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ یوشع پھر سے اس سے باتیں کر کے گھنٹوں محو گفتگو رہیں۔ مگر یوشع نے آفس ٹائم فون پہ سخت منع کیا تھا۔

"محترمہ! گھر داری میں دل لگاؤ اب ویسے بھی میں آپ کے نام ہی لکھا جا چکا ہوں"۔ وہ آرام سے جان چھڑا لیتا۔ ایک رات جب یوشع لیپ ٹاپ پر آفس ورک کر رہا تھا، تو اس نے یوشع کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اتنا کہا۔

"یوشع! ہم ہنی مون پر کب جائیں گے"؟

"یار میرے پاس ٹائم نہیں ہے، آفس میں کام بہت ہے اور ویسے بھی مجھے یہ ٹائم اور پیسوں کا زیاں ہی لگتا ہے"۔ یوشع نے لیپ ٹاپ پر نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"مگر شادی سے پہلے تو آپ نے کہا تھا"۔ اشمل نے کہنا چاہا مگر اس نے سختی سے بات کاٹ دی۔

"اشمل! شادی سے پہلے والا چیپٹر کلوز کر دو اور ہاؤس وائف بن کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالو، مجھے ایک پرفیکٹ اور سمجھدار بیوی چاہئے کوئی الھڑ دوشیزہ نہیں"۔ اس کی تیز آواز پر اشمل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے بے اختیار حمنی کی بات یاد آگئی۔

"کہ شادی سے پہلے کی محبت اس طرح، جیسے افطاری سے پہلے کوئی روزہ افطار کرے، افطار کا مزہ بھی نہ ہو، اور گناہ کا بھی مستحق ہو۔ کفارے کا خرچ بھی اور سزا کا دھڑکا بھی ہو"۔ کفارہ تو اشمل کو عمر بھر بھرنا تھا۔ اپنے عزت نفس کی قربانی دے کر۔ اس شخص کے ہاتھوں ذلت اٹھا کر اس کے ساتھ ہی زندگی جینی تھی، یوشع نے اپنے جذبے اس پر شادی سے پہلے ہی لٹا دیئے تھے، اب اس کو گھر لا کے وہ فالتو چیز سمجھ کر بھول گیا تھا۔ اس رات کے بعد اس نے خود کو بہت بدل لیا۔ زیادہ وقت پھپھو اور پھر ارم کرن کے ساتھ گزارتی۔ اس نے یوشع سے مخاطب ہونا کم کر دیا خاموشی سے اس کے سارے کام کر دیتی تھی۔ میکے جاتی تو وہ بھی مہمانوں کی طرح ٹریٹ کرتے، امی زیادہ نہ روکتیں کہ پھپھو اکیلی ہوں گی۔ حمنی کے کندھے پر سر رکھ کر یوشع کی شکایت کی۔ تو اس نے سہولت سے سمجھایا۔

"شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے، اگر تم یوشع بھائی میں شادی سے پہلے والا یوشع ڈھونڈتی ہو۔ تو یہ تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے، پہلے تم اس کی محبوبہ اور اب تم اس کی بیوی ہو، محبوبہ کے ناز اٹھائے جاتے ہیں، اور بیوی سے ناز اٹھوائے جاتے ہیں۔ تم اس کی پسند ناپسند پر رجحان دو۔ ان کا خیال رکھو تو وہ خود بخود تمہاری طرف مائل ہو جائیں گے"۔ حمنی کی باتیں اس نے پلو سے باندھ لیں۔ وہ یوشع کا ہر کام وقت سے پہلے کر دیتی۔ اس کے آگے پیچھے گھومتی اس کی پسند کا کھانا بناتی۔ تب بھی کبھی اسے لگتا کہ وہ خود کہیں کھو گئی ہے۔ بس اسے دوسروں کو خوش رکھنا تھا اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر۔

☆......☆......

پھپھو کے ساتھ اب وہ خود بھی باقاعدگی سے نماز پڑھتی، فارغ وقت میں اسٹڈی سے جا کر اسلامی کتب کا مطالعہ کرتی، اسے دکھ ہوتا تھا کہ شادی کے بعد اس نے ڈھنگ سے کوئی نماز نہیں پڑھی تھی، شادی سے پہلے بھی یوشع کے فون کی وجہ سے اس کی کئی نمازیں قضا ہو جاتیں تھیں۔

"شاید عشق حقیقی پہ اس نے عشق مجازی کو ترجیح دی

تھی۔ ”شادی سے پہلے یوشع کی دیوانگی کے ہاتھوں حقوق اللہ کی کوتاہی کرتی تھی۔ اور شادی کے بعد وہ بیگانگی کی وجہ سے اپنے رب کو خفا کرتی تھی۔ اس کی زندگی صرف ایک شخص کے گرد گھوما کرتی تھی۔ جس کی خاطر اپنے رب کے احکامات کی بجا آوری میں سستی کی۔ اپنے خونی رشتوں کو نظر انداز کیا۔ جھوٹ بولے، مگر اس شخص نے ہی اسے اس کی اوقات دکھادی۔

”شیطان نے تو نہ قتل کیا نہ زنا کیا۔ نہ شراب پی نہ جوا کھیلا صرف ایک سجدے کے ہاتھوں رب کی نظر میں ذلیل و ملعون ٹھہرا اور وہ کتنے سجدوں کی خطاوار تھی“۔ وہ اپنے رب سے کیسے معافی مانگے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی چاہت میں منہ کے بل گرا کر اپنی چاہت اور اپنے ہونے کا یقین دلایا تھا۔ وہ نماز میں خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی، اپنی غیر حاضری کی معافی مانگتی، وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ کی معافی مانگتی۔ اپنے نفس کے تابع ہو کر جو نافرمانی کی، رب کی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش میں بھیگ کر بھی ایک کلمہ شکر ادا نہ کیا، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اس کے لبوں پر یہی دعا تھی۔

”اے اللہ میری نظر کو بدنظری اور نفس کو لگام دے، مجھے سکون دے، مجھے اپنی رحمت کے سائے میں رکھ اور راضی رہ“۔ عبادت سے دل کو جیسے سکون ملنے لگا۔ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت بوجھل بوجھل تھی، اس دن بھی سب کے جانے کے بعد اس نے گھر کی صفائی کی مشین لگا کر کپڑے دھوئے، اور کھانے کا کام نمٹا کے استری بھی کر لئے۔ پھر نڈھال سی پھپھو کے پاس تخت پر ہی لیٹ گئی۔ پھپھو نے ذکر کے بعد اس پر پھونکا، اور دعائیں دیں، اس کا رنگ زرد اور آنکھیں ویران لگ رہی تھیں۔ پھپھو نے اسے آرام کے لئے بھیج دیا۔ وہ یوشع کے رویئے کے بارے میں سوچتے سوچتے سوگئی، جانے کتنے ٹائم بعد تیز روشنی نے اس کی حساسیت بیدار کیں، اور جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، سر میں ابھی بھی ہلکا ہلکا درد تھا۔ یوشع سامنے صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

”ارے آپ کب آئے“۔ اس نے سائیڈ سے دوپٹہ لیا اور نیچے اتر کر سلیپر پہنے۔

”محترمہ کو آرام سے فرصت ملے تو شوہر کے آنے کے وقت کا پتہ چلے“۔ یوشع نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اور کام بھی آج زیادہ تھا“۔ اس نے کہنا چاہا مگر۔

”کام کام اور بس کام، ٹھیک ہے میں کل وقتی ایک ملازمہ رکھ لیتا ہوں کہ آپ کی اس کام سے جان چھوٹ جائے۔ ویسے بھی آپ کو آرام سے فرصت نہیں ملتی، تو آپ مجھے یا میرے گھر والوں کو کیا سنبھالیں گی۔ اپنی ماں کے گھر تشریف لے جائیں، جب طبیعت بحال ہو جائے تو واپس آجایئے گا، اور اگر یہاں دل نہیں لگتا تو ساری عمر کے لئے ہی وہاں چلی جاؤ“۔ یوشع زہر اگلتا کمرے کا دروازہ تیزی سے بند کرتا باہر نکل گیا۔

”اشمل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما جو بری طرح گھوم رہا تھا آنکھوں میں ساون جھڑی لگی تھی، اور شیخ عبدالقادر جیلانی کا پڑھا ہوا قول اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

”اے شخص تو جس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اس سے جدا کر دیا جاتا ہے، کبھی جدائی، کبھی موت تو کبھی غلط فہمی کے بنا پر، اے نادان تو تو وہ خوش قسمت ہے جس پر اللہ نے غیرت کھائی ہے۔ اللہ تجھے اپنے لئے چاہتا ہے، اور تو غیر کا ہونا چاہتا ہے، ہوش کر ایسا جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہ ٹھہرے۔ تو غیر کے پیچھے بھاگے گا اللہ تجھے اس کے ہاتھوں توڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کا ہو جائے گا تو ساری مخلوق تیرے قدموں میں ہوگی، تیری محبتیں اور آسائشیں تجھے لوٹا دی جائیں گی۔ اور جس سے تو محبت کرتا ہے۔ وہ تیرے لئے روئے گا۔ مگر تیرا دل بے نیاز ہو جائے گا“۔ ایک فیصلہ کر کے وہ اٹھی چند جوڑے بیگ میں ڈالے۔ اور پھپھو کے کمرے میں آگئی۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا، اور خنکی بڑھ گئی تھی۔

پھپھو نے اشمل کی طرف دیکھا، شدت ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوج رہی تھیں۔

”پھپھو! میں امی کے گھر جانا چاہتی ہوں“۔ باوجود کوشش کے بھی اس کی آواز اندھ گئی۔ سر عجیب بھاری ہو رہا تھا۔

”بیٹا! بات گھر سے نکل جائے تو بڑھ جاتی ہے، غلط فہمی کو گھر کے اندر ہی نمٹانا چاہئے۔“ پھپھو نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر اسے اپنے ساتھ لگایا، وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی، ان دنوں کا غبار باہر نکال پھینکنا چاہتی تھی، مگر اچانک پوری دنیا اسے اندھیری نظر آنے لگی اس نے ایک چیخ ماری اور پھپھو کے بازوؤں میں جھول گئی۔ ہاسپٹل کے کاریڈور میں، ٹہلتے اس کے پیارے پریشانی سے صرف ایک سوال کر رہے تھے، کہ زندگی سے بھرپور ہنستی مسکراتی اشمل کو نروس بریک ڈاؤن کیسے ہو سکتا ہے۔ اور یوشع تو مجرم بنا ہوا تھا اپنے ضمیر کا اپنے پیاروں کا، پھپھو نے اسے خوب سنائیں تھیں، اور ناراض بھی ہو گئیں، دفتر کے کام اور اپنی خود ساختہ سوچوں سے الجھتے ہوئے اس نے اپنی متاع حیات خود ہی لٹا دی تھی۔ اس خوف کی وجہ سے وہ اشمل سے یہ رویہ رکھتا، کہ دوسروں کی طرح وہ بھی اسے ماں سے جدا کرنے پر مجبور نہ کرے، یا اپنی من مانی نہ کرے۔ اس کی اشمل I.C.U میں تھی، اور اس کے گرد اس کی ہنسی، اس کا لمس، اس کی چاہت شرارتیں، اس کا مہکتا وجود الوژن بن کر ساتھ ساتھ تھا۔ سب کی دعائیں رنگ لائیں، اور اشمل کو ہوش آ گیا، ساتھ میں ڈاکٹر نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے، صدقات کی بارش کر دی گئی، ہر شخص کے چہرے پر سچی خوشی کی چمک تھی، ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظریں سب کے چہروں پر پڑیں، ہر ایک شخص اس کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ امی نے اس کی پیشانی چومی۔ ابو کے ہاتھ میں کتنی دیر تک اس کا ہاتھ تھا۔ پھپھو نے کتنے روپے اس کے سر پر وار کے یتیم خانے بھجوا دیئے، اور وہ دشمن جاں آنکھوں میں ندامت اور ویرانی لئے اس کے پاس ہی کھڑا تھا، چہرے پر صدیوں کی تھکن بتا رہی تھی کہ اشمل کی محبت کا درخت پت جھڑ سے گزر کر پھر سے ہرا بھرا ہونے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اشمل کی آنکھیں کھول کر یوشع کے دل سے بھی گرد و غبار ہٹا دی تھی۔ سب کے باہر جانے کے بعد وہ اشمل کے پاس بیٹھا، اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ تو کتنے آنسو اس کی ہتھیلی پر گرے۔ اشمل نے تڑپ کر یوشع کی طرف دیکھا۔

”تم جس سے محبت کرو گے پھر وہ تمہارے لئے روئے گا“۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا گویا اس کے رب نے اس کو معاف کر دیا تھا، تب اس نے بھی یوشع کو معاف کر دیا دل سے، کیونکہ اس کی نافرمانی اور خطائیں یوشع کی خطا سے بہت بڑی تھیں، پھر بھی رب نے اس کی محبتیں اور نعمتیں اسے واپس لوٹا دیں۔ یوشع نے اس کی پیشانی پر لب رکھ کر جیسے اس کی تشنگی مٹانی چاہی تو اشمل نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

”جان یوشع! آج کے بعد ایک پل کے لئے بھی تمہیں خود سے الگ نہیں کروں گا، کہ تمہاری پل بھر کی جدائی میں، میں نے صدیوں کی مسافت طے کر لی، بس ایک بار مجھے معاف کر دو“۔ یوشع نے بے ساختہ اپنے کان پکڑے۔

”بہت کیوٹ لگ رہے ہو پانچ منٹ پکڑے رہو“۔ اشمل نے مسکراتے ہوئے اسے چڑایا۔

”دیکھ رہے ہو جانشین تمہاری مما تمہارے پاپا کو مرغا بنا رہی ہے“۔ اشمل بے اختیار سرخ پڑ گئی۔ اس نے مکا بنا کر یوشع کو مارنا چاہا مگر اس نے اس کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگا لیا۔ اشمل نے سکون سے آنکھیں موند لیں، کہ ہر محبت دکھ دیتی ہے، اگر اس میں پیارے رب کی چاہت سب سے پہلے موجود نہ ہو، اور اس فلسفہ زندگی نے اس کی زندگی کو حسین اور سہل بنا دیا تھا۔

......☆......

اقراء سیف

افسانہ

خواب بنے خاک

''فارحہ! تمہیں پتا ہے احمد تم سے محبت کرتا ہے۔'' نازلی کی ادھوری بات پر ہی فارحہ اچھل پڑی۔

''واٹ؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے احمد محبت کرتا ہے اور وہ بھی مجھ سے۔'' فارحہ نے بے یقین لہجے



میں محبت اور خود پر زور دیا۔

''ہاں تو اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے کیا احمد تم سے محبت نہیں کر سکتا یا اس کے سر پر سینگ ہیں۔'' نازلی نے الٹا تپ کر سوال کیا۔ نازلی کو پتا تھا کہ فارحہ، احمد کی اس محبت پر شاید کبھی یقین نہیں کرے گی اور احمد میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اسے یقین دلا سکے۔ اس لیے یہ معرکہ اس نے خود ہی سر کرنے کا سوچا تھا۔

''ہاں...... محبت اور وہ بھی احمد کرے گا۔ کبھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھنا تو گوارا نہیں کیا ہر وقت کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کتابی کیڑے کو کیا پتا محبت کیسے کی جاتی ہے۔''

''اگر وہ لاتعلق رہتا ہے، تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ لاپروا یا انجان ہے اسے تمہاری زندگی میں آنے والے پر چھوٹے سے چھوٹے خوشیوں بھرے دن کی خبر ہے۔ تمہاری برتھ ڈے، تمہارا رزلٹ ڈے، حتیٰ کہ جس دن تم نے اس سے ہنس کر بات کی اسے وہ دن بھی یاد ہے۔'' نازلی نے کسی ڈائجسٹ میں پڑھا ہوا ڈائیلاگ بھی احمد کی حمایت میں بول دیا۔

''اچھا! محترمہ آپ بتانا پسند کریں گی کہ یہ سب بکواس آپ سے احمد نے کہی ہے۔'' فارحہ نے غصے



سے کھولتے ہوئے کہا۔
''ارے نہیں یہ سب احمد نے نہیں اس کی ڈائری میں لکھے بے جان الفاظ نے کہا ہے۔'' نازلی کا لہجہ پرسکون تھا۔
''واٹ ڈو یو مین؟'' فارحہ بے یقین تھی۔
''میرا وہی مطلب ہے جو تم سمجھی ہو میں نے احمد کے روم کی صفائی کرتے ہوئے اس کی ڈائری پڑھی تھی۔ جس میں اس نے تم سے محبت کا اقرار نامہ لکھا ہے۔'' نازلی نے آخر میں شریر لہجہ اپنایا۔
''نازلی! تم پاگل تو نہیں ہوگئی آج کے دور میں یہ کتابی محبت کون کرتا ہے اور میں کوئی اسی کی دہائی کی لڑکی نہیں ہوں، جو اپنے عاشق کی جھکی نظروں میں لکھا پیام محبت پڑھتی رہوں اور انتظار کروں کہ کب وہ مجھے اپنی ڈائری میں لکھی محبت کھول کر دکھائے گا اور اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں سے سوکھے گجرے نکال کر دکھائے گا جو اس نے کسی شام میرے لیے خریدے تھے مگر وہ شرافت کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر شرم سے جھکی آنکھوں کے ساتھ مجھے دے نہیں سکا۔''
''اچھا تو پھر تم کس دہائی کی لڑکی ہو اور کیسی محبت پسند ہے تمہیں؟'' نازلی نے لفظوں کو چباتے ہوئے پوچھا۔
''میں اکیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہوں اور مجھے بولڈ محبت پسند ہے۔ جیسے کہ رومان مجھ سے محبت کرتا ہے، جس کا اظہار وہ دن میں بیسیوں دفعہ کرتا ہے۔ اسے میری پسند ناپسند کا پتا ہے، وہ مجھے اور مجھ پر جچتے ہر رنگ کو سراہتا ہے میرے حسن کی تعریف کرتا ہے اور مجھے ایسی ہی محبت فیسی نیٹ کرتی ہے۔'' فارحہ نے کھنکتے ہوئے لہجے میں رومان کی محبت کا اعتراف کیا۔
''معاف کرنا فارحہ! رومان تمہیں سراہتا نہیں بلکہ شیشے میں اتارتا ہے اور تم دیکھنا ایک دن اس شیشے میں پہلا کنکر مار کر توڑنے والا بھی رومان ہوگا اور جب تمہارے ہاتھ اس کانچ کو جوڑتے ہوئے لہولہان ہوں گے تب تمہیں احمد کی محبت یاد آئے گی اور شاید پھر تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔'' نازلی کا لہجہ دکھی تھا وہ اپنی اس بہن کو سمجھانا چاہتی تھی جس پر آج رومان کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ جب کہ نازلی جانتی تھی کہ وہ صرف وقت گزاری کر رہا ہے لیکن یہ بات فارحہ کو کون سمجھائے۔

☆......☆

آج یونیورسٹی میں آنرز والوں کا اینول ڈنر تھا۔ فارحہ اور نازلی دونوں پرجوش سی اپنی تیاری میں مگن تھیں، فارحہ نے وائٹ لانگ فراک پہنا جس کے گلے پر ریڈ اسٹون لگے ہوئے تھے۔ ہم رنگ جیولری، لائٹ میک اپ اور کلر پر گرتی بالوں کی کھلی آبشار نے حسن کو دوآتشہ کردیا تھا۔ جب کہ نازلی بھی پنک فراک میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔
پورچ میں احمد کھڑا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ نوید صاحب کی خاص ہدایت تھی کہ دونوں کو وہی یونیورسٹی لائے اور لے جائے گا۔
احمد نے ایک سرسری سی نگاہ فارحہ پر ڈالی اور نظریں جھکا گیا۔ فارحہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر احمد کی جگہ رومان ہوتا تو کتنی تعریف کرتا اس کی مگر احمد......اور ہوا بھی یوں ہی ریسٹورنٹ کے ہال میں رومان بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ داخلی دروازے سے داخل ہوتی فارحہ اور نازلی کو دیکھ کر بڑی بے تابی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔
''ہائے فارحہ! بہت دیر کردی آنے میں۔'' رومان نے گہری نظروں سے فارحہ کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا جب کہ نازلی ایکسکیوز کرتی ہوئی اپنی دوستوں کی طرف بڑھ گئی۔
''ہاں بس تیاری میں دیر ہوگئی۔''
''ہمممم۔'' رومان نے محض ہنکارا بھرا جب کہ نظریں ابھی بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔
''کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' فارحہ بھی اس کی نظریں خود پر محسوس کرچکی تھی۔
''کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی پیاری لگ رہی ہو جیسے کوئی پرستان کی پری راستہ بھول کر زمین پر آگئی ہو۔'' رومان نے سنبھلتے ہوئے اسے تعریفی لفاظی میں الجھایا اور فارحہ جب بھی اس کے منہ سے اپنی تعریف سنتی تو اسے رومان کی آنکھوں میں ناچتی ہوس بھی محبت کے رنگ لگتے اور ان رنگوں میں کھو کر اسے اردگرد کا ہوش نہ رہتا۔
''فارحہ! میں کچھ پل تمہارے ساتھ تمہاری سنگت میں گزارنا چاہتا ہوں آؤ یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔'' رومان کی پیشکش کو فارحہ نے بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کرلیا تھا اور یوں محبت کے نشے میں کھوئے ایک خوب صورت شام کا اختتام ہوگیا۔ لیکن یہ شام کس کے لیے بربادی کا پیغام لائی تھی یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ ابھی تو محبت کا نشہ تھا اور اس نشے میں اٹھا ہر قدم جائز اور ہر عمل ٹھیک لگا تھا۔

☆......☆

''رک جاؤ فارحہ! کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟'' نوید صاحب کے لہجے میں چھپا غصہ کسی انہونی کا پیش خیمہ تھا۔
''ہمارا آج اینول ڈنر تھا پاپا آپ کو صبح بتایا تو تھا۔'' فارحہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔
''صبح کے بتانے میں اور اب کے بتانے میں بہت فرق ہے۔ کیا کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر سڑکوں پر گھومنے کو تم ٹھیک کہتی ہو۔'' نوید صاحب کی آواز میں درشتی تھی۔ فارحہ کے ساتھ کھڑی نازلی بے گناہ ہی مجرم بن گئی۔
''پاپا وہ......'' فارحہ نے بولنا چاہا جب نوید صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔
''بس کچھ نہیں آج سے یونیورسٹی جانا بند اور ہاں فارحہ کی ماں ایک بات اسے سمجھا دو کل احمد کے ساتھ اس کا نکاح ہے۔'' نوید صاحب نے اپنی نصف بہتر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئے لیکن فارحہ نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''پلیز پاپا! میری بات تو سن لیں۔ آپ ایک دفعہ رومان سے مل کر تو دیکھیں وہ بہت اچھا لڑکا ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' فارحہ نے بلاخوف باپ کے سامنے اقرار محبت کیا۔
''چٹاخ......!'' نوید صاحب کا ہاتھ فارحہ کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔
''بدتمیز! شرم نہیں آتی باپ کو یہ سب بتاتے ہوئے اگر وہ لڑکا تمہیں اپنی عزت جانتا تو یوں سڑکوں پر لیے بے عزت نہ کرتا اور ایک بات کان کھول کر سن لو والدین کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتے اور مجھے امید ہے تم میرے فیصلے سے انحراف نہیں کروگی۔'' فارحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ آگے بڑھ گئے جب کہ فارحہ کے اندر انتقام کی آگ زور پکڑ رہی تھی۔ اس کے پاپا نے اسے پہلی بار زندگی میں تھپڑ مارا وہ ایک تھپڑ کھا کر اپنی محبت سے دستبردار ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا تھا اور کمرے میں جا کر رومان کو کال کی کہ وہ اسے رات کے دو بجے پک کرے اور ایک چھوٹا سا بیگ تیار کر کے بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور دیوار پر لگی گھڑی میں چلتی سوئیوں کو گننے لگی۔
وہ اس گھر کو چھوڑنے والی تھی۔ جہاں اس نے آنکھ کھولی بچپن سے لے کر آج تک ساری یادیں اس گھر سے وابستہ تھیں۔ ماں، باپ کا پیار ایک بے حد محبت کرنے والی بہن وہ سب کچھ ہی تو فراموش کر چکی تھی ہاں اگر یاد تھا تو صرف ایک تھپڑ جو اس کے گال پر اس کے باپ نے مارا تھا۔
زندگی کے اکیس سالوں میں اگر اسے یاد رہا تو فقط ایک تھپڑ......انتقام اور......رومان کی محبت۔

☆......☆

ٹھیک دو بجے اس نے بیڈ کے نیچے سے بیگ نکالا اور دبے قدموں بنا آہٹ پیدا کیے لاؤنج میں آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق داخلی دروازہ لاک تھا۔
''جانے کیوں بیٹیوں کے ماں باپ عزت لٹنے کے ڈر سے اپنے آنگن کے بڑے دروازے تو بند کرلیتے ہیں لیکن اسی گھر میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے



دریچے اور روزن بند کرنا کیوں بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اڑنے والے پرندوں کے لیے پنجرے کی ایک ٹوٹی تار ہی کافی ہوتی ہے۔"

کچھ ایسا ہی ادھر ہوا تھا۔ فارحہ کو اڑنے کے لیے ایک کھلا دریچہ مل گیا تھا۔ کچن کی پچھلی جانب کھلتا دروازہ اس کے لیے آزادی ثابت ہوا تھا۔ وہ پگلی شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آزادی ہی اس کی بربادی کا باب رقم کرے گی۔ بہت آہستہ سے وہ کمرے کی پچھلی جانب سے دیوار کے ساتھ ساتھ گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب احمد کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے آتی آوازوں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"احمد بھائی! آپ جانتے ہیں فارحہ آپ سے محبت نہیں کرتی، پھر بھی آپ نے پاپا کو انکار نہیں کیا؟ آخر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ بابا نے آپ پر بہت احسان کیے ہیں۔" یہ آواز نازلی کی تھی۔

"نازلی! یہ بات سچ ہے کہ پاپا نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں، مجھ جیسے بے شناخت بچے کو اپنا نام دیا ہے گھر دیا۔ ماں کی محبت دی، تم جیسی بہن دی ایک پڑھا لکھا باعزت شہری بنایا لیکن جب پاپا نے مجھ سے میری رضامندی پوچھی تو کچھ لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت مجھ پر اتنا مہربان بھی ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں اگر قسمت آپ کے در پر دستک دے تو اسے خوش آمدید کہنا ہی اصل عقلمندی ہے۔"

احمد کا لہجہ ہی اس کی خوشی کا پتا دے رہا تھا۔ اس کے لہجے سے چھلکتی خوشی تو کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا۔

"لیکن احمد بھائی فارحہ رومان سے......" نازلی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احمد نے کاٹ دی۔

"فارحہ نادان ہے، حتیٰ کہ تم سب لڑکیاں ہی نادان ہوتی ہو تم لڑکیاں محبت اور ہوس کے فرق کو کیوں نہیں سمجھتیں؟ اور یہ کیوں نہیں جانتیں کہ محبت کے قرینوں میں سب سے بڑا قرینہ عزت ہے جو شخص آپ کی عزت کا خیال نہیں رکھ سکتا وہ محبت کیا خاک کرے گا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی یہ محبت کی کون سی قسم ہے۔ جو شاہراہوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں پروان چڑھتی ہے اور فارحہ اس ایک محبت کے حصول کے لیے وہ سب محبتیں وہ سب خونی رشتے کیسے نظرانداز کر سکتی ہے جو اللہ نے اس کے لیے بنائے ہیں وہ ان کی عزتوں کو کیسے داؤ پر لگا سکتی ہے جو ازل سے چلے آ رہے ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مرد اس لڑکی سے کبھی شادی نہیں کرتا جو اسے آسانی سے حاصل ہو جائے اور اگر شادی ہو بھی جائے تو وہ پیار و سکون کبھی نہیں ملتا جو والدین کی مرضی سے کیے جانے والے شرعی نکاح میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جن محبتوں کا معیار شرعی اصولوں کو توڑ کر حاصل کرنا ہے وہ کبھی شفاف نہیں ہوتیں۔" یہ سب کہنے والا احمد رضا تھا اور ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ پاپا نے بھی تو یہی کہا تھا۔

"اگر وہ لڑکا تمہیں اپنی غیرت جانتا تو سڑکوں پر لیے بے عزت نہ کرتا۔"

"وہ تمہیں سراہتا نہیں بلکہ شیشے میں اتارتا ہے اور تم دیکھنا ایک دن اس شیشے کو پہلا پتھر مار کر توڑنے والا بھی رومان ہو گا۔ اور جب تمہارے ہاتھ اس کانچ کو جوڑتے لہولہان ہوں گے تب تمہیں احمد کی محبت یاد آئے گی اور پھر شاید تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔" قریب ہی نازلی کی آواز گونجی۔

"او خدا...... میں کیا کرنے جا رہی تھی۔ میں خود ہی اپنے آپ کو بے عزت کرنے چلی تھی۔" دو آنسو ندامت کے اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر گرے تھے۔

اس کی نظر موبائل کی روشن ہوتی اسکرین پر پڑی جہاں رومان کی کال آ رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا کیونکہ ابھی واپسی کا در کھلا تھا اور اسے لوٹ جانا تھا۔ ابھی اسے خدا سے معافی مانگنی تھی اور جن کا دل دکھایا تھا ان سے معافی مانگنی تھی اور اپنے پاپا کی امید پر پورا اترنا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہی بے لگام خوابوں کی خاک میں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ ☆☆

زینب ملک ندیم

افسانہ

خدا کا ایک فیصلہ

”مما“...... اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مما کو موہوم سی صدا لگائی۔ مگر دوسری جانب سے صرف ایک سپاٹ وجود کھڑکی کے نزدیک ایستادہ نا جانے کون سے غیر مرئی نقطے کی جانب توجہ مرکوز کیے



ہوئے تھا۔ نہ وہ وجود متحرک ہوا اور نہ ہی کوئی جواب ملا۔ نہ جانے شب کی کالی چادر نے ہر شے کو کیسے خود میں سمیٹا تھا کہ ہر طرف ہر شے کو خاموشی نے بھی اپنے حصار میں لیا تھا۔ وہ دھیرے سے قدم بڑھاتی مما کے قریب آئی۔ اس نے مما کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ یکلخت چونکیں۔

”مما جان! کیا ہوا آپ میری آواز کیوں نہیں سن رہیں؟“ اس نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بناتے ہوئے مما کے چہرے کو تھاما جس پر نا جانے کون سی اداسی تھی کہ مما کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور جا رہا تھا اس نے ہراساں ہو کر مما کو گلے لگالیا۔

”مما جان! کوئی پریشانی، اضطراب ہے کیا؟“ اس نے استفسار کیا۔

”نہیں میری جان“۔ مما نے اپنے ہاتھ اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

پکا نا؟“ مما کو کندھے سے پکڑتے ہوئے اس نے معصومیت سے پوچھا کمرے میں عنادل کی آواز کے علاوہ صرف خاموشی تھی جب وہ چپ کرتی تو خاموشی



اور محسوس ہوتی۔

پکا میری جان!'' انہوں نے تسلی دیتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے تھام لیا۔ مما کی تسلی دینے پر وہ رضامند ہوگئی اور شب بخیر کہنے کے بعد کمرے سے چلی گی۔ اماوس کے اندھیرے نے ہر شے کو اپنی سیاہی میں لپیٹا تھا۔ انہیں جب باہر کے اندھیرے سے ڈر لگنے لگا تھا انہوں نے چونک کر یکلخت کھڑکی کے پردے پھیلا دیئے۔ کتنی عجیب بات ہے نا جب دل کا موسم اداس ہوتا تو باہر کا موسم بھی خود بخود اداس لگنے لگتا ہے اور ہم اور اداس ہوجاتے ہیں دل بیٹھنے لگتا ہے۔ وجود بوجھل ہوجاتا ہے جیسے میلوں کی مسافت ایک ہی لمحے میں طے کرلی ہو، اور پھر ٹانگیں شل سی ہوجاتی ہیں اور ہم ساکت جامد ہوجاتے ہیں۔ بیٹی کو تو تسلی دے چکی تھیں مگر قلب کس کرب سے دھڑک رہا تھا، صرف وہی آشنا تھیں دل پر برق روی سے نشتر چل رہے تھے وجود جل کر خاکستر ہورہا تھا۔ کتنی ہی تکالیف تھیں جنہوں نے ایک ساتھ ہی انہیں اپنے وجود میں لیا تھا۔ انہیں آج بھی ازبر تھا جب ان کی بہن آئی تھیں۔

''دیکھو میں نے نا نہیں سنی تم جانتی ہو نا تمہاری بیٹی صرف اور صرف میری بیٹی ہے، اتنی پیاری سگھڑ اور قناعت پسند ہے مکمل طور پر میری امیدوں پر اترنے والی بہو بنے گی ارے بہو کیا بیٹی''۔ انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا اور عنادل کے ہاتھ پر پیسے رکھ گئیں اور انگوٹھی پہنا گئیں اور ریمل بیگم بس بہن کا اپنی بیٹی کے لئے پیار دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ کچھ بہن کی شہد سے لبریز باتوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ بیگم ریمل کو اپنی بہن سے بہت پیار تھا، انہوں نے کچھ اور بھی ازبر کیا وہ کتنی پریشان اور غصے میں تھیں، جب ان کی بہن کی عنایت نے ان کے غصے کو ختم کردیا، بہن کے آنے سے ایک دن پہلے ان کی نند اپنے بیٹے سالار کے لئے عنادل کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں۔ سالار مختار بیگم کے بیٹے سے کم آمدنی رکھتا تھا اور عنادل سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ریمل نے فوراً انکار کردیا۔

''ارے آپ کی بہن آئی ہے وہ بھی میری چاند سی بیٹی کا رشتہ لینے ارے پاگل ہے میں ان کم لو اسٹیٹس والے لوگوں سے اپنی بیٹی بیاہوں گی واہ اس کے بیٹے کی سیلری بہت کم ہے، میرے اسٹینڈرڈ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔'' نند کے جانے کے بعد ریمل نے نہایت مغروریت سے کہا، اس وقت وہ خود کو جیسے بہت بلند سمجھ رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس وقت سعود اپنی بہن سے ہی بات کررہے تھے اور وہ سب سن رہی تھیں جب سعود نے بتایا تو ان کا ماتھا ٹھنکا، مگر پھر بھی بولتی گئیں۔ وہ تو اپنی انا میں بولے جارہی تھیں، وہ تو بہت آرام سے کہہ رہی تھیں یہ جانے بغیر کہ وہ الفاظ مقابل پر کیسے اثر کرتے ہیں وجود کو ریزہ ریزہ کردیتے ہیں۔

''کہنے والے کہہ جاتے ہیں
سہنے والے کمال کرتے ہیں''

مگر اپنی بہن کی آمد نے غصے کو ختم کردیا۔ اس دن جتنا وہ خوش تھیں صرف وہی جانتی تھیں وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھیں، ان کے پیر زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

''سنو! تمہاری بہن بہت میٹھی چھری ہے دھیان رکھنا محتاط رہنا، سر پر بٹھانے والے کیسے زمین کی جوتی بنالیں پتہ نہیں چلتا''۔ سعود صاحب اپنی سالی کی رگ رگ سے واقف تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی آراہ سے آگاہ کررہے تھے۔ مما بہت خوش تھیں ایک امیر خاندان سے رشتے کا خود چل کر آنا کسی معجزے سے کم نہ تھا، چاہے وہ رشتہ بہن کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو، مگر ماں کا دل بہت نرم ہوتا ہے، جب بیٹی پیدا ہوتی ہے ایک ماں کو تب سے ہی اس کے مستقبل کی فکر لاحق ہوجاتی ہے۔ پیدا ہو تو پڑھائی جوان ہو تو پھر شادی کی فکر، چاہے جیسے مرضی ہو، ماں کا بیٹی کے معاملے میں دل بہت نرم ہوتا ہے۔ مگر زندگی میں کیئے جانے والے

فیصلے غلط ثابت ہوجاتے ہیں کچھ لمحوں میں کیا گیا تکبر اور غرور ایک دن خاک ہوجاتا ہے اور ہم صرف بے بس اور لاچار ہوجاتے ہیں۔ مٹی کے بنے پتلے اپنی عصیاں کو جانے بغیر بے حد انا پرست ہوجاتے ہیں''۔ آج صبح آیا بیگم مختار کا فون ان کے وجود کو ریزہ ریزہ کرگیا تھا وہ ایسے ٹوٹیں جیسے شیشہ ٹوٹتا اور کرچی کرچی ہوجاتا ہے۔

''السلام وعلیکم!'' بہن فون اٹھاتے ہی اپنے بہنوئی کی آواز سن کر وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

''وعلیکم السلام! بھائی کیسے ہیں مختار کیسی ہے؟'' انہوں نے پرمسرت لہجے میں استفسار کیا۔ وہ بالکونی میں کھڑی تھیں موسم بہت خوشگوار تھا، تیز ہوا کے جھونکے ان کے بالوں کو لہرا رہے تھے۔

''اللہ کا کرم ہے مجھے کچھ بات کرنی ہے حسب اتفاق مجھے ابھی وقت ملا تو سوچا آپ سے بات کرلوں''۔ ان کے کہنے میں ناجانے کیا تھا کہ وہ ہراساں ہوگئیں۔

''جی بھائی''۔ وہ بمشکل مسکرائیں۔

''بہن دیکھیں! میں لجاجت اور ٹال مٹول سے کام لینے کی بجائے سید ھا مدعے پر آتا ہوں تمہاری بہن منگنی توڑنا چاہتی ہے۔ طمع پیسے اور اونچائی کو دیکھنا بس اس کی خصلت میں شامل ہے۔ اب اسے تم سے بھی کوئی اونچا''۔ آواز کٹ سی گئی۔

''ارے بس اس میں اتنا بوکھلانے کی کیا بات ہے تمہارے بہنوئی سے تو کوئی بات نہیں ہوتی فضول بولتے ہیں صرف چلو بس کیا کروں میں تمہاری بیٹی سے رشتہ توڑ رہی ہوں مجھے تمہاری بیٹی جچ نہیں رہی، اوپر سے وہ سائیکاٹرسٹ ہے سنا ہے وہ آدھے خود پاگل ہوتے ہیں اور اس کا چشمہ چٹیا مجھے احساس ہوا تمہیں بہولانی ہے بھولی گائے نہیں پتہ ہے تمہیں دکھ ہوگا، مگر مجھے اپنے بیٹے کا مستقبل دیکھنا ہے ایک ہی تو بیٹا ہے میرا اب کیا کروں مجبور ہوں اسے ویسے بھی مسز سمرین کی کینیڈا سے آئی بیٹی پسند آئی ہے''۔

اس بار بہنوئی کے بجائے ان کی بہن بولی اور بولتی ہی رہ گئی کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئیں، کتنا آسان تھا ناں ان کے لئے کہہ دینا یہ سب۔ لوگ کتنے بے حس ہوتے ہیں نا دوسروں پر پہاڑ پھینک دیتے ہیں مگر انہیں ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوتا دوسری جانب کوئی نا بولا فون بند کردیا گیا تھا، ریسیور ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔

''دیکھ لو تمہاری بہن بہت امیر ہے ہواؤں میں اڑتی ہے اور نا جانے کیسے میری سادہ سی بیٹی پر اس کا دل آگیا، میں تو حیران ہوں''۔ انہیں شوہر کے کہے الفاظ شدت سے یاد آئے اور وہ ڈر گئیں ان کے شوہر کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ وہ تھیں جو اپنی بات پر اڑی تھیں مگر وقت کب کس وقت کیسے بدل جائے، ہم تو بے خبر ہوتے ہیں وقت کے آگے بے بس اب وہ جب بھی اپنی بیٹی کو دیکھتیں آنکھیں اشکوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے ندامت سے سر تک نہ اٹھاتی تھیں۔ معصوم سی بیٹی پر اتنے بڑے پہاڑ کا گرنا ماں کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

☆

''شرم نا آئی بھائی صاحب انہیں ایسا کہتے ہوئے ان کی عقل لگتا ہے بری طرح مفلوج ہوچکی ہے۔ میری بچی کو پاگل کہتے اسے ذرہ بھی شرم نہ آئی، پاگل وہ خود ہوگی اسے تو ڈوب کر مرجانا چاہئے۔ اللہ نے بہتر کیا ورنہ یہ رنگ باز لڑکا نا جانے شادی کے بعد کیا رنگ دکھاتا ابھی کی آشنائی بعد کے برباد ہونے سے بہتر ہے''۔ پھوپھی جان عنادل کے رشتہ ٹوٹنے کی بات پر سلگ ہی تو گئی تھیں، وہ بہت مہربان، شفیق خاتون تھیں ہر رشتے کو خوبصورتی سے نبھانے والی

انہوں نے بہت سفاک الفاظ سنے تھے، مگر انہیں عنادل سے بہت پیار تھا وہ پھر بھی دوڑ کر چلی آئیں۔ سالار صرف عنادل کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا، وہ معصوم سی لڑکی اپنے جذبات کو سینت سینت کر رکھنے والی لڑکی بہت چپ سی ہوگئی۔ مما کو بار بار بہن کی خودسری اور سرکشی پر غصہ آرہا تھا، سب ڈرائنگ روم میں براجمان تھے مما پاپا کے ساتھ بیٹھیں تھیں عنادل پھوپھی جان کے کندھے پر سر رکھے سپاٹ انداز میں بیٹھی تھی اور سالار الگ صوفے پر بیٹھے غصے سے اپنے بوٹ کی نوک کو بار بار زمین پر مار رہا تھا۔ مما پاپا سے بصری اشاروں میں نا جانے کیا بات کر رہی تھیں، پاپا مما کو جتا رہے تھے کہ دیکھو میری بہن اور اپنی بہن میں فرق۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا سالار سے عنادل کی خاموشی برداشت نہ ہوئی تو کرب سے اٹھتا ہوا باہر چلا گیا۔ محبت بھی کیسا حسین جذبہ ہوتا ہے نا جس سے محبت ہوتی ہے اس کو درد، دکھ، تکلیف میں محبت کرنے والی آنکھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ ”بھیا مجھے پتہ ہے کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے مگر میں کچھ کہنا چاہتی ہوں کہ عنادل میری جان نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اسی دوراہے میں رہ کر خاموشی سے پیوست ہوجائے۔ میں چاہتی ہوں کہ عنادل صرف میری بیٹی بنے کل بھی اس کی طلبگار تھی اور آج بھی میرے بچے نے وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے ایک اچھی جاب کرتا ہے اللہ نے سب دیا ہے اس ذات کا بہت شکر ہے“۔ وہ سرعت سے بولتی ہوئی چپ کر گئیں۔ مما پاپا بات کو حتمی طور پر سمجھ گئے تھے۔ ”آپی مجھے معاف کردیں میں نے لالچی لوگوں کو آپ پر ترجیح دی مجھے معاف کرنا میں اندھی ہوگئی تھی مگر آپ کا دل بہت بڑا ہے کوئی میل نہیں ہے۔ آپ نے میرے سفاک الفاظ پر بھی صبر کیا میرے دکھ، خوشی دونوں میں شریک رہیں۔ اللہ نے آپ کو آپ کی صاف نیتی کا پھل دیا۔

میری اکڑ میرا غرور دونوں ٹوٹ گئے“۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ کبھی کبھار انسان اتنا مجبور ہوجاتا ہے کہ اسے کوئی غم نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لے اپنی انا کو ختم کردے ہماری غلطیاں بہت بڑی ہوتی ہیں انا والے انسان کے کندھے جھکا دیتی ہیں۔ ”ارے ایک آپی کہتی ہو اور قدموں میں بیٹھی ہو اجنبی کر رہی ہو تم میری جان ہم تو خطا کے پتلے ہیں ہر انسان خطا کرتا ہے اور جانتی ہو تم نے غلطی نہیں کی بس یہ قسمت ہوتی ہے کچھ فیصلوں میں ہماری عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے ہم نہیں جانتے ہم کیا فیصلہ کر رہے ہیں اور پھر قسمت بھی احساس کراتی ہے اور عقل پر پڑے پردے ہٹ جاتے ہیں تم بھی اسی کیفیت کا شکار ہوئی ہو“۔ انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے انہیں اپنے مقابل بیٹھا لیا کتنا شستہ، نرم اور شہد سے لبریز لہجہ تھا کہ مما کی اشکوں سے چمکتی آنکھیں مسکرا دیں۔ سالار کمرے میں داخل ہوا ہنسی کی جلترنگ کمرے میں گونج رہی تھی سالار کو کچھ بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ پاپا نے فراخ دلی سے اسے گلے لگا لیا۔ ”یا اللہ کیا یہ وہ لمحہ ہے جس کے لئے میں نے شدت سے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ دلوں کے بھید سے تو واقف ہے تو ہی جانتا ہے کہ میں کتنی پاک محبت کرتا ہوں اس معصوم سی لڑکی سے مجھے اس کا بنا دے“۔ اور بے شک اللہ ہی دعا قبول کرنے والا اور دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اس نے چپکے سے عنادل کی جانب دیکھا اس کے چہرے پر خوشی کا حسین امتزاج تھا خوشی اسی کو کہتے ہیں جو اس لڑکی کے چہرے پر نظر پڑے ہی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ اور ہاں وہی خوشی ہے وہ حصار یار میں بالکل قید ہو چکا تھا اور اس کا اللہ پر یقین اور بڑھ چکا تھا۔

☆......☆......

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

★ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

★ حسد دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کرسکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نبیؐ نہ فرشتہ وغیرہ۔

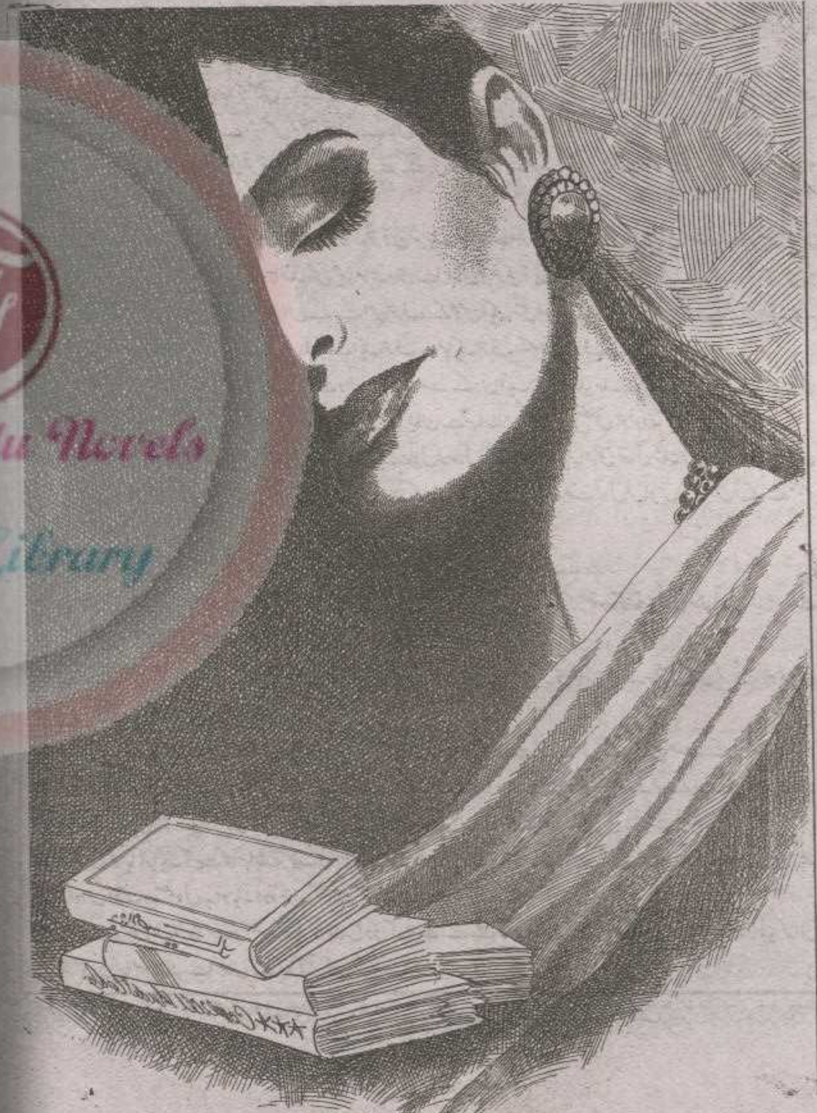
★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔

حورینہ سعد

افسانہ

پچھل پیری



بہت دیر سے دولڑکے بائیک پر سوار ایک گاڑی کا پیچھا کررہے تھے۔ پیچھا کرتے کرتے وہ ایک ویران سی جگہ آگئے جہاں پر بائیک پر سوار چاروں لڑکوں نے گاڑی کو گھیرلیا۔ ہانیہ نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔

''میڈم! آرام سے جو کچھ پاس ہے حوالے کردیں اور اپنا بیگ دے دیں۔'' جونہی ہانیہ نے بیگ اس کے حوالے کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا بائیک والا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرا بائیک والا آگے بڑھا اور پستول نکال کر ہانیہ کے سر پر رکھ کر بولا۔

''چوڑیاں بھی ہمارے حوالے کردو۔''

''کیا کررہے ہو بھائی! ہاتھ ہٹاؤ۔'' ہانیہ دو قدم پیچھے ہوگئی۔ دوسری بائیک والا بھی اپنی بائیک سے جا کر ٹک گیا۔ دوسری بائیک والے جلدی سے آگے آئے۔

''میڈم جو کچھ ہے ہمارے حوالے کردیں۔''

''یہ لو...... یہ لو۔'' ہانیہ نے اپنی چوڑیاں اتار کر



زمین پر پھینک دیں، دوسری بائیک والے بھی گھبرا کر ہانیہ کو دیکھ رہے تھے۔

''اٹھاؤ، اٹھاؤ شرم نہیں آتی عورتوں کو لوٹتے پھرتے ہو۔'' ہانیہ نے غصے سے کہا۔

دور سے آتی ہوئی پولیس موبائل نظر آئی تو ہانیہ موبائل کی طرف دوڑی لیکن چاروں لڑکے فرار ہو چکے تھے پولیس بروقت پہنچ چکی تھی۔ ہانیہ کی چوڑیاں، پرس اور موبائل سب کچھ وہیں پڑا تھا، پولیس والے حیران کھڑے تھے۔

''میڈم! ساری چیزیں تو وہ چھوڑ گئے پھر کیا مذاکرات ہو رہے تھے مجھے تو کسی نے پندرہ منٹ پہلے فون کیا تھا کہ ایک لڑکی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے اور ہم لوگ بروقت پہنچ بھی گئے۔''

''پتا نہیں میں خود حیران ہوں۔'' اس نے جلدی سے اپنی تمام چیزیں اٹھائیں۔

''میڈم! کیا بات کی انہوں نے آپ سے؟'' پولیس والے پوچھ رہے تھے۔

''کوئی خاص نہیں بس مجھے ہراساں کیا اور پھر خود ہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

''حیرت ہے میڈم۔''

☆......☆

ابھی اس بات کو ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ اسی بزی سگنل پر پھر ہانیہ کے ساتھ دوسرا واقعہ ہوا۔ ٹریفک سگنل ریڈ ہوا تو ساری گاڑیاں رک گئیں۔ ہانیہ نے بیگ سے برش نکال کر اپنے بالوں میں کر کے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ ابھی گاڑی کے ڈور پر نوک ہوئی تو ہانیہ نے کھڑکی کھول دی۔ اسنیچر کا بڑھتا ہوا ہاتھ پستول سمیت اندر آیا اور اس نے بہت غلیظ جملہ بولتے ہوئے کانوں کی بالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اتار جلدی۔'' اسنیچر کا سر تقریباً گاڑی کے اندر تھا۔ ہانیہ نے سکتے کے عالم میں اپنی بالیوں کو اتارنے کی کوشش کی، اسنیچر چیخ پڑا۔

''تم وہی چھل پیری ہو ناں جو ایک بار کلفٹن کے راستے پر ملیں تھیں۔'' وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ بولی۔

''چھل پیری...... ! کون چھل پیری......؟''

تبھی دوسرا آدمی سامنے آیا اور بولا۔

''باہر نکلو اور گاڑی کی چابی دو۔'' ہانیہ گھبرا کر باہر نکلی چابی زمین پر گر گئی۔ اسنیچر نے چابی جھک کر اٹھائی اور وہ ہانیہ کو پہچانتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''بھاگ یہ وہی چھل پیری ہے۔'' ہانیہ کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر وہ غنڈے بھاگ گئے تھے اور لوگ گاڑیوں سے اتر کر آگئے۔

''میڈم شکر ہے آپ بچ گئیں۔'' بھاگتے ہوئے لڑکے بول رہے تھے۔

''بھاگو یہ چھل پیری ہے بھاگو۔'' کئی لوگوں نے گھبرا کر اپنی گاڑیوں کے شیشے بند کر لیے۔ سگنل کھلا تو پولیس پہنچی مگر بہت لیٹ۔ کئی لوگ اشارے سے بتا رہے تھے ادھر چھل پیری ہے ڈاکو اسے لوٹ نہیں سکے۔

''کیا......!'' پولیس والوں نے بھی اپنی کار تیزی سے آگے بڑھائی اور ہانیہ کو جا لیا۔ ایک پولیس والا پہچانتے ہوئے بولا۔

''کیا چکر ہے؟ آپ شہر میں کیا کرتی پھر رہی ہیں؟''

''میں...... میں کیا کرتی پھر رہی ہوں؟ یہ آپ کی ذمہ داری ہے یہ لوگ دو بار میری گاڑی کو روک چکے ہیں اور آپ مجھے چھل پیری کہہ رہے ہیں۔ آپ قانون کے رکھوالے ہیں آپ ہمیں تحفظ دیں۔'' ہانیہ اکڑ کر بولی۔

''میڈم! آپ ہمارے ساتھ تھانے چلیں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

''تھانے چلوں...... ! کس لیے بھئی میں نے کیا ہے؟''

''ہم نے کچھ اگلے سگنل پر لڑکے پکڑے ہیں آپ انہیں چل کر پہچانیں۔''

پولیس والوں کے ساتھ ہانیہ پولیس اسٹیشن آگئی۔ چاروں گرفتار ملزم ہانیہ کو دیکھ کر چیخنے لگے۔

''چھل پیری، چھل پیری، چھل پیری۔''

''شٹ اپ!'' ہانیہ زور سے چیخی۔ پولیس والے بھی سکتے کے عالم میں تھوڑا سا دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

''میڈم! اس میں کچھ سچائی تو ہے۔'' پولیس والا بولا۔

''آپ بڑے صاحب کے پاس چلیں فیصلہ وہیں ہو گا۔''

''واٹ ڈو یو مین، فیصلہ بڑے صاحب کے پاس ہو گا۔ ایسا میں نے کیا کیا ہے؟'' اس نے سیل نکالا اور اپنے ہسبینڈ سے بات کی۔

''آپ پولیس اسٹیشن آجائیں یہاں بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

حمزہ گھبرا کر پولیس اسٹیشن پہنچا تو سارے واقعات کی تحقیقات ہوئیں تو حمزہ بولا۔

''یہ میری بیوی ہے کوئی چھل پیری نہیں۔ آپ لوگ یہ بکواس مت کریں۔'' اس نے سب کو ڈانٹ دیا۔

''پھر آپ ہی اس ماجرے کو حل کریں کہ ان میں ایسا کیا ہے کہ ہر شخص سکتے میں آجاتا ہے۔''

''او آئی سی۔'' حمزہ چونک کر بولا۔

''یہ تو ایک راز ہے۔ ہم نہیں بتا سکتے۔'' میڈیا والے وہاں پہنچ چکے تھے۔ میڈیا والے ہانیہ سے سوال کر رہے تھے۔

''میم! آپ کے پاس ایسا کیا ہے کہ ڈاکو آپ کو لوٹ نہ سکے اور ان کا کہنا ہے کہ آپ چھل پیری ہیں۔'' حمزہ حیران ہو کر بولے۔

''آپ لوگ یہ بکواس بار بار نہ کریں چھل پیری...... چھل پیری۔'' وہ میڈیا والوں پر برس پڑے۔ میڈیا والے بھلا کب چھوڑنے والے تھے ہر ایک ہانیہ کا انٹرویو کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ ہانیہ جی کے پاس ایسا کیا خاص ہے؟

''میم! آپ کو کچھ تو بتانا پڑے گا یہ ایک حقیقت ہے پولیس والا بھی کہہ رہا ہے کہ میں ان کے پاس گیا تو اس کو سکتہ ہو گیا۔''

''ہاں یہ ایک راز کی بات ہے اگر میں بتا دوں تو کیا آپ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔''

''اگر ہمیں ہمارے سوالات کے جوابات مل گئے تو یقیناً ہم چلے جائیں گے۔''

''نہیں ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس بات کو ہر چینل پر اچھالیں گے۔''

''میم! یہ تو ہم سچ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں آپ گھبرا کیوں رہی ہیں۔'' حمزہ نے آہستہ سے ہانیہ کے قریب آکر کچھ کہا۔

''ہاں یہ بات بھی صحیح ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پبلیٹی کا اس سے بڑا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں میڈیا پر آکر سچائی بتا دوں کہ میری پرکشش شخصیت کا راز کیا ہے۔'' تمام چینلز کی لائٹس آن ہو گئیں۔

''دراصل بات یہ ہے کہ ''لائف بوائے شیمپو'' کا یہ سارا کمال ہے کہ اس نے میری شخصیت کو پرکشش بنا دیا ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے کہ جب کوئی میرے قریب آتا ہے تو میرے بالوں کی خوشبو اور شیمپو کی بھینی بھینی مہک انسان کو بے خود کر دیتی ہے لائف بوائے شیمپو میں یہ حیرت انگیز کمال ہے۔ یہ آپ کو مطمئن، پرسکون اور جاذب نظر بنا دیتا ہے۔''

''میم! آپ کی شادی کیا ارینج میرج ہے یا لو میرج؟'' ہانیہ ہنس کر بولی۔

''لو میرج......! اور یہ سب کمال لائف بوائے شیمپو کا ہے۔ جس نے حمزہ کو میرا دیوانہ بنا دیا تھا۔ پابندی شرط صرف اتنی ہے کہ آپ روزانہ لائف بوائے شیمپو کا استعمال کریں اور پھر اس کا کمال دیکھیں۔ نرم ملائم، بھینی بھینی خوشبو میں بسا ہوا سارا وجود محسوس ہوتا ہے۔ صرف ایک بار پھر بار بار۔'' ہانیہ چینلز والوں کو اپنا انٹرویو دے رہی تھی۔

☆......☆



افسانہ

اسویرہ علی

عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔

عورت کا بھی اپنا گھر ہوتا ہے، اس کا اپنا ذاتی گھر جہاں سے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ جہاں وہ بہت سکون سے رہتی ہے اور کوئی چاہ کر بھی اسے اس کے گھر سے جدا نہیں کر سکتا۔

☆......☆

"ہائے میں مر گئی۔ مدیحہ تیرا بیڑہ غرق ہو۔" وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں، بریانی کی خوشبو نے انہیں چونکا دیا وہ برقع اتارنا بھول گئیں اور سیدھی کچن میں پہنچیں جہاں مدیحہ گنگناتے ہوئے سلاد بنانے میں مصروف تھی۔ انہیں بے حد غصہ آیا اور انہوں نے دو دھموکے اس کی کمر پر جڑ دیے اور اسے گھورنے لگیں۔

"کس سے پوچھ کر تو نے یہ عیاشی کی ہے؟" انہوں نے دم لگی بریانی کی طرف اشارہ کیا۔

"اماں! میرا دل چاہ رہا تھا۔" وہ اپنی کمر سہلاتے ہوئے بولی۔ تو اس کے جواب سے انہیں پتنگے لگ گئے۔

"ارے بھاڑ میں جائے تیرا دل...... بد بخت کہیں کی۔ ذرا دیر کو میں گھر سے باہر کیا گئی۔ تو نے خود کو ملکہ عالیہ سمجھ لیا، میری محنت سے جوڑی پائی پائی کو اپنے مزے کے لیے ہڑپ کر گئی۔" انہوں نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا، وہ جز بز ہوتی اپنی ماں سے دور جا کھڑی ہوئی۔

"اماں! اب ایسا بھی کیا ہو گیا ہے جو اتنا واویلا مچا رہی ہیں۔" وہ خفا ہوئی انہوں نے خشمگین نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیوں نہ مچاؤں واویلا، اری کم عقل تو سمجھتی کیوں نہیں ہے تیرا باپ صبح سے شام تک خود کو ہلکان کرتا ہے تو چار پیسے کما کر لاتا ہے اس سے بھی گھر کی دال روٹی پوری نہیں ہوتی میں لوگوں کے کپڑے سی کر تیرے باپ کا ہاتھ بٹاتی ہوں بہت سوچ سمجھ کر خرچا کرتی ہوں، تب کہیں جا کر چند روپے جوڑ پاتی ہوں، تجھے ہزار بار یہ بات سمجھا چکی ہوں، پر تیری موٹی عقل میں کچھ گھستا ہی نہیں ہے۔" وہ تڑپ کر بولیں اور ایک بڑا سا لیکچر اسے دے دیا۔ وہ بیزار سی کھڑی اپنے منہ کے الٹے سیدھے زاویے بنانے لگی پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

"اماں میں تو سوچ رہی تھی کہ تو خوش ہو گی پر تو نے کیا خوش ہونا تھا الٹا تو نے میرے دل کی خوشی بھی غارت کر دی، اتنے شوق سے میں نے بریانی بنائی تھی اور تو نے اماں......" وہ رنجیدہ ہوئی اور اپنی بات بھی ادھوری چھوڑ دی۔

"چندا! یہ شوق دل کی خواہش اپنے گھر جا کر پوری کرنا اس گھر میں تو ہمیں معاف ہی رکھو، سمجھیں۔" انہوں نے مدیحہ سے عاجز آ کر کہا اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے، وہ شرمندہ ہو گئی۔

"اماں! یوں تو نہ کر، کیا یہ گھر میرا نہیں ہے جو تو ایسے کہہ رہی ہے۔" اماں کے یوں تنگ آ جانے پر

وہ منمناتی ہوئی بولی۔ آواز میں نمی گھل گئی تھی اور چہرہ بھی ندامت سے سرخ تھا۔ انہوں نے اس کی رندھی آواز سنی تو ایک لمحے کو چپ سی ہو گئیں پھر اس کے قریب جا کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''جھلی ہے تو بالکل، پتا نہیں کب عقل آئے گی تجھے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔

''میری ایک بات اپنے پلو سے باندھ لے کہ باوا کا گھر کبھی بھی اپنا نہیں ہوتا، جہاں لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں جوان ہوتیں ہیں وہ گھر کبھی بھی ان کا نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کا گھر وہ ہوتا ہے جہاں وہ بیاہ کر جاتی ہیں۔ یہ تیرے باپ کا گھر ہے یہ تیرا میکہ کہلائے گا، تیرا گھر نہیں ہر عورت کا اپنا گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے سمجھی کہ نہیں۔'' انہوں نے اس کے سر کو ہلا کر پوچھا تو وہ منہ اٹھا کر حیرت سے اپنی ماں کو دیکھے گئی جیسے کہ انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو وہ ساکت سی ماں کی شکل کو تکنے لگی۔

☆......☆

''مدیحہ، مدیحہ! کہاں مر گئی ہو۔'' وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کا نقشہ کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ اس نے رک کر غور سے جائزہ لیا تو کمرے کی سیٹنگ چینج تھی۔ اسے یک دم غصہ آ گیا اور اس نے اسے چیخ چیخ کر آوازیں لگانی شروع کر دیں۔

''جج...... جی...... کک...... کیا ہوا؟'' وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی سانس بے قابو تھا اور چہرے پر خوف و دحشت تھی۔

''کیا ہے یہ سب؟'' اس نے اشارے سے کمرے کی چیزوں کی ترتیب دکھائی وہ گھبرا کر سر جھکا گئی۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے۔'' وہ غرایا تو مدیحہ ڈر گئی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

''مم...... مجھے پہلے والی ترتیب پسند نہیں تھی تو میں نے اپنی مرضی سے اپنے کمرے کی سیٹنگ کر لی۔'' وہ پریشانی سے اپنے شوہر کی انگارہ آنکھیں دیکھ کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی اور آنے والے طوفان کا اندازہ کرنے لگی۔

''تمہارا کمرہ تمہاری پسند...... ہوش میں تو ہو تم۔'' اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور پھر ایک زور کا طمانچہ منہ پر دے مارا۔

''اپنی اوقات میں رہا کرو۔ یہ گھر میرا ہے اور یہاں مرضی بھی میری چلے گی اور پسند بھی میری ہو گی۔ بھول کر بھی میری اجازت کے بغیر آئندہ کچھ نہ کرنا ورنہ......'' وہ حاکمیت پسند تھا۔ بیوی کو پیر کی جوتی سمجھنے والا اسے بیوی کی مرضی چلانا پسند نہ آیا وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ مدیحہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''میرے آنے سے پہلے کمرے کی حالت بدل دینا، میں سب کچھ پہلے جیسا دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا ناں تو تم صرف تین لفظوں کی مار ہو صرف تین۔'' اسے دھکا دے کر خود سے دور کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆

''ارے! یہ کیا ہو رہا ہے بھابی!'' وہ جیسے ہی اپنے میکے آئی اور گھر کے اندر قدم رکھا تو اسے صحن میں ڈھیر سارا سامان پڑا نظر آیا، کچھ سامان اس کے کمرے کا تھا جہاں وہ شادی سے پہلے رہتی تھی اور کچھ چیزیں اماں کے کمرے کی وہاں پڑی تھیں، اس نے صحن میں کھڑی اپنی بھابی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے مدیحہ تم...... آؤ آؤ وہاں کمرے میں چل کر بیٹھو یہاں صحن میں بہت پھیلاوا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''پر بھابی! یہ سب ہو کیا رہا ہے؟'' وہ ابھی تک حیران وہیں کھڑی تھی۔

''بچے بڑے ہو رہے ہیں ناں تو ان کے لیے الگ کمرہ تیار کر رہے ہیں ہم یہ سب اسی سلسلے کا حصہ ہے۔'' انہوں نے بکھرے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے مگر یہ اماں کا سامان میری چیزیں یہ کیوں ہمارے کمروں سے باہر پڑی ہیں؟'' وہ اپنی بے ترتیب پڑی چیزوں کو اٹھا کر ایک جگہ جمع کر رہی تھی۔

''تمہارا اور اماں کا کمرہ بڑا ہے اور ایک طرح سے خالی ہی پڑا ہے بس فالتو سامان سے گھرا ہوا ہے۔'' انہوں نے تمہید باندھی۔

''تو......'' مدیحہ نے سوالیہ نظروں سے استفسار کیا۔

''تو کیا بھئی بچوں کا سامان وہاں سیٹ کروں گی۔ اب وہ بڑے ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ کاٹ کباڑ باہر نکال کر پھینک دیا۔'' اب کے انہوں نے بالکل مروت نہ برتی اور جتا دیا۔

''بھابی!'' حیرت سے اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

''آپ نے سوچا بھی کیسے یہ بچوں کے لیے کمرہ ہی چاہیے تھا تو یہ اتنا بڑا صحن پڑا ہے۔ نیا کمرہ بنوا لیتیں آپ یہاں میرے کمرے پر قبضہ کرنے کا سوچا بھی کیسے؟ اور مجھے تو خیر رہنے دیں اماں تو یہیں رہتی ہیں پھر بھی آپ نے ان سے ان کا کمرہ چھین لیا۔ آپ کو ذرا شرم نہ آئی آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اماں کہاں جائیں گی۔'' وہ چیخ پڑی۔

''تم سے زیادہ ہے ہمیں اماں کا خیال بلاوجہ اماں سے ہمدردی مت جتاؤ تم، اسٹور روم خالی کر دیا ہے اماں کا سامان وہاں شفٹ کر دیں گے ہم۔'' انہوں نے بھی تنک کر جواب دیا۔

''وہ ڈربہ...... وہ...... اف میرے خدا...... بھائی کو آنے دیں اماں میں بات کرتی ہوں ان سے۔'' اس نے افسوس سے بھابی کو دیکھا اور اماں کو امید دلائی۔

''بھائی سے کیا بات کرو گی یہ سب اسی کی ہدایت و مشورے پر ہو رہا ہے۔'' انہوں نے تمسخر اڑایا اور اکڑ کر کہا مدیحہ نے حیرت سے اماں کو دیکھا تو وہ اپنے آنسو چھپاتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا گئیں وہ سن رہ گئی۔

''اماں! بھائی اتنا کیسے بدل سکتے ہیں؟ انہوں نے ایک لمحے کو بھی آپ کے بارے میں نہیں سوچا آپ کی عمر بھر کی صحت آپ کی ساری ریاضتیں سب بھول گئے آپ نے اور ابا نے کیسے پائی پائی جوڑ کر اسے اس قابل بنایا ہے سب بھول گئے کچھ یاد نہیں کیا انہیں۔ میں بھی دیکھتی ہوں کیسے وہ اپنی من مانی کر سکتے ہیں یہ میرے باپ کا گھر ہے کوئی کچھ کر کے تو دکھائے۔'' اسے تاسف ہوا اور آخر میں شدید غصہ آ گیا۔

''بس چپ کر جا مدیحہ! بہت دیر سے تیری بکواس سن رہی ہوں اب تو کچھ نہیں بولے گی سمجھی۔ جو ہو رہا ہے ہونے دے یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ بہت دیر سے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر جب مدیحہ نے ان کی ایک نہ سنی تو انہوں نے بھی درشت لہجہ اپنایا۔

''پر اماں......''

''کہا ناں چپ ایک لفظ اور نہیں۔'' انہوں نے اسے بولنے نہیں دیا۔

''مگر اماں! یہ گھر میرے ابا کا ہے۔ آپ کا ہے تو کیسے اس طرح۔'' وہ اماں کے گھر کنے پر چلا اٹھی۔

''تیرا ابے کا تھا۔ اب یہ گھر ساجد کا ہے اس

کے بیوی بچوں کا ہے۔ جب تک تیرا باپ زندہ تھا، تب میں بھی اسے اپنا گھر ہی سمجھتی تھی مگر اب...... یہ گھر نہ تیرا ہے اور نہ میرا یہ صرف تیرے بھائی کا گھر ہے، تجھے حق جتانے کی ضرورت نہیں ہے بچی، میرے ساجد نے مجھے اس گھر میں ہی رکھا ہے ناں...... بس میرے لیے یہی کافی ہے تو اس سے آ کر مل اور اپنے گھر جا اور اگر تو یہ سب نہیں کر سکتی تو یہاں آنے کی بھی ضرورت نہیں بچی۔'' انہوں نے تیز مگر رندھی ہوئی آواز میں اسے اپنا فیصلہ سنا دیا اور وہ گنگ سی کھڑی اماں کو دیکھے گئی۔ جیسے کوئی بے جان بت ہو۔

☆......☆

''مدیحہ! میری بچی۔'' وہ جیسے ہی اس کے گھر میں داخل ہوئیں اندر کے منظر نے انہیں ساکت کر دیا۔ وہ کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں بہت واضح تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر ہول گئیں اور بے اختیار اس کی جانب بڑھیں۔

''مدیحہ! مدیحہ کیا ہوا ہے تو ایسے کیوں بیٹھی ہے؟'' انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔ وہ چپ رہی۔ جیسے حواس میں نہ ہو۔

''بول میری بچی، بتا نہ کیا ہوا ہے؟'' اس کی حالت دیکھ کر ان کی آواز میں نمی گھل گئی۔

''سب لوگ کہاں ہیں۔'' انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔

''انور، انور...... ثمینہ کہاں ہو تم سب؟'' انہوں نے مدیحہ کو پیار سے پچکارتے ہوئے اس کے بہو اور بیٹے کو آواز لگائی۔

''مدیحہ! دیکھ میری بوڑھی جان پر کچھ رحم کر کچھ تو بول میرا دل سہما جا رہا ہے۔'' انہوں نے اسے جھنجھوڑ دیا وہ ایک دم ہوش میں آئی اور سسکتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔

''اماں...... اماں آپ کی طرح میں بھی بے امان ہو گئی۔ اماں میرا بھی کوئی نہیں رہا۔'' وہ بے تحاشا روتے ہوئے دکھ سے بولی۔

''ہوا کیا ہے؟'' وہ پریشان ہو گئیں۔

''اماں! انور کہتا ہے میں اپنا یہ کمرہ چھوڑ دوں، وہ کہتا ہے اتنے بڑے کمرے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے استعمال میں رکھے گا میرا کمرہ۔ اماں اس کمرے سے مجھے اس کے باپ کی خوشبو آتی ہے۔ میں اس کمرے میں بیاہ کر آئی تھی اور وہ کہتا ہے میں یہ کمرہ خالی کر دوں۔'' وہ بولتے بولتے اچانک سر اٹھا کر ماں کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جیسے وہ اسے تسلی دیں گی مگر انہوں نے نظریں چرا کر رخ پھیر لیا۔

''اماں!'' وہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے وہ تو بھلا اتنے بڑے کمرے کا کرے گی کیا؟'' انہوں نے اس کی سوچوں کے متضاد جواب دیا۔

''اماں! یہ گھر میرا ہے۔ میرا...... وہ کیسے مجھے بے دخل کر سکتا ہے۔'' وہ چیخی۔

''عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔'' انہوں نے اس کے غمزدہ چہرے کو دیکھا اور عقل کی بات بتائی۔

یہ سننا تھا کہ وہ ہتھے سے اکھڑ گئی اور بے قابو ہوتی چلائی۔

''بس اماں...... بس...... بچپن سے سنتی آ رہی ہوں آپ کا یہ فلسفہ آج نہیں اماں میں نے اس اینٹ گارے کے مکان کو گھر بنایا ہے۔ ایک عورت نے اپنی جوانی گزار کر اس چار دیواری کو مستقبل کا گہوارہ بنایا ہے اپنے دن رات ایک کر دیئے میں نے اس گھر کے لیے اور تم کہتی ہو یہ گھر میرا نہیں۔ تو پھر تم بتاؤ کہاں ہے میرا گھر، کس جگہ کو میں اپنا گھر کہوں۔ بولو ناں اب

خاموش کیوں ہیں؟ جواب دیں مجھے۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی اور پھر اپنی اماں کو ہی پکڑ کر شدت سے ہلا ڈالا جیسے کہ سارا قصور ان کا ہو وہ اس کی بات کا کیا جواب دیتیں۔ دبی دبی آواز میں رونے لگیں۔

''جہاں میں پیدا ہوئی وہ گھر میرے باپ کا تھا، یہی کہا تھا ناں آپ نے، جہاں بیاہ کر گئی وہ گھر بھی میرا نہیں تھا۔ وہ میرے شوہر کا تھا، باپ کے مرنے کے بعد وہ گھر بھائی کا ہو گیا۔ شوہر مرا تو گھر بیٹے کا ہو گیا۔ اماں میں کہاں گئی ان سب کے بیچ۔ کیا میرا کوئی گھر نہیں اماں؟ کیوں نہیں ہے میرا گھر کیوں؟'' وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی اور پھر یک دم ساکت ہو کر اپنی ماں کی گود میں ایک طرف کو لڑھک گئی۔ شاید صدمہ بہت تھا جسے وہ سہار نہ سکی اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆......☆

''آہ! کتنا سکون ہے یہاں ایک طمانیت کا احساس ہو رہا ہے مجھے۔ شکر ہے مجھے میرا گھر تو ملا، کوئی نکال کر تو دکھائے مجھے یہاں سے اور کوئی نکالے گا بھی کیوں؟ میرا بیٹا مجھے خود یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ یہ گھر اس نے اپنی پوری رضا مندی سے مجھے دے دیا۔ اب میں بہت پر سکون ہوں کہ میرا بیٹا اب مجھ سے لڑے گا نہیں بلکہ دو چار دن میں تو وہ میرے نام کی پلیٹ بھی میرے گھر پر لگا دے گا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ میرا گھر ہے۔ بس چند دن اور پھر نام کی پلیٹ میرے گھر پر واضح لگی نظر آئے گی۔ ''مرحومہ مدیحہ باسط'' منوں مٹی کا بنا چھوٹا سا گھر جہاں میں اطمینان و سکون سے موجود ہوں یہ میرا گھر ہے صرف میرا۔''

......☆......

فرح ناز رفیق

افسانہ

منزلِ وفا

''رانی! تیری ملاقات آئی ہے، چل جلدی۔'' اس حبس زدہ کمرے کے ماحول میں جہاں کھڑکیاں تو بہت تھیں مگر روشنی آنے کا سوال نہیں تھا۔ لیڈی کانسٹیبل کی آواز جہاں رانی کے لیے اتنی فرحت بخش تھی کہ وہ بھاگ کر اپنی منزلِ مقصود تک اپنے گوہر نایاب سے ملنے گئی تھی۔ جو کہ اس کا 13 سالہ بیٹا تھا

پورے سیل کی عورتوں نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا اور اپنے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتیں پھر سے اپنے کاموں میں مشغول ہوگئیں تھیں۔

''اے شمی! کتنی خوش قسمت ہے رانی اس کا بیٹا ہر ہفتے ملنے آتا ہے اس سے۔''

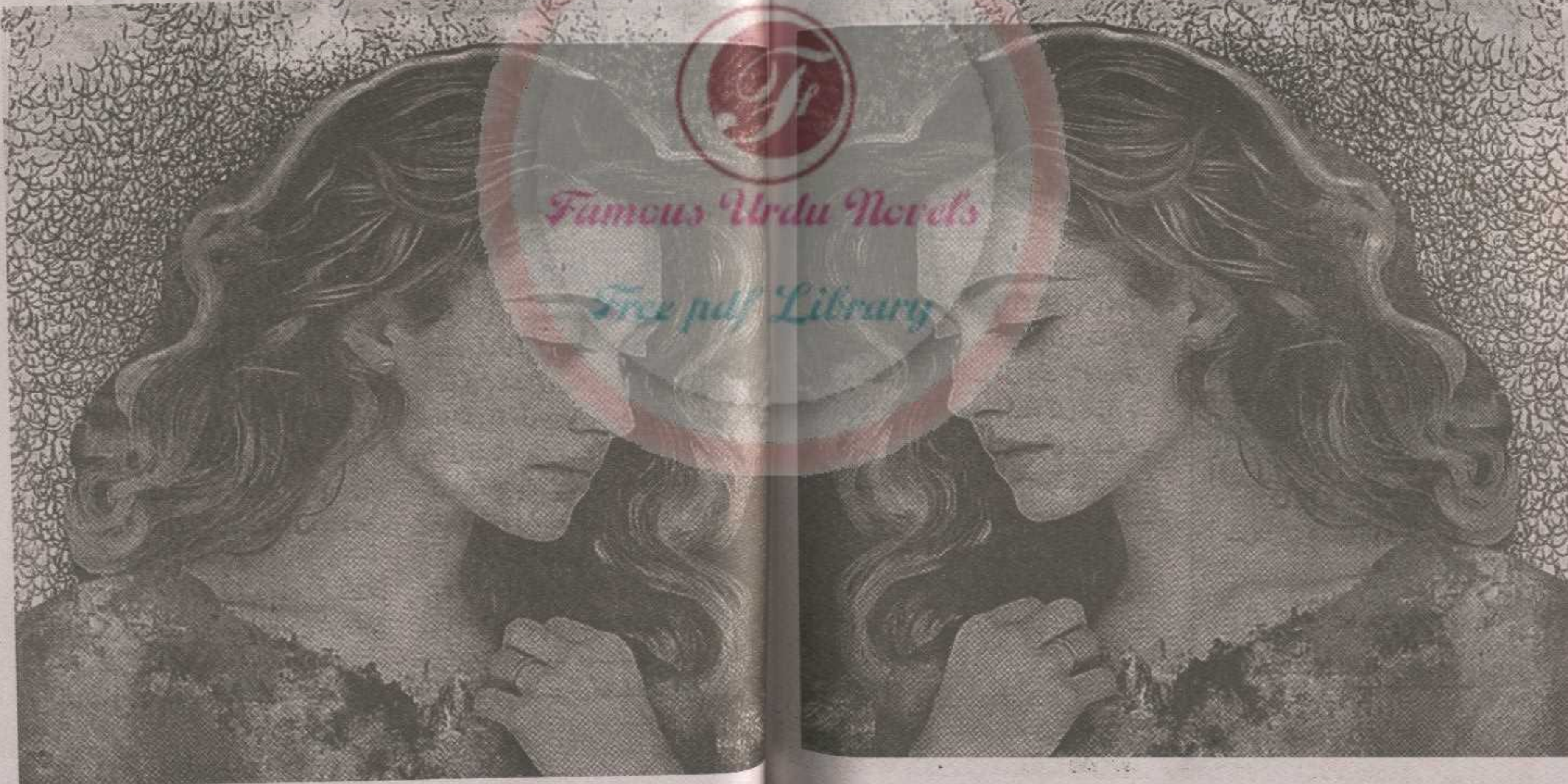
35 سالہ زیبا بی بی نے اس کا کندھا ہلایا تھا جسے رانی کے بلاوے سے نہ کوئی ملال ہوا تھا، نہ کسی اپنے کے آنے کا انتظار بڑھا تھا نہ کوئی آس ٹوٹی تھی مگر زیبا بی بی کا رانی کو خوش قسمت کہنا اسے چونکا گیا تھا۔

''ہاں بی بی! خوش قسمتی تو برستی ہے یہاں کی عورتوں پر اور کل رات کی میزبانی کے بعد تو رانی کو یہ بونس ملنا چاہیے تھا۔ کیوں آخر شہر کا اتنا بڑا رئیس اور شریف انسان اس کا مہمان تھا، ہے ناں۔'' شمی کی بات سن کر زیبا بی بی سمیت موجود تمام خواتین نگاہیں چراتی خاموش ہوگئی تھیں۔

☆......☆

مطاہر تو چل رہا ہے یا نہیں، کب سے منتیں کروا رہا ہے۔ ایک فلم کے لیے سب کزنز جمع ہیں مگر آپ بزی بہت ہیں، میں تو آئندہ آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔'' غصے سے کرسی چھوڑتا باہر نکلنے کو تھا کہ مطاہر نے اسے روک لیا تھا۔

''مسٹر علی مرزا! اتنا غصہ میری بھی سن لیں تم



جانتے ہو زہر لگتی ہیں مجھے یہ انڈین موویز اور میری میٹنگ بھی ہے مگر آپ تو آپ ہیں۔ چلیں چلتے ہیں مگر پہلے اپنا موڈ ٹھیک کرو۔" پانی کا گلاس علی کو دیا تھا۔ اب بھی اسے گھور رہا تھا۔

"مطاہر! یہ لاسٹ ٹائم ہے ہم بھی کام کرتے ہیں مگر تمہاری طرح پاگل نہیں ہوتے۔" علی نے پھر کلاس لی تھی۔

"اچھا بس چل رہا ہوں نا تمہارے سو کالڈ سپر ہیرو کی فلم دیکھنے پائیسر کسی تو ختم ہے ان لوگوں پر۔"

"لیکچر نہیں جانتا ہوں بہت محب وطن ہو تم۔" دونوں چلتے ہوئے پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں تک آئے تھے کہ مطاہر نے ٹون آنے پر کال اٹینڈ کی تھی۔

"جی ملک صاحب کیسے یاد فرمایا؟" بات کرتے ہوئے اشارے سے علی کو ڈرائیونگ کی دعوت دی تھی۔

"جی جی! کب او کے کوشش کروں گا پوری چلیں کوشش نہیں وعدہ میں آجاؤں گا او کے تھینکس۔"

"اب کیا ہوا ہے ملک صاحب کو؟" علی نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں ایک آرگنائزیشن ہے جیل کی خواتین کے لیے ڈونیشن چاہیے انہیں کل ملک کی طرف ڈنر ہے تو میں مل لوں گا ان سے بھی۔" مطاہر نے تفصیل بتائی تھی۔

"یار کن چکروں میں پڑے ہو۔ تم سب جھوٹ بولتے ہیں کوئی یہاں اتنا ہمدرد نہیں ہے اور نہ تم جیسا بے وقوف۔"

"علی! جو تم کہہ رہے ہو وہ میں بھی جانتا ہوں ہر روز بننے والی یہ تنظیمیں فقط میڈیا کوریج اور اپنی پی آر سے مطلب رکھتی ہیں۔ میں جتنے چیکس دیتا ہوں وہ سارے نہ سہی آدھے تو ضرور مستحقین کو ملتے ہوں گے، یہ بھی بہت ہے۔"

"میں جانتا ہوں تمہاری نیت مطاہر! مگر مجھے لگتا ہے کہ ان کی بجائے تم خود جا کر یہ رقم مستحقین کو دو یہ بہتر ہے۔" علی کا مشورہ سن کر وہ خاموش رہا تھا۔ سینما ہال کے باہر سارے کزنز موجود تھے۔

"یہ علی کا موڈ کیوں آف ہے؟" زارا نے استفسار کیا تھا مطاہر کے تفصیل بتانے پر وہ خوش ہو گئی تھی۔

"مطاہر بھائی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔"

"نہیں زارا! تم جرنلسٹ ہو اور میں کوئی میڈیا کوریج نہیں چاہتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"بھائی! جو کاز آپ کا ہے وہ ہی میرا بھی ہے۔ میں ان خواتین سے مل سکوں گی اور کچھ شرفا کے چہرے سامنے لا سکوں گی۔ جو ہماری بنیادوں میں ایک ناسور کی مانند ہیں۔"

"مگر اس سب میں بھی نام میرا آجائے گا جو میں نہیں چاہتا۔"

"نہیں آئے گا نا پلیز مجھے لے جائیں۔" زارا کے بچوں کی طرح ضد کرنے پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

☆......☆

"یہ ہاجرہ آج بڑی خاموش ہے، کھانا کھانے بھی نہیں گئی کیا ہوا ہے اسے؟" رانی نے زیبا بی بی سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اب اس کا غم منا رہی ہے۔"

"کیوں اس نے بھی تو اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ کیا اب بھی آس تھی کہ ساتھ رہتا وہ اس کے۔" رانی نے تعجب ظاہر کیا تھا۔

"اری کم بخت اس کی ماں نے بھی تو بیٹا نہ ہونے کی سزا میں ہاجرہ کی دو بیٹیاں زہر دے کر مار دی تھیں وہ تو کسی کو نہ بتایا۔ وڈیرے کا آدمی تھا ناں شوہر اس کا، تبھی ماں کو بچا لیا اور بیٹے کے لالچ میں بیوی کو سولی چڑھا دیا کہ دوسری عورت بھی مل جائے گی۔"

زیبا بی بی کے انکشاف پر رانی سوائے افسوس کے کچھ نہ کر سکی کہ ایک وقت وہ بھی ہوتا ہے جب انسان بے بسی کی ایسی انتہا پر ہوتا ہے کہ خودکشی کر کے اپنی وہ جان ختم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے جس زندگی کے لیے وہ انسان کا گوشت بھی کھانے کو تیار رہتا ہے مگر بے بسی کی ابتداء بھی مایوسی سے ہوتی ہے اگر اللہ پر توکل مکمل ہے تو کچھ نہ کر سکتے ہوئے بھی ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤ، نیا راستہ وہ دکھانے والا موجود ہے۔ فقط امید و یقین کا ساتھ ہو۔

"تو اچھی ہے زیبا بی بی! نہ خوب صورت نہ جوان میری ماں نے صورت دیکھ کر نام رانی رکھ دیا تھا مگر قسمت رانی جیسی نہ ہوئی۔"

"قسمت تو تیری بھی ابھی تک اچھی ہے۔ شہی کسی کی نظر نہیں پڑی تجھ پر وگرنہ منزل تو سب کی ایک ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔" رانی کی بات پر وہ دہل گئی تھی۔

"بددعا نہ دو مجھے خدارا۔" تڑپ کر رانی کی بات کاٹی تھی۔ یک دم اس قدرے خاموش و افسردہ ماحول میں ہلچل ہوئی تھی۔ لیڈی انسپکٹر وزٹ پر آگئی تھی۔ سب اپنی جگہ خاموشی سے دبک گئی تھیں۔

☆......☆

"کیسی رہی ملک صاحب سے ملاقات؟" ناصر مرزا نے مطاہر سے پوچھا تھا۔

"اچھی تھی مگر آپ کی صاحبزادی نے کام بگاڑ دیا۔ اب کل ان کی وجہ سے مجھے خود سینٹرل جیل جانا پڑے گا۔" صوفے پر بیٹھتے زارا کو گھورا تھا جو ناصر مرزا کی سوالیہ نظروں کی زد میں تھی۔

"تایا جانی! اس جیل میں، میں خواتین سے پہلے بھی مل چکی ہوں جو چیز مجھے چونکا گئی مجبور کر گئی کہ معلوم کروں وہ کیا بات ہے جو اس ملک کی عورت کو اتنا بہادر بنا گئی، بے بس کر گئی کہ اتنے بڑے بڑے جرم آرام سے کر کے ان جیلوں کو باکثرت آباد کر رہیں ہیں، جانتے ہیں مطاہر بھائی کتنے جھوٹے کیسز میں وہاں اگر عورت کی حالت بد سے بدتر ہے تو وہ کیا ریزن ہے جو ایک خوب صورت لڑکی شاندار لباس میں ملزم ہونے کے باوجود اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ کیوں اسے وہاں یہ ضرورت ہے اور کس کے کہنے پر ہو رہا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب میں جاننا چاہتی ہوں جس عورت کا ایک سالہ بیٹا اس کے ساتھ قید ہے، فقط زمیندار کے کتے کو پتھر مارنے کے جرم میں کیا قصور ہے اس ماں کا؟ اور اس بچے کا ذہن تباہ اور مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی سپورٹ ہو گی، تو میرا کام تھوڑا آسان ہو گا۔" اگر آپ نہیں جانا چاہتے کوئی بات نہیں، میں اپنے چینل کے تھرو چلی جاؤں گی۔" مطاہر نے کپ اٹھا کر جاتی زارا کو روکا تھا۔

"میں چلوں گا تمہارے ساتھ تیار رہنا کل۔" اس کا سر تھپک کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ ناصر صاحب اسے روک نہیں سکے تھے۔ نہ زارا کو بتا سکے تھے کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتا شہر کا مشہور بزنس مین جس کی اپروچ ہر طبقے میں بہت اندر تک ہو اس کا استقبال بہت شاندار کیا گیا تھا۔

"مطاہر صاحب! کیا خدمت کی جائے آپ کی۔" جیل سپرنٹنڈنٹ نے ڈیوٹی نبھائی تھی۔

"شکریہ زحمت نہ کریں یہ میرے کزن علی اور زارا مرزا ہیں، میں جلد از جلد اپنا کام کرنا چاہتا ہوں۔" پورے راستے وہ سنجیدہ رہا تھا۔ اب تاثرات سرد ہو چکے تھے۔

"جی ضرور میڈم فرزانہ اس سیل کی انچارج ہیں۔ یہ آپ کو گائیڈ کریں گی۔" آفیسر نے لیڈی کانسٹیبل کو اشارہ کیا تھا۔

"زارا! رقم تم دے دینا میں جا رہا ہوں۔" سیل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"پلیز بھائی! چلیں میرے ساتھ۔" زارا کے اصرار پر وہ اندر بڑھا تھا۔ فرداً فرداً سب کے تعارف، سزائیں اور جرم کی تفصیلات سن رہے تھے جس سے علی اور زارا کو قدرے دلچسپی تھی مگر اسے نہیں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کتنے کیس سچے ہیں اور کتنے ہی آزاد ملک کی آزاد عدلیہ کے تحفے۔ زارا نے میڈم فرزانہ سے کہہ کر کونے میں بیٹھی لڑکی کو پاس بلایا تھا جو سفید چادر میں بظاہر اعتماد سے آگے بڑھی تھی مگر آنکھوں میں خوف واضح تھا۔

''جی شمی نام ہے اس کا۔'' لیڈی آفیسر نے سختی سے ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا۔

''میڈم! آپ جا سکتی ہیں۔ شکریہ ضرورت ہوئی تو آپ کو بلا لیں گے۔'' مطاہر نے سپاٹ لہجے میں آفیسر کو باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔

''میرا نام شبیہہ نور ہے۔ یہاں آ کر شمی ہو گیا ہے۔'' زارا کی مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا تھا مگر پھر بھی علی اور مطاہر سے کافی دور کھڑی تھی۔

''اتنا پیارا نام کس نے رکھا۔ یہاں کیسے ہو آپ؟'' علی نے ذہن میں مچلتا سوال کیا تھا۔

''اندرون سندھ گاؤں تھا ہمارا بابا میرے ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ گاؤں میں اسکول کھولنا چاہتے تھے جو زمیندار کو منظور نہ تھا کہ کسی کسان، مزدور کا بچہ پڑھ لکھ گیا تو اس کا کمی کمین نہیں بنے گا۔ وہ اس کی پشتوں کو غلام نہ کر سکے گا۔ بابا کو قتل کروایا گیا میں کسی طرح پولیس اسٹیشن پہنچ گئی تو میں آج خود مجرم کے روپ میں یہاں موجود ہوں۔ وہ تھانیدار بھی زمیندار کا نمک خوار تھا۔ بغیر کسی کورٹ اور قانون کے میں یہاں ایک ماہ سے ہوں۔ کیوں کہ وہ زمیندار ایک وزیر بھی ہے (اسے کہتے ہیں آزادی اور جمہوریت)۔

باوجود ضبط کے شبیہہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک گئے تھے۔

''تم ایجوکیٹڈ ہو؟'' زارا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''گریجویٹ ہوں آگے پڑھنا نصیب میں نہ تھا۔''

''مطاہر کہاں جا رہے ہو۔'' سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اس قدر تیزی سے باہر نکلا تھا کہ علی روک بھی نہ سکا تھا۔

''تم دونوں گھر جاؤ مجھے ایک کام ہے شام تک آتا ہوں۔'' علی، زارا خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆......☆

دو گھنٹوں کی کوشش کے بعد ایک بھاری چیک کے ساتھ وہ سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں شبیہہ نور کا انتظار کر رہا تھا۔

''مطاہر صاحب بے جا زحمت کی آپ نے یہ کام بغیر رقم کے بھی ہو جاتا۔ ایک لڑکی کی تو بات تھی جب تک آپ چاہتے......''

''انیف۔'' ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروایا تھا۔

''وقت نہیں ہے میرے پاس برباد کرنے کو، فضول گوئی سے پرہیز کریں آپ۔'' خود پر ضبط کر کے باہر نکل گیا تھا۔ مرزا ہاؤس تک کا سفر شبیہہ کے ساتھ بہت خاموشی سے گزرا تھا۔ اس قدر کے مطاہر نے ایک بار باقاعدہ اس کا جائزہ لیا تھا۔ آیا سانس بھی لے رہی ہے یا نہیں مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا گھر والوں سے اس کی حقیقت کے ساتھ متعارف کروایا تھا۔ زرینہ، شازمین بیگم علی اور زارا کی والدہ سگی بہنیں اور دیورانی جیٹھانی تھیں۔ مطاہر سے شبیہہ کا حوالہ انسانیت کا تھا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں میں سب کی محبت کے ساتھ وہ ایڈجسٹ کر گئی تھی۔

آج ایک ہفتے بعد مطاہر سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ نہ جانے کس احساس کے تحت وہ اس کے کمرے میں گئی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں پا کر حقیقتاً شاک لگا تھا۔

''آپ یہاں...... خیریت......؟'' شبیہہ نے دروازہ بند کر کے اسے خاموش ہونے پر مجبور کیا تھا۔

''ہر چیز جو آپ خریدتے ہیں استعمال تو کرتے ہوں گے ان کی تو قیمت بھی کم ہو گی۔ میں تو پھر بہت مہنگا سودا ہوں، مجھے کیوں نہیں استعمال کیا اب تک۔'' بہت نڈر انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''یہ غلط ہے آپ میری بات......'' مطاہر کی یہ کوشش بھی ناکام گئی تھی۔

''کبھی میں نے اپنی اوقات جاننے کی چاہ نہیں کی، حیثیت جانتی تھی اپنی۔ بابا کہتے تھے کہ شبیہہ تو انمول ہے مگر شکریہ آپ کا میرا مول لگا کر میری اوقات واضح کی۔ پھانسی سے زیادہ یہ اذیت ہے کہ میں بک چکی ہوں ایک معمولی چیز کی طرح، کیوں کیا آپ نے ایسا، کیسے بھروں گی میں یہ تاوان روح تو قابل نہیں مگر جس......''

''شٹ اپ ناؤ انیف از انیف۔'' جھٹکے سے کھینچ کر کمرے سے پورچ میں لایا تھا۔ گاڑی میں اس قدر زور سے دھکیلا کہ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ خوف کے باعث چند قطرے نین کٹوروں سے چھلک گئے تھے۔ رش ڈرائیونگ کے ساتھ وہ فرنشڈ گھر میں داخل ہوا تھا اور کھینچ کر اسے بھی لایا تھا۔

''یہ رہا آپ کا گھر مس شبیہہ! ہر ماہ ایک چیک آپ کو مل جائے گا، کسی جاب کی کوشش مت کرنا۔ سوشل ورک بہت کرتا ہوں میں۔ ایک یہ بھی سہی۔ تمہیں وہاں سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ جو تم سوچ رہی ہو۔ اس کے لیے مجھے پیسے بھی خرچ نہ کرنے پڑتے، گھر سے نہیں نکل سکتی تم چیٹ مت کرنا مجھے، ورنہ کیا ہو گا تمہارے ساتھ سوچ ہے تمہاری۔'' براؤن آنکھوں میں غصے کی لہریں تھیں، سرد لہجے میں وارن کرتا گھر سے چلا گیا تھا۔

☆......☆

''مطاہر! میری بات سنو۔'' وہ جو کئی دنوں سے سب سے بچ رہا تھا۔ آج ناصر صاحب کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

''کیا بات ہے اتنے دن ہو گئے ہیں، شبیہہ کہاں ہے؟ اس کے تو گھر والے بھی نہیں ہیں اور ایک لڑکی کو اس طرح اپنے ساتھ بغیر رشتے کے رکھنا کیا معنی رکھتا ہے پتا ہے تمہیں!'' ناصر مرزا اس پر برہم ہوئے تھے۔ جو حیرانگی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''بابا آپ سے کس نے کہا وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟'' تاسف سے پوچھا تھا اور تمام تفصیل انہیں بتا دی تھی۔

''ہم مم کہتی تو وہ ٹھیک ہے مطاہر! آخر کیا حوالہ ہے اس کا ہم سے۔''

''بابا! کیا انسانیت کا حوالہ کافی نہیں ہے۔'' مطاہر نے ان کی بات کاٹی تھی۔

''ہے بیٹا! بہت ہے مگر وہ لڑکی ہے ہمیشہ میری بات مانی ہے تم نے اب بھی سنو مطاہر وہ بے آسرا ہے۔ اسے آسرا دو تم جانتے ہو وہ جہاں تھی وہ اس کا مقام نہیں تھا اسے اپنا حوالہ دو اسے معتبر کر دو۔ اس کی شکایت ختم ہو جائے گی۔'' ناصر مرزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ جو گہری خاموشی کے ساتھ اپنی رضامندی دے رہا تھا۔

''مگر جو کرنا ہے آپ کریں میں نہیں جاؤں گا اس بدتمیز لڑکی کے پاس۔ کسی کی سنتی نہیں ہے۔'' وہ پھر ہتھے سے اکھڑ اٹھا۔

''جیسی بھی ہے تم سے کم ہو گی جاؤ اب تم۔'' انہوں نے اسے گھرکا تھا۔

☆......☆

صبح سے بارش ہو رہی تھی جو شام تک شدید ہو گئی تھی۔ اس کی تو جان جاتی تھی بارش سے۔ سبھی جانتے تھے اس کا ڈر مگر اب اس اکیلے گھر میں اسے خوف آ رہا تھا کہ اسی وقت دروازے کی بیل ہوئی تھی۔

''آج تو علی اور زارا بھی نہیں آ سکتے۔'' وہ ہی دونوں تھے جو اسے اتنے دنوں سے کمپنی دے رہے تھے۔ بدقت تمام بھاگ کر گیٹ کھولا تھا سامنے ناصر مرزا اور تمام گھر والے موجود تھے۔ انہیں لیے اندر بڑھی تھی کہ زرینہ بیگم کا کندھا ملا تو سارے جمع آنسو بہا دیئے۔

''شبیہہ جو کچھ میں کہوں گا اسے غور سے سننا اور پھر فیصلہ کرنا۔'' ناصر مرزا اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

''یہ میرا اور مطاہر کا راز ہے جو آج اب سب جانیں گے جسے صرف زرینہ اور شازمین جانتی ہیں۔ مطاہر میرا سگا بیٹا نہیں ہے اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ماں نے جس میڈیسن کمپنی میں جاب کی تھی۔ وہ جعلی کاروبار میں ملوث تھے۔ پولیس ریٹ ہوا۔ مالک نے رشوت کے بل پر مطاہر کی والدہ کو اریسٹ کروایا کہ موقع پر وہ ہی موجود تھیں۔ ان کا کوئی ضمانتی نہیں تھا۔ جھوٹے کیس میں 10 سال کی

سزا سنائی گئی۔ مطاہر بھی ان کے ساتھ جیل گیا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس جیل میں ہونے والا گھناؤنا انسانیت سوز کاروبار بڑے ہونے کے ساتھ مطاہر نے تمام تر شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ قریب تھا کہ اپنا اخلاق معصوم سوچ وہ کھو دیتا۔ اس کی ماں نے اسے میرا پتا دیا اور جیل سے نکال دیا اس کے والد میرے منیجر تھے 7 سالہ بچہ میرے سامنے تھا میں چاہتا اسے یتیم خانے بھیج دیتا مگر میری زرینہ کی اولاد نہیں تھی تو ہم نے اسے اللہ کا انعام سمجھ لیا۔ پھر علی اور زارا ہمارے نصیب میں تھے۔ مطاہر ہمیں اور زیادہ عزیز ہوا کہ اس کی محبت علی اور زارا کے لیے ہم سب سے زیادہ تھی۔ تعلیم کے بعد مطاہر نے مجھ سے رقم ادھار لی اور بزنس اسٹارٹ کیا جو آج دوگنا ہو چکا ہے اور وہ رقم نہ صرف پیسوں کی صورت بلکہ ہر طرح سے مجھے ادھار لوٹایا اور اس قدر کہ آج میں اس کا مقروض ہوں۔ آج یہ سب میں صرف تم دونوں کو خاص طور پر بتا رہا ہوں کہ کبھی تم اس پر انگلی نہ اٹھا سکو سمجھے۔'' ناصر مرزا نے علی زارا کو مخاطب کیا تھا۔

''ایسا لگتا ہوں آپ کو میں بابا جانی! مطاہر جان ہے میری اور آپ......'' علی سے آگے بولنا محال تھا۔

''جذباتی نہ ہو زیادہ، اگر ہوئے کبھی تو جانتے ہو مطاہر بھائی کو تم، میں تو ہوں ہی معصوم۔'' زارا کی شرارت پر سب ہنس دیے تھے اور علی نے اسے گھورا تھا۔

''شبیہ! تمہاری صورت میں اسے اپنا آپ نظر آیا تھا۔ اپنی ماں کو نہیں بچا سکا، اسی قید میں خاموشی سے ان کی مرقد بن گئی مگر اس نے تمہیں بچایا ہے کیا غلط کیا اس نے؟ اب اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تمہیں منظور ہے تو ہم تمہیں مطاہر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی دباؤ نہیں ہے اپنا فیصلہ بتاؤ تم ہمیشہ ہماری بیٹی رہو گی۔'' ناصر مرزا نے اس کا سر تھپکا تھا۔

''میرا فیصلہ آپ کی خوشی ہے۔'' شبیہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے ان سب کی محبتوں کے آگے اسی وقت مطاہر کو بلایا گیا تھا وہ بھی ناصر مرزا کے حکم پر۔ نکاح کے فوراً بعد وہ چلا گیا تھا۔ شبیہ سب لوگوں کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔ علی اور زارا کے ساتھ وہ مطاہر کے کمرے میں موجود تھی۔

''علی! اب تم شرافت سے چلے جاؤ، مجھے بھابی کو تیار کرنا ہے۔''

''تو کرو میں نے منع کیا ہے اتنا وقت ضائع کر کے ان محترمہ اور ان چنگیز خان کے کچھ لگتے مطاہر صاحب کے دل کے راز جانے ہیں، سنو گی نہیں۔'' علی نے رشوت دینا چاہی تھی۔

''نہیں سننا میں سب جانتی ہوں۔'' زارا نے اسے باہر نکال کر اپنا خوب صورت گرے اینڈ سلور سوٹ اسے دیا تھا اور ہلکا سا میک اپ کر کے وہ باہر جا رہی تھی کہ شبیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پلیز تم رک جاؤ۔ بہت ڈر لگ رہا ہے انہیں تو غصہ بھی بہت آتا ہے پلیز!'' اس کی فرمائش پر زارا اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

''بی بی مانا میں میڈیا کی لڑکی ہوں، ہر چیز سب سے پہلے کور یج کرتی ہوں مگر سوری آج رات میری چھٹی ہے نہ میرا انٹرسٹ ہے کہ اپنی شامت مطاہر بھائی سے کرواؤں، آپ کی لائیو کوریج کر کے۔'' زارا کی جھاڑ پر اس کی پلکیں لرز کر سایہ فگن ہوئی تھیں۔

تقریباً دس منٹ بعد ہی مطاہر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ لائٹ آن کر کے اندھیرا دور کیا تھا۔ صوفے پر آج پھر وہ موجود تھی بہت جلد اپنے اعصاب کنٹرول کیے تھے اور ڈریسنگ روم کی طرف چل پڑا تھا۔ باہر آ کر اچھی خاصی ٹھنڈ میں روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی نکال کے پیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے پوری طرح اس کی حرکات محسوس کر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہیں آپ یہاں؟'' اس کے قریب کھڑا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے بابا جانی لائے ہیں اور یہ میرا بھی کمرہ ہے۔''

''کس نے کہا آپ کا کمرہ ہے؟'' دو قدم چل کے مزید اس کے قریب ہوا تھا۔

''چند گھنٹوں قبل آپ ہی نے تمام حقوق دیے ہیں۔ میں اپنا فیصلہ کر کے یہاں موجود ہوں آگے آپ بھی آزاد ہیں اپنے فیصلوں میں مگر آپ ہمیشہ میرے محسن رہیں گے، آپ کا احسان میں کبھی نہیں اتار سکتی۔'' اس نے بہت آرام سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

''اب احساس ہوا ہے کہ میں محسن ہوں۔ اس وقت تو بہت برا لگ رہا تھا میں آپ کو، ایک خریدار۔''

''پلیز آئی ایم سوری وہ میری غلطی تھی مطاہر! میں سب جانتی ہوں، ہم دونوں اپنا ماضی کبھی نہیں بھولیں گے مگر ہمیشہ صرف اچھی یادیں اور مہکتے لمحے دہرائیں گے پلیز۔'' شبیہ نے التجا کی تھی۔

''مگر میں نے ابھی فیصلہ تو نہیں کیا کہ ہم ماضی دہرانے کو مستقبل میں ساتھ ہوں گے یا نہیں۔'' مطاہر کی بات پر نینوں سے چند اشک ٹوٹ کر بکھرے تھے۔

''انہی آنسوؤں نے اس دن مجھ سے وہ قدم اٹھوایا تھا۔ بہت ظالم ہو تم ابھی مجھے فیصلے کا اختیار دیا تھا۔ اب مجبور کر رہی ہو کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو۔'' آپ سے تم کرتا درمیان کی خلیج ختم کرتا وہ اس تک بہت آرام سے آیا تھا۔

''شبیہ! اس دن جیل وزٹ پر مجھے ہر طرح کی آفر تھی۔ تم جانتی ہو ایک چیک پر تمہارا وہاں سے نکل جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں، جب بغیر کورٹ کے فیصلہ ہو سکتا ہے تو ضمانت بھی ہو سکتی ہے، اگر میں نہیں کرتا کچھ تو تم کسی ہیومن رائٹس تنظیم کا سہارا لیتیں۔ وہ تمہیں میڈیا کے ذریعے اتنا ہائی لائٹ کرتے کہ اس آزادی سے تم قید بہتر سمجھتیں۔ میں دن رات ان لوگوں میں رہتا ہوں۔ سب غلط نہیں ہیں، بہت سے لوگ مخلص ہیں۔ سچی نیت سے کام کر رہے ہیں مگر تعداد بہت کم ہے۔ میں نے تمہیں بچایا کیا غلط کیا؟ ہم سب یہ ہی سوچتے اور کہتے ہیں۔ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے مگر درحقیقت بہت کچھ نہ سہی کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں اگر ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے تو کیا ایک انسان کو بچانا انسانیت پر احسان نہیں۔ ضرورت صرف ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے جو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر کی جائے۔''

''تھینکس مطاہر! اینڈ آئی ایم سوری۔'' جھلمل پلکوں کے ساتھ اس کے روبرو کھڑی تھی۔

''تھینکس کے بعد سوری نہیں کچھ اور بنتا تھا۔'' مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تھا جو حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''مسز شبیہ مطاہر! آپ ہمیشہ کام غلط کرتی ہیں، غلط جگہ، غلط وقت، غلط ری ایکشن، غلط جملہ سمجھیں آپ۔'' اس کی جھاڑ پر شرمندگی سے اسے دیکھا تھا۔

''اچھا اب کیا غلط کیا ہے میں نے؟'' اعتماد بحال کر کے نظریں ملائیں تھیں۔

''پہلے کی چھوڑ دیں۔ ابھی دیکھ لو اتنے حسین سوٹ کے ساتھ اس بیڈ کی سجاوٹ کے باوجود تم یہاں صوفے پر بیٹھی ہو۔ حالانکہ آئی تھنک یہ سب تمہارے روپ کے خراج کے لیے ہیں۔ تو میں بہت ناراض ہوں اگر مجھے منانا چاہتی ہیں محترمہ تو بیڈ پر تشریف لے جائیں میں بابا کو تھینکس کہہ کر آتا ہوں۔'' شدتوں سے پر لہجے میں اس کا ہاتھ دباتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ بمشکل دل سنبھالتی بیڈ تک آئی تھی۔ اگر وہ باہر نہ جاتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ بیڈ پر دھرے سرخ و سفید گلاب کو اس نے چھو کر دیکھا تھا اور رب کریم سے دعا کی تھی کہ ان پھولوں کی ٹھنڈک اور مہک کی مانند ان کی آئندہ زندگی بھی مہکتی رہے۔

......☆......

سعدیہ اقبال

افسانہ

روشن مستقبل کی آرزو

گاڑی سگنل پر رکی، حریم نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں، آج ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ تبھی اس کی نظر سڑک کے دوسرے کنارے بنے فٹ پاتھ پر کھڑے عجیب سے حلیے والے بچے پر پڑی، اور حریم کو اس کا چہرہ شناسا لگا۔



''ارے ہاں یہ تو حمزہ ہے''۔ وہ بڑبڑائی پہچان گئی تھی وہ حمزہ کو بھولتی تبھی کیسے ابھی دو سال ہی تو ہوئے تھے، دو سال پہلے کی بات تھی، جب حمزہ لوگ ان کے پڑوسی تھے، مگر جب حریم لوگوں نے اپنا گھر تبدیل کیا تو اپنی زندگی کی مصروفیت میں اس قدر ڈوبے کے پچھلا سب بھول گئے۔

آج حمزہ کو یہاں دیکھ کر اسے سب یاد آ گیا تھا، عارف انکل، ثمینہ آنٹی، اور ان کا پانچ سالہ بیٹا حمزہ، مگر اب تو وہ بڑا ہو گیا تھا، آج بھی اس کا چہرہ ویسا تھا سنجیدہ مگر معصوم۔ خیالات کا تلاطم یک دم شانت ہوا سگنل کھل چکا تھا، حریم نے فٹ پاتھ پر دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے حمزہ کھڑا تھا۔ مگر اب وہاں نہیں تھا، حریم جی بھر کر حیران ہوئی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

گھر آ کر امی سے ذکر کیا، تو وہ بولیں۔

''اس میں کون سی نئی بات ہے؟ اسی شہر میں ہی تو رہتے تھے ثمینہ لوگ آ گیا ہو گا تمہیں حمزہ نظر''۔

''مگر امی! وہ عجیب سے حلیے میں تھا، میلے کپڑے سنجیدہ لگا وہ مجھے''۔ حریم کے دل کو چین کہاں تھا اب۔



"چھوڑو بھی تم جا کر کھانا کھالو کچن میں رکھا ہے"۔ حریم اٹھ کر کچن میں آ گئی اور سارہ وقت حمزہ کے بارے میں سوچتی رہی۔

......☆......

ابھی اس بات کو دو دن ہی گزرے تھے، حمزہ پھر سے حریم کو اسی فٹ پاتھ پر نظر آ گیا، مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا، کچھ قدرے بڑی عمر کے لڑکے حمزہ پر جھپٹ پڑے تھے۔ حمزہ کے ہاتھ میں شاید کچھ کھانے کو تھا۔ جو وہ لڑکے اس سے چھین کر بھاگ چکے تھے۔ تاہم ان لڑکوں کا حلیہ بھی حمزہ جیسا ہی تھا میلا کچیلا۔ حمزہ وہیں بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ حریم کا نرم حساس دل یک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے گاڑی اسی فٹ پاتھ کے پاس لے جا کر روک دی۔

"حمزہ......!" گاڑی سے اتر کر حریم نے پکارا۔

مگر وہ ہنوز ایسے ہی بیٹھا تھا۔ "حمزہ......" حریم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"وہ میرا کھانا لے گئے"۔ حمزہ نے اپنی انگلی سے اس طرف اشارہ کیا جہاں وہ لڑکے بھاگے تھے۔

حریم نے حمزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھایا، اور ایک کینٹین کے پاس رک کر کھانے کا سامان لے کر حمزہ کو پکڑا دیا۔ حمزہ سامان دیکھ کر خوش ہو گیا، اب وہ بھوک کو با آسانی شکست دے سکتا تھا، حریم اسے لے کر پاس بنے بینچ پر بیٹھ گئی۔ حمزہ جلدی جلدی بسکٹ کا پیکٹ کھول کر کھانے لگا۔

"امی کہاں ہیں حمزہ؟"

"وہ گھر میں ہیں بیمار ہیں، تبھی آج میں کام پر آیا ہوں"۔ حمزہ نے معصومیت سے جواب دیا جیسے وہ بہت بڑا اور ذمہ دار ہو گیا ہو۔ حریم کو حمزہ پر بہت پیار آیا اور ترس بھی۔

"اور ابو؟"

"وہ تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے، ہمیں چھوڑ کر"۔ حمزہ اپنی عمر سے کئی گناہ زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کی معصوم پاکیزہ آنکھوں میں بچپن کی شرارتیں دم توڑ چکی تھیں۔

"مجھے امی کے پاس لے چلو"۔ وہ بے قراری سے بولی۔

اگر حمزہ کی جگہ کوئی اور بچہ ہوتا تو تب بھی حریم اسے کھانا کھلاتی مگر اس کی فیملی کے بارے میں استفسار نہ کرتی، مگر حمزہ انجان نہیں تھا، ثمینہ آنٹی بھی حریم کو یاد تھیں، ہاں اپنی پڑھائی اور جاب میں وہ کچھ عرصہ فراموش کر بیٹھی تھی۔

ثمینہ آنٹی کی پیار بھری نیچر آج بھی اسے یاد تھی، کتنا لگاؤ تھا انہیں حریم سے جب بھی حریم کو ایمرجنسی میں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو آنٹی اپنا سارا ضروری کام ترک کر کے حریم کے ساتھ مارکیٹ چل پڑتیں، اور جب اس کے امتحان ہوتے صبح صبح آنٹی آ کر حریم کی امی کے ساتھ گھر کے تمام کاموں میں مدد کروا جاتیں، تاکہ حریم کی پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔ دو سالہ حمزہ سے حریم کو بہت لگاؤ تھا۔

وہ سیکنڈ ایئر میں تھی جب عارف انکل، ثمینہ آنٹی اور ان کا گول مٹول سا حمزہ ان کے پڑوس میں رہنے آیا تھا، اور عارف انکل کی حریم کے ابو سے خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تین سال گزر گئے۔

فیاض احمد (حریم کے ابو) نے نیا کاروبار شروع کیا اور ان کا کاروبار کامیاب رہا تبھی حریم لوگ اس علاقے کو خیر آباد کہہ کر ایک خوبصورت پوش ایریا میں شفٹ ہو گئے، حریم نے جانے سے پہلے ثمینہ آنٹی سے ملنا چاہا مگر وہ لوگ اسی روز صبح گاؤں جا چکے تھے بغیر اطلاع کیے، حریم کافی اداس ہوئی تھی جاتے وقت، آج اچانک حمزہ سے مل کر شدت سے حریم کا دل چاہا ثمینہ آنٹی سے ملنے کا، وہ حمزہ کو اسی فٹ پاتھ کے پاس لے آئی گاڑی لاک کی اور حمزہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑی دور ایک خستہ حال علاقے میں لے آیا۔ چھوٹی تنگ، بدبودار گلیوں سے گزرتے وقت حریم کا دل گھبرانے لگا، حمزہ اسے لئے ایک پرانے گھر کے سامنے لے آیا۔

وہ گھر تو نہیں تھا کھنڈر تھا، یہ وہ علاقہ ہرگز نہیں تھا جہاں پہلے حمزہ لوگ رہائش پذیر تھے، حریم نے حیرانی سے گھر کے اندر قدم رکھا، اندر جاتے ہی حریم کو لگا جیسے

درودیوار سے ویرانی ٹپک رہی ہو۔ حمزہ چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا حریم بھی اس کے پیچھے تھی۔

"امی! آپی آئی ہیں"۔ حمزہ کی آنکھوں اور لہجے میں خوشی عیاں تھے۔

"کون؟" ثمینہ بمشکل چارپائی کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی، اور سامنے چارپائی پر بیٹھی ہستی کو دیکھ کر حریم سکتے میں آ گئی۔ یہ تو وہ ثمینہ آنٹی نہیں تھیں، زرد رنگت، ہڈیوں کا پنجرہ سیاہ حلقے، ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کی تمام تر تلخیوں نے اپنا سارا زور خوب آزمایا ہو ان پر۔

ثمینہ کی حالت دیکھ کر حریم کی آنکھیں بھر آئیں، حمزہ ساتھ پڑا اسٹول حریم کے پاس لے آیا اور اسے بیٹھنے کا کہا، وہ بیٹھ گئی...... اور خالی خالی آنکھوں سے ثمینہ آنٹی کو دیکھتی رہی، بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

"آنٹی؟ آپ یہاں اس حال میں؟" دکھ کی شدت سے سوال بھی ٹھیک سے نہ کر پا رہی تھی۔

"حالات اور تقدیر کی مار نے مجھے اس حال میں پہنچا دیا ہے"۔ عجیب سناٹے دار آواز تھی حریم کو ایسا ہی لگا۔

وہ حریم کو بھولی نہ تھیں، آج اتنے عرصے بعد حریم کو یوں اپنے لئے فکرمند دیکھ کر انہیں اپنے پن کا احساس ہوا تھا۔ جب سے عارف ثمینہ اور حمزہ کو چھوڑ کر گئے تھے۔ ثمینہ نے تو اپنے اندر دکھ پالنا شروع کر دیئے تھے۔ کسے کہتی، کون تھا اپنا؟ حریم کو دیکھ کر آج ثمینہ پھٹنے کو تیار تھی۔ تبھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی کب سے خشک آنکھیں آج سیراب ہوئی تھیں۔ حریم نے بمشکل انہیں چپ کروایا۔

"آنٹی بتائیں، آپ کا نمبر بھی بند ہو گیا تھا، اچانک گاؤں کیوں چلی گئی تھیں آپ، اور حمزہ اس حال میں فٹ پاتھ پر"۔ وہ واقعی فکرمند تھی۔

"حمزہ کے ابو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اچانک ہمیں گاؤں جانا پڑا شاید آب و ہوا تبدیل ہونے سے اچھا اثر ہو ان پر"۔ ثمینہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔ حریم کو تسلی نہ ہوئی۔

"تو پھر عارف انکل کی وفات کب ہوئی اور آپ، حمزہ اس حال میں، ایسی زندگی کیسے گزار رہے ہیں؟" حریم انجانے میں ثمینہ کے گہرے زخم کریدنے لگی بار بار سوال کر کے۔

بہت ٹالنے کے بعد بھی جب حریم نہ مانی، تو ثمینہ پھٹ پڑیں۔

"کیا سننا چاہتی ہو، کیا بتاؤں میں تمہیں، یہی کہ آج زندگی کے اس بھیانک موڑ پر ہم تمہارے باپ کی وجہ سے پہنچے، وہی تھے عارف کی امیدیں توڑنے والے میرے خوشحال گھرانے کو بلندی کے خواب دکھا کے زمین پر گرانے والے۔ حمزہ کے روشن مستقبل کو تاریکی کی نظر کرنے والے"۔

ثمینہ بلک بلک کر رو دیں، وہ حریم کو اس کے باپ کی حقیقت ہرگز نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ ان کے ساتھ تو جو ہوا وہ ہو کر گزر چکا تھا مگر ثمینہ اس نرم دل حساس لڑکی کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مگر حریم کی ضد پر ان کے دل کے تہہ خانے میں دبے دکھوں کو زبان مل گئی آج۔

"ابو......؟" وہ کیسے حریم کو اپنے باپ کا نام سن کر کرنٹ لگا۔

"ہاں تمہارے ابو (فیاض احمد) نے حمزہ کے ابو کو کاروبار کا مشورہ دیا تھا، مگر ہمارے مالی حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے۔ عارف کے پاس کاروبار میں انویسٹ کرنے کے لئے بڑی رقم نہ تھی مگر تمہارے ابو نے عارف کو بہترین مستقبل کے خواب دکھا کر حمزہ کی اعلیٰ تعلیم اور بڑے گھر کی خوبصورت کہانی سنا کر آخر منا ہی لیا، اور عارف نے تمہارے ابو کی مانگی گئی رقم کا انتظام کرنے کے لئے مجھے بغیر بتائے گاؤں کی زمین گھاٹے میں بیچ دی، مگر پھر بھی وہ رقم تمہارے ابو کی مانگی رقم سے خاصی کم تھی۔" ثمینہ کا سانس پھولنے لگا حمزہ بھاگ کر پانی لے آیا۔ ثمینہ جلدی جلدی پانی چڑھا گئی جیسے بہت لمبی مسافت طے کر آئی ہو۔

"عارف کو تمہارے ابو پر اندھا اعتماد تھا، اور وہ کسی صورت تمہارے باپ کی آفر ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا، اور جلد بازی میں عارف نے ہمارے گھر کی چھت بھی

چھین لی۔ ہمارا گھر جہاں ہم رہتے تھے وہ بھی بیچ دیا، رقم پھر بھی کم تھی البتہ عارف نے سوچا جتنی بھی ہے کاروبار میں انویسٹ کر کے جو حصہ ہوگا وہ ہماری چھوٹی سی فیملی پر کافی ہوگا"۔ ثمینہ کے لہجے میں شدید افسوس نمایاں تھا کہ کاش یہ سب نہ ہوتا۔

حریم دم سادھے سن رہی تھی۔

"پھر وہ ہوا جس نے ہماری دنیا کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا، تمہارے باپ نے ایک پل نہ لگایا عارف کی امید کا خون کرنے میں"۔

"اتنے کم پیسوں میں کاروبار نہیں ہوتے عارف میاں"۔ فیاض احمد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"مگر یار! میرے پاس تو میری زندگی کا کل سرمایہ اتنا ہی ہے، میں نے اپنی زمینیں بھی بیچ دی ہیں۔ تم انہیں کاروبار میں لگا لو جتنا حصہ ہو میں راضی ہوں"۔ عارف لجاجت سے بولا۔

"میں نے کہا تھا زمین بیچ دو، اتنی جلدی کیا تھی صرف کہہ دیتے تمہارے پاس نہیں ہیں پیسے، میں نے گھر نہیں بیچا" بارا معذرت کے ساتھ میں تمہیں اس کاروبار میں شامل نہیں کر سکتا"۔ الفاظ تھے یا تیز دھار چاقو؟ عارف کو لگا اسے ذبح کر دیا گیا ہو۔

"پھر ہزار منتیں کیں عارف نے مگر بے سود، فیاض احمد راضی ہونا ہی نہیں چاہتے تھے کسی صورت، کیونکہ انہیں کوئی اور پارٹنر مل چکا تھا تب عارف کو فیاض احمد کا گریز سمجھ آ گیا۔ اور وہ بری طرح ٹوٹ چکے تھے سب لٹا کر بھی خالی ہاتھ رہے"۔ کرب سے ثمینہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ حریم کو ان کی آنکھوں میں اپنے ابو کے لئے نفرت واضح نظر آ گئی تھی۔

"تبھی تمہارے باپ کا کاروبار چل نکلا، عارف جب فیاض احمد کو دیکھتے۔ ان کا درد اور بڑھ جاتا وہ اذیت کی چکی میں دن رات پستے رہے تھے، مجھ سے بھی شرمندہ شرمندہ رہتے، پھر ہم نے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا، اور وہاں جا کر ہم نے اپنوں کے بھیانک اذیت ناک رویئے دیکھے تو ہمیں تمہارے باپ کا دیا ہوا دھوکا بہت کم لگا۔ عارف اپنے بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر واپس لے آئے مجھے اور حمزہ کو، اور یہاں فیکٹری میں ملازمت کر لی"۔

"مگر قسمت کو شاید ہمارا سکھ منظور نہ تھا، گاڑی کے چار پہیے مکمل ہوں تو زندگی کی گاڑی آسانی سے سفر کرتی ہے، مگر میری زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ تقدیر نے مجھ سے چھین لیا۔ عارف جس فیکٹری میں کام کرتے تھے وہاں آگ لگ گئی، اور عارف بری طرح جھلس گئے، مگر سانسیں باقی تھیں، اور وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ پرائیویٹ ہسپتال کا خرچ برداشت کرتے کرتے میں نے بیچی گئی زمینوں کی رقم عارف کے علاج میں لگا دی، مگر شاید عارف بہت ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جینا نہیں چاہتا تھا اور اس بے رحم دنیا میں مجھے اور ننھے حمزہ کو بے آسرا کر گیا"۔ ثمینہ کی آواز رندھ گئی۔

حریم کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

"حالات کی تند و تیز لہروں نے میری زندگی کو بے جان شے کی طرح تھپڑوں کے حوالے کر دیا۔ اندر ہی اندر گھٹ کر مر رہی ہوں، کیا تھا اگر ان برے حالاتوں میں تمہارا باپ عارف کا ہاتھ تھام لیتا، تو شاید آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ خیر میں تمہیں کیوں قصور وار ٹھہراؤں میری تقدیر میں یہ مذاق لکھا تھا میرے ساتھ"۔ یکدم سناٹا چھا گیا جیسے میدان جنگ میں شکست کے بعد میدان میں خاموش پڑی لاشوں کا ڈھیر ہو۔

حریم کو سخت شرمندگی محسوس ہوئی کہ اس کا باپ کسی کی زندگی کے ساتھ دھوکا کر کے آج اسی کاروبار سے اپنی قسمت چمکا رہا ہے۔ اچانک حریم نے ثمینہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، اور بے آواز رونے لگی۔

"تم کیوں معافی مانگتی ہو حریم! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں بس تمہیں اپنا سمجھتی ہوں، تبھی ان ہولنا کیوں کو اپنے اندر نہ سما سکی اور تمہارے سامنے انڈیل دیں"۔ وہ کرب سے مسکرائیں۔

حریم وہاں سے اٹھ کر بھاگ آئی۔ اس کی برداشت

کی طنابیں ٹوٹنے والی تھیں، کافی دیر سڑکوں پر بلاوجہ پھرنے کے بعد وہ گھر آ گئی اسی لمحے اس کے دل نے شدت سے دعا کی اس کا باپ گھر نہ ہو اور حریم سے ان کا سامنا نہ ہو، اور ایسا ہی ہوا۔

......☆......

دو دن حریم کمرے میں بند رہی، نائلہ بیگم (حریم کی امی) پوچھ پوچھ کر کے تھک گئیں، مگر وہ ہنوز خاموش تھی۔ اسے رہ رہ کر معصوم حمزہ اور ثمینہ آنٹی کا شکستہ چہرہ یاد آتا رہا۔ ان کا دکھ اسے اپنا لگا۔ کچھ دن دماغ کو کافی حد تک سنبھالنے کے بعد وہ پھر ثمینہ آنٹی کی طرف آ گئی، گھر میں قدم رکھتے ہی اسے کافی لوگ نظر آئے جو شاید ثمینہ آنٹی کی مجبوری کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سب کے بیچ سے بمشکل گزر کر وہ ثمینہ آنٹی کی طرف بڑھی۔ مگر ثمینہ تو شاید زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھیں۔ حریم کو دیکھ کر ان کے چہرے پر امید کا رنگ آ کر لوٹ گیا۔

"آنٹی! کیا ہوا چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس"...... اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ثمینہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں حریم! میرا آخری وقت آ گیا ہے شاید، میرے بعد میرے حمزہ کا کیا ہوگا، وہ تنہا رہ جائے گا...... تم مجھ سے وعدہ کرو حمزہ کو تنہا زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں نہیں چھوڑو گی، اپنے باپ کی غلطی کا ازالہ کرو گی، میں نے آج پورے دل سے تمہارے ابو کو معاف کر دیا ہے، خدارا اس کی حفاظت کرنا"۔ بڑی محبت بھری نظروں سے ثمینہ نے ساتھ کھڑے روتے ہوئے حمزہ کو دیکھا۔

"آپ فکر نہ کریں میں وعدہ کرتی ہوں حمزہ میرے ساتھ رہے گا میں رکھوں گی اس کا خیال"۔ بس حریم کا اتنا کہنا تھا، اور ثمینہ نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

حریم حمزہ کو گلے لگا کے بری طرح رو دی۔

......☆......

محلے والوں کے ساتھ مل کر حریم نے ثمینہ آنٹی کا کفن دفن کروایا اور ایک عہد کے ساتھ حمزہ کا ہاتھ تھام کر گھر کی طرف آ گئی۔ آج کی تمام تر تلخیوں سمیت سورج غروب ہو چکا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی، لاؤنج میں بیٹھے فیاض احمد نے اسے پکارا۔

"حریم!" وہ رک گئی۔

"کہاں تھیں تم صبح سے، تمہارے آفس بھی فون کیا مگر تم وہاں بھی نہیں تھیں، اور یہ کون ہے؟ کہاں سے اٹھا لائی ہو اسے"۔ حمزہ پر نظر پڑتے ہی وہ پریشان ہوئے۔

"یہ وہ ہے جس کی زندگی آپ کے دھوکے کی نظر ہو گئی، یہ وہ ہے جس کے باپ کی امیدوں کا چراغ آپ ہی نے جلا کر پھر خود ہی بجھا بھی دیا"۔ وہ یک دم آپے سے باہر ہو گئی۔

"کیا بکواس ہے صاف صاف کہو"۔ فیاض احمد بھی غصے میں آ چکے تھے۔

"عارف انکل تو یاد ہوں گے آپ کو، انہی کا بیٹا حمزہ ہے یہ"۔ اور پھر حریم نے تمام بات ان کے عارف انکل سے کیے گئے سلوک، ان کے گوش گزار کر دیئے۔ حریم کی بات پر شرمندہ ہونے کے بجائے فیاض احمد سیخ پا ہو گئے۔

"تو کیا کرتا میں، عارف کے چند پیسے اپنے کاروبار میں شامل کر کے اسے آدھا حصہ دے دیتا، تاکہ آگے چل کر وہ مفت میں آدھے کاروبار کا مالک بن بیٹھتا، اور میں نے تو زمین اور گھر نہیں بیچا تھا اس کا وہ خود عقل سے پیدل تھا۔ اپنے پیر پر کلہاڑی خود ماری اس نے"۔

"عقل سے پیدل نہیں اعتماد کر بیٹھے تھے عارف انکل آپ پر جو آپ نے لالچ میں آ کر بری طرح توڑ دیا تھا"۔ حریم ترشی سے بولی۔

"بند کرو اپنی یہ بکواس آج ان جیسے لوگوں کی خاطر تم اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑی ہو، اور یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے جو تم اسے یہاں اٹھا لائیں نکالو اسے باہر"۔ وہ دھاڑے۔

"اگر حمزہ یہاں سے جائے گا تو میں بھی جاؤں گی یہاں سے۔ حمزہ تو یتیم ہے مگر میں اپنے ماں باپ کے

ہوتے ہوئے یتیمی کی زندگی گزاروں گی"۔ حمزہ کو لئے حریم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، حریم کو شدید افسوس تھا اپنے باپ کی پست سوچ پر، دونوں باپ بیٹی میں سرد جنگ جاری تھی، فیاض احمد اپنی اکلوتی بیٹی کو گھر سے نکال نہیں سکتے تھے تبھی وہ خاموش ہو گئے۔ نائلہ بیگم کو بھی اپنے شوہر سے شکایت تھی کہ انہوں نے غلط کیا تھا، عارف کے ساتھ۔

حریم نے حمزہ کو اسکول داخل کروایا، اس کے لئے نئے کپڑے، یونیفارم، کتابیں لے آئی، پہلی دفعہ بیگ اور کتابوں کو دیکھ کر حمزہ کے سنجیدہ چہرے پر چمک اور خوشی نظر آئی، حریم مطمئن ہو گئی۔ وہ حمزہ کو کسی حد تک نارمل کر چکی تھی۔ جب سے ثمینہ آنٹی گزریں تھیں وہ بہت سہما ہوا تھا۔

ایک روز صبح وہ حمزہ کو اسکول کے لئے تیار کئے ڈائننگ ٹیبل پر آئی کافی دنوں بعد آج فیاض احمد وہاں موجود تھے۔ حریم کو دیکھ کر وہ اٹھنے لگے تبھی حریم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں روکا۔

"پلیز ابو مجھے معاف کر دیں میں معافی چاہتی ہوں اس دن کے رویئے پر"۔

"ابو پلیز! میری بات سن لیں۔ ایک بار آپ دل سے سوچیں آج حمزہ کو ہماری ضرورت ہے۔ وہ بے سہارا ہے ثمینہ آنٹی کی دکھ بھری ملتجی نگاہیں آج بھی مجھے یاد ہیں، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے میں حمزہ کو تنہا نہیں کروں گی"۔ کچھ دیر ٹھہر کے حریم نے فیاض احمد کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں شرمندگی کے ہلکے سے آثار نظر آئے۔ تبھی حریم کو ہمت ملی اور وہ بولی۔

"ابو! دنیا مکافات عمل ہے۔ یہاں ایک نہ ایک دن اپنے کیئے کی سزا مل ہی جاتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سزا کے لئے نہیں چنا بلکہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ حمزہ کی صورت"۔ وہ نرم پر اثر لہجے میں گویا ہوئی۔

"اگر اس وقت ہمیں بھی کاروبار میں نقصان ہو جاتا تو، کیونکہ آپ نے بھی اپنی تمام جمع پونجی اسی کاروبار کی نذر کر دی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اللہ تعالیٰ نے آپ کا ہاتھ تھاما۔ آپ کو بلندی عطا کی۔ ورنہ آج ہم بھی حمزہ کی جگہ ہوتے بے سروسامان"۔ فیاض احمد نے چونک کر حریم کو دیکھا۔ جو آج انہیں حقیقت سے آشنا کروا رہی تھی۔

"آج آپ حمزہ کا ہاتھ تھام لیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ حمزہ اور عارف انکل کی آہ، ہمیں نہ لے ڈوبے۔ ثمینہ آنٹی آخری وقت میں آپ کو پورے دل سے معاف کر چکی ہیں"۔ حریم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وہ ملتجی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔

کہتے ہیں ناں اللہ تعالیٰ اگر ایک در بند کرتا ہے، تو دوسرا در کھول دیتا ہے اللہ نے حمزہ کے لئے بھی دوسرا در کھول دیا تھا، حریم کی صورت میں اور اللہ نے فیاض احمد کا دل بھی پھیر دیا تھا، وہ کرسی دھکیل کر کھڑے ہو گئے اور چلتے ہوئے حمزہ کے پاس جا رکے، حمزہ کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"میں جانتا ہوں میں نے آخری وقت پر عارف کو دھوکا دیا لالچ میں آ کر جبکہ میں جانتا تھا، وہ اپنے گھر کی چھت بھی فروخت کر چکا ہے۔ میں شرمندہ ہوں، بیٹا تم سے مگر آج مجھے میری بیٹی نے احساس دلا دیا کہ جس حقیقت سے میں نظریں چرا رہا تھا، وہ کبھی چھپ نہیں سکتی۔ بہر حال آج سے میرے دو بچے ہوں گے ایک بیٹی اور ایک بیٹا"۔ وہ مسکرائے۔

"سچی ابو......؟" حریم کے لہجے سے سچی خوشی عیاں تھی آج اس نے اپنے وعدے کو نبھایا تھا، اور ایک مثال قائم کی تھی کہ اپنی غلطی کو ماننا اور اس کی تلافی کرنا بہت ضروری اور اہم ہے، وہ بھاگ کر فیاض احمد سے لپٹ گئی، اور حمزہ نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بازو پھیلائے اور فیاض احمد سے لپٹ گیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ پاس کھڑی نائلہ بیگم بھی مسکرا دیں، آج حمزہ کے روشن مستقبل کی تاریکی چھٹ گئی تھی۔

......☆......



عائشہ ذوالفقار

سلسلہ وار ناولٹ

اُڑ جا اب تیری باری ہے

24 سال اس کے دل نے صرف ایک ہی کام کیا۔ بلڈ ہمپ کرنے کا۔ 24 سال فزکس کی خشک ڈایا گرامز دیکھ دیکھ کے آنکھیں تنگ آگئیں مگر اس نے کوئی اور کام نہیں سونپا۔ وہ تو پیار کے اسپیلنگ بھی PIAR لکھتا تھا۔ 25 سال کسی سیپ میں محفوظ موتی کی طرح گزارے تھے اس نے مگر اب تھوڑا تو حق بنتا تھا ناں اس کا۔ کم از کم اتنا تو بنتا تھا کہ وہ پیار کے ٹھیک اسپیلنگ سیکھ سکے۔ دل کو کسی کے نام پر دھڑکنا سکھا سکے۔ آنکھوں کو کسی اور کے خواب دیکھنا سکھا سکے۔ بنتا تھا ناں۔

☆......☆

وہ پانی پینے نیچے آیا تو فیملی ابھی تک ٹی وی کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔

''بھائی! آپ ابھی تک سوئے نہیں؟'' نمرہ نے حیرانی سے پوچھا تھا۔



''نیند نہیں آرہی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مسئلہ کیا ہے بھئی، پہلے تو آٹھ بجے ہی تمہاری آنکھیں بند ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ اب دس بجے بھی نیند غائب ہے۔ اماں یہ کئی دنوں سے ایسا ہے اسے کچھ ہوا ہے؟'' ناعمہ تو ویسے ہی اس کی دشمن تھی۔ محض اسے گھورتا وہ اوپر آ گیا۔

''اسے کچھ ہوا ہے؟''

کیا ہوا تھا اسے، کچھ تو ہوا تھا جو وہ سونا بھول گیا تھا۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ اکیلا جیتے جیتے تنہا چلتے چلتے...... شروع سے ہی عادت تھی اسے اکیلا رہنے کی۔ ماں، باپ اور دو بہنوں کے باوجود وہ اپنی اس عادت کو چھوڑ نہ سکا۔ اپنے خول سے باہر نہ نکل سکا۔ اس کے بارے میں اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا تھا تو وہ سلمان تھا، بس بڑی صفائی سے اس نے اپنا ظاہر اور باطن الگ کر رکھا تھا۔ نہ خود کسی کی خوشیوں میں شریک ہوتا۔ نہ دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک ہونے دیتا۔ زندگی کے 24 سال ایسے ہی گزار دیئے، تنہا، اکیلے مگر آخر کب تک۔ آخر کب تک دل سینے میں بند رہتا۔ کب تک آنکھیں پلکوں میں چھپی رہتیں۔ قدم بھی اب شاید تھک گئے تھے۔ اسے کسی کا ہاتھ تھام لینے کو کہہ رہے تھے۔ کوئی ایسا جو ہمیشہ سنگ سنگ چلے، اس کے ہر دکھ، ہر سکھ کو سنگ سنگ

قسط نمبر3

چھپے۔ جو اس کی مضبوط پناہوں میں ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے، کبھی باہر نہ نکلنے کے لیے۔

☆......☆

اس دن عمیر کی پریزینٹیشن تھی۔ سب نے کوئی نہ کوئی کمنٹ دیا۔ حائقہ کچھ نہ بولی۔ عمیر خود اس کی طرف مڑا۔

''میم آئی وش کہ آپ بھی کچھ کہیں؟'' حائقہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

''میرا کہنا شاید آپ کو اچھا نہ لگے۔'' عمیر نے مسکراتے ہوئے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔

''مسٹر عمیر! کسی کو کاپی کرنا بری بات نہیں ہے مگر فل کاپی کرنا بری بات ہے۔ میں بھی سر شوکت کو کاپی کرتی ہوں مگر صرف ان کی اچھائیاں، برائیاں نہیں۔ آپ ان کی برائیاں بھی کاپی کرتے ہیں۔'' عمیر نے ضبط کرتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

''میں بھی پڑھانے کے بعد ٹاپک لکھتی ہوں۔ لیکن لکھ دیتی ہوں۔ بٹ سی آپ تو لکھ ہی نہیں پائے۔'' واقعی بورڈ پر عنوان نہیں تھا۔

''کہیں اور ہی پہنچ گئے آپ اور اس کی سب سے بڑی وجہ آپ کا اوور کانفیڈینس ہے۔'' عمیر کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکلنے لگے تھے۔

''آپ کے پاس بہت نالج ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن آپ ایک ہی لیکچر میں سارا نالج ڈلیور نہیں کر سکتے۔''

عمیر ہولے سے مسکرایا تھا۔ ''تنقید کرنا آسان ہے۔ سہنا مشکل۔''

حائقہ مسکرائی۔ ''آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟''

عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں میں آپ کو بتا رہا ہوں۔''

برداشت کی آخری حدوں کو چھوتا وہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے اپنی ہر بات کے جواب میں صرف ایک لفظ سنا تھا، ہاں۔ اپنی ہر خواہش کو پورا ہوتے دیکھا تھا۔ ہر زبان سے اپنے لیے صرف تعریف سنی تھی اور 24 سال بہت ہوتے ہیں تعریفوں کا عادی ہونے کے لیے۔ ہر بات کے جواب میں صرف ہاں سننے کا عادی ہونے کے لیے۔ وہ بھی عادی ہو چکا تھا تبھی تو جب پہلی بار حارث نے اس کی بات کے جواب میں ''ناں'' کہا تو وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی کڑوی باتیں سہہ نہیں سکا تھا۔ اس کے جوابی لفظ سن نہیں سکا تھا اور ہوا یہ کہ بجائے وہ اپنی اس عادت کو چھوڑنے کے حارث کے خلاف ہوتا چلا گیا۔ اسے کسی نہ کسی صورت اپنے سامنے جھکانے کے درپے ہو گیا اور حارث...... وہ حمزہ نہیں تھا جو اسے برداشت کر لیتا۔ وہ تو خود من موجی تھا۔ اپنے خول میں بند۔ اپنی مرضی سے جینے کا عادی۔ وہ کسی صورت اپنی انا میں عمیر کے ہاتھ میں نہ دے سکا۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہو سکا اور یہیں سے اس کے اور عمیر کے درمیان نفرت کی ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی۔ جسے دونوں میں سے کسی نے بھی ختم کرنے کی کوشش نہ کی اور اب حارث کے بعد...... حائقہ ارشد۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی اس کے آگے۔ بول رہی تھی اس کے آگے تنقید کر رہی تھی اس پر۔ وہ کیسے برداشت کر لیتا۔ حائقہ کی پریزینٹیشن پر وہ خود ہی بغیر کسی دعوت کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کی اسپیڈ بہت تیز ہے؟'' پہلا کمنٹ۔

''بالکل، کیونکہ میرا کام بچوں کو سمجھانا ہے۔ سلانا نہیں۔ یہ کام ان کی مدرز زیادہ بہتر طریقے سے کر لیتی

ہیں۔''

''آپ مشکل چیز کو آسان نہیں کرتیں۔'' دوسرا کمنٹ۔

''کیونکہ مشکل چیز کسی صورت آسان نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمیں آ جائے اور مشکل چیز آسانی سے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ مشکل سے ہی آتی ہے۔ اگر وہ آسان ہو سکتی تو مشکل طریقے سے نہ دی جاتی۔''

''آپ کی آواز تھوڑی آہستہ ہے۔'' تیسرا کمنٹ۔

''میرے ڈسپلن کے حساب سے میری آواز ٹھیک ہے۔ تیز آواز کانوں میں لگتی ہے۔'' عمیر ہولے سے مسکرایا تھا۔

''ویسے بھی آپ جہاں پڑھاتی ہیں وہاں ایک کلاس میں بمشکل 10,12 بچے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے حساب سے ٹھیک ہے۔'' حائقہ اس کا مطلب سمجھ گئی۔

''جب میں 400 بچوں کی کلاس لیتی تھی۔ تب بھی میری آواز اتنی ہی ہوتی تھی۔ مسٹر عمیر راؤ۔'' عمیر مسکرا کے رہ گیا۔

''اور ویسے بھی مجھے وہ 10-12 بچے ہی کافی ہیں کیونکہ وہ خالصتاً میرے ہیں۔ کسی کی پکی پکائی کھیر نہیں ہیں۔'' اب عمیر کو غصہ آیا۔

''پکی پکائی کھیر کھانا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے میم۔ بلکہ ایک دفعہ پکی پکائی مل جائے تو دوسری بار خود پکانے کا دل کر ہی جاتا ہے۔ پر آپ کیا جانیں۔ نہ تو یہ کبھی آپ کو ملی اور نہ آپ کے باس کو۔'' حائقہ کو پتنگے لگ گئے۔

''آپ کچھ نہیں جانتے مسٹر! نہ میرے بارے میں اور نہ میرے باس کے بارے میں۔'' عمیر کی مسکراہٹ اسے آگ لگا گئی۔

''آپ کے بارے میں نہ سہی مگر آپ کے باس کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اتنا شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔'' حائقہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی سر عمران نے دونوں کو خاموش کروا دیا۔ مگر بریک ٹائم میں عمیر اسے کہے بغیر رہ نہ سکا۔

''میم حائقہ! بے شک میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ بھی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ سو بنا جانے مجھے مت للکاریں، اچھا نہیں ہوگا۔'' حائقہ نے اس آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''کتنا اچھا نہیں ہوگا؟'' وہ بولی تھی۔

''حارث سے پوچھیے گا۔ وہ زیادہ بہتر طریقے سے بتا دے گا آپ کو۔'' حائقہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆......☆

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی وہ بھاگتی ہوئی 10th کلاس کی طرف بڑھی تھی۔ جب ایکدم حارث سامنے آیا۔ اس نے بمشکل خود کو بریک لگائے تھے۔

''شکر ہے بچت ہو گئی۔ آج گلاسز ہیں میرے، سوری۔'' مسکرا کے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی تو حارث نے پکار لیا۔

''آپ ہمیشہ اتنی جلدی میں کیوں ہوتی ہیں؟'' حائقہ مڑی تھی۔

''وہ ڈائیلاگ تو سنا ہوگا۔ آپ نے کہ لائف از آ ریس، تیز نہیں بھاگو گے تو کوئی تمہیں کچل دے گا، سو

بھاگنا ہی ٹھیک ہے۔" حارث ہولے سے ہنسا۔

"اور اگر اتنا تیز بھاگتے ہوئے گر گئیں تو......" اس نے پوچھا۔

"تو دوبارہ کھڑی ہو جاؤں گی۔" اس نے فوراً جواب دیا تھا۔

"لیکن اگر زیادہ چوٹ لگ گئی تو فوراً سے تو نہیں کھڑا ہوا جائے گا۔ تب کچلے جانے کے چانسز بڑھ جائیں گے ناں۔" حارث کی بات شاید درست تھی۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پیچھے سے آنے والے آپ کی چوٹ دیکھ کر آپ پر ترس کھالیں اور کچلے بنا ہی آگے بڑھ جائیں۔"

حارث پھر مسکرایا۔ "بڑی بھولی ہیں آپ۔ مر بھی رہے ہوں تو لوگ ترس نہیں کھاتے۔"

حائقہ جیسے ہار گئی۔ "اچھا ٹھیک ہے لوگ نہ سہی، آپ تو کھالیں گے ناں مجھ پر ترس کہ نہیں؟"

حارث جواباً کچھ نہ کہہ سکا۔

☆ ☆ ☆

"ہائے آئی! ایم عمیر راؤ۔" اس دن میری ٹریننگ کا فرسٹ ڈے تھا جب اس نے آکے اپنا تعارف کروایا۔ جس شخص کے بارے میں آپ نے بہت کچھ سنا ہوا اور وہ ایک دم سے یوں آپ کے سامنے آجائے تو حیرانی بھی ہوتی ہے۔ خوشی بھی ہوتی ہے اور اگر وہ شخص عمیر راؤ ہو تو عجیب سی چبھن بھی ہوتی ہے۔ پہلی ملاقات میں کافی میچور لگا وہ مجھے۔ شام تک ذہن سے نہ اتر سکا میں نے سوچا شاید پہلی بار ملی ہوں اس لیے ایسا ہو رہا ہے مگر دوسرا دن، تیسرا دن...... وہ تو چھانے لگا دماغ پر۔ کتنی بھی کوشش کرتی پر وہ دور ہوتا ہی نہ تھا اور اس دن مجھے پہلی بار اس پر غصہ آیا جس دن اس نے میرا باپ بننے کی کوشش کی۔ میں لاکھ تحمل مزاج سہی مگر اس قدر تنقید کی عادی نہیں تھی سو غصہ آگیا۔ اس کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شاید میں کچھ زیادہ بول گئی تھی۔ دل نے کہا کہ جا کے سوری کہوں، پھر دماغ نے اجازت نہ دی اور جس دن میری پریزینٹیشن تھی اس دن تو حد ہو گئی۔ تنقید پر تنقید...... کمنٹ پر کمنٹ...... میں نے بھی سارے ادب آداب ایک طرف رکھ دئے۔ خوب بحث کی اور تب اندازہ ہوا کہ مجھے اس سے بحث کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ حارث کے اس قدر خلاف کیوں تھا مگر مجھے یہ بھی نہ پتا چلا کہ وہ میرے خلاف بھی ہونے لگا تھا اور میں...... مجھے تو سمجھ ہی نہ آئی کہ ہوا کیا؟ پتا نہیں کب وہ دروازہ دل پر دستک دینے لگا اور دل نے دروازہ کھول بھی دیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر وہ اندر آگیا۔ میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ اسے دیکھنا اچھا لگنے لگا۔ اسے سننا اچھا لگنے لگا، اس سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا۔ غبار کی طرح میرے دماغ پر چھا گیا وہ، میں کسی سے کہہ بھی نہ سکی یہ ساری صورت حال بالکل نئی تھی میرے لیے ٹریننگ کے لاسٹ دن تو جیسے خود پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا۔ لاکھ میں نے آنکھوں پر پہرے بٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود...... ہال میں داخل ہوتے ہی آنکھیں پاگلوں کی طرح اسے کھوجنا شروع ہو گئیں۔ وہ اپنے گروپ کے ساتھ کھڑا تھا، گرے تھری پیس میں ملبوس قدم ضدی بچوں کی طرح اس کی طرف ہمکنے لگے میں اس سے چند قدم دور تھی جب اس نے مجھے دیکھا، ہلکی سی ستائش ابھری تھی اس کی آنکھوں میں (آنکھیں پڑھنا بھی آگیا تھا مجھے) ہٹاتے ہٹاتے بھی نظریں اس پر سے نہ ہٹیں، آخر تنگ آکر میں نے آنکھیں زور سے بند کیں اور کرسی پر گر گئی۔ دل میرے ساتھ ہی رویا تھا۔ مجھے اس دن کچھ اچھا نہ لگا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہ کیا۔ بس وہ...... صرف وہ...... میری آنکھیں جیسے میرے بس میں ہی نہ رہیں۔ جب موقع ملتا، اسے دیکھنے لگ جاتیں، فنکشن ختم ہوتے

ہوتے میری بس ہو گئی۔ دکھ کی انتہاؤں پر پہنچتے ہوئے میں بیگ اٹھا کے بیرونی دروازے کی طرف آئی تھی۔

ایک بار صرف ایک بار اور...... آنکھیں تڑپ تڑپ کے فریاد کرنے لگیں۔ میں جیسے ہی مڑی وہ ایکدم میرے سامنے آیا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی......!" میں بمشکل کہہ پائی۔

"میم! آئی وش کے آئندہ اگر ہماری ملاقات ہو تو اچھے موقع پر اچھے الفاظ کے ساتھ ہو۔ ورنہ نہ ہو۔" اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ میں نے جیسے اسے آنکھوں میں قید کیا تھا۔ وہ واپس مڑ گیا۔ میں پلٹ گئی۔ خود پر رکھا سارا قابو ختم ہو گیا۔ برستی آنکھوں کے ساتھ میں بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ چوبیس دنوں میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ میری دنیا بدل گئی تھی اور اسے پتا بھی نہ تھا۔

☆......☆

عارش کا فرسٹ ایئر کا رزلٹ بہت شاندار آیا۔ مجھے بے حد خوشی تھی۔ صرف عارش کی وجہ سے وزڈم اکیڈمی کو پوزیشن ملی تھی۔ پہلی دفعہ ان کا کوئی ٹاپر سامنے آیا تھا۔ حمزہ خود اس کا گفٹ لے کر گھر آیا مگر میں اس سے نہ ملی۔ میرا دل ویسے بھی ان دنوں عجب دکھی دکھی سا تھا۔ فرسٹ ایئر کے بعد حارث نے زور لگایا کہ میں عارش کو دی اسٹار لے کر آؤں مگر عارش نہ مانا، وہ وہیں مطمئن تھا۔ چند دن بعد حمزہ کی والدہ پھر آئیں وہ منگنی پر اصرار کر رہی تھیں۔

"صرف منگنی کر لیتے ہیں اس کے بعد چاہے جتنا مرضی وقت لے لیں۔" اماں نے سوچنے کے لیے وقت لیا اور شام کو مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہی لمبی سی تقریر اچھے رشتوں کی کمی کا رونا، پھر اپنے حالات کا رونا۔ پھر حمزہ کی اچھائیاں...... میں چپ چاپ سنتی رہی۔

"کیا کہتی ہو پھر؟" آخر میں رسمی طور پر مجھ سے پوچھا۔

"جیسے آپ بہتر سمجھیں مگر جب تک عارش کا ایڈمیشن نہیں ہو جاتا۔ تب تک میں نے شادی نہیں کروانی۔" کہہ کہ میں اپنے کمرے میں آگئی۔ دل بہت ہی رو رہا تھا۔ ایسے تھوڑی نہ ہونا چاہیے۔ جب کوئی ہماری قسمت میں لکھا ہی نہیں ہوتا تو لائف میں کیوں آتا ہے؟ اتنا اچھا کیوں لگتا ہے۔ سیدھا دل میں کیوں اترتا ہے۔ کیوں؟ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلے تھے ابھی تو اصلی والا پیار کرنا شروع بھی نہیں کیا تھا ابھی تو بس پہلی نظر کا پیار ہوا تھا، وہ جس کے بعد بار بار دیکھنے کو دل کرتا ہے، ہر لحہ سننے کو دل کرتا ہے، وہ جو بے تاب کر رہا ہے، ابھی تو دل نے ٹھیک سے دھڑکنا بھی نہیں سیکھا تھا، ابھی تو آنکھوں نے سپنے دیکھنے شروع بھی نہیں کیئے تھے کہ سب ختم بھی ہو گیا، ایسے ہوتا ہے کیا؟ ایسے تو نہیں ہونا چاہیے، اس رات شائد میں عمیر کے پیار میں آخری بار روئی اور اسے دل کے کسی مخفی کونے میں دفن کر دیا۔

☆......☆

"مبارک ہو حائقہ، آپ کی کلاس میں آج دو بچوں کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔" وہ فرسٹ ایئر سے نکلی تو حارث سامنے سے آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کہ بول پڑا۔

"پہلے تو کبھی مبارکباد نہیں دی آپ نے نئے بچوں کے آنے پر، یہ کوئی خاص بچے ہیں کیا؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"یونہی سمجھ لیں، کیونکہ یہ رائل سے آئے ہیں۔" حائقہ ایک لمحے کو چپ ہوگئی۔

"آج پہلی دفعہ رائل کا کوئی بچہ یہاں آیا ہے۔" حائقہ کو حارث کی آنکھوں میں خوشی کے علاوہ بہت کچھ نظر آیا۔

"رائل سے کیا پرابلم ہے آپ کو حارث؟" آج اس نے پوچھ ہی لیا۔

"مجھے رائل سے کوئی پرابلم نہیں ہے اور جس سے ہے اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا میں۔" وہ کہہ کہ آگے بڑھنے لگا تھا۔

"عمیر راؤ سے ہے؟" حارث ایک دم رک گیا۔

"آپ کو کس نے کہا؟" حائقہ ہولے سے مسکرائی۔

"کسی نے نہیں اور کسی کے کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، لہجے سمجھنے آتے ہیں مجھے۔" حارث بول نہ سکا۔

"آپ کا نام لیتے ہوئے جو نفرت اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی، میں نے وہ آپ کی آنکھوں میں بھی نظر آرہی ہے۔" حائقہ بولی۔

"اس نے کچھ کہا ہے آپ سے؟" حارث نے پوچھا تھا۔

"فی الحال تو اپنے رستے میں آنے سے منع کیا ہے۔" حارث کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔

"اسے بس یہ ہی کام تو ڈھنگ سے آتا ہے۔ کہنا اور منوانا، ماننا نہیں آتا۔" حارث کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ حائقہ اس قدر نفرت کی وجہ سمجھ نہ سکی۔ وہاں سے نکل کے وہ سیدھا رائل اکیڈمی آیا تھا۔

"عمیر کو بلا دیں۔" اس نے اسٹاف روم میں بیٹھتے ہوئے چپڑاسی سے کہا۔ چند منٹ بعد عمیر کی آواز

"تم......" پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کب سے ہمت آگئی یہاں قدم رکھنے کی۔" عمیر آگے آیا تھا۔

"میں تو صرف تمہاری طبیعت پوچھنے آیا تھا۔ دیٹس اٹ۔" کہتے ہوئے حارث نے Get well soon کا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

"تمہیں شاید ابھی خبر نہ ہو بس بتا دیتا ہوں تمہاری اکیڈمی سے دو اسٹوڈنٹس آج میرے پاس آئے ہیں، وجہ سر عمیر کی سمجھ نہیں آتی۔" حارث کی مسکراہٹ اور باتیں اسے سر تا پا سلگا گئیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ دو اسٹوڈنٹس کے چلے جانے سے مجھے فرق پڑے گا۔" حارث اس کے سامنے آیا۔

"بالکل پڑے گا کیونکہ جب ایک انگلی میں درد ہوتا ہے تو پورے جسم کو فرق پڑتا ہے۔" عمیر غصے کے مارے بول نہ سکا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔ کیونکہ تم نے تو یہ درد آج سہا ہے ناں میں پچھلے تین سال سے سہہ رہا ہوں۔ ایسے ہی کارڈ بھیجتے تھے ناں تم جب ایک بھی اسٹوڈنٹ میری اکیڈمی چھوڑ کر تمہاری طرف آتا تھا۔ میری دراز بھری ہوئی ہے ان Get well soon کے کارڈز سے۔" حارث کی آواز اونچی ہوگئی۔

"بٹ ڈونٹ وری، تھوڑا وقت لگتا ہے مگر پھر عادت ہو جاتی ہے، تمہیں بھی ہو جائے گی۔" حارث کہتے ہوئے اس کے پاس سے گزر کے باہر کی طرف مڑا تھا، جب عمیر کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"بہتر ہوگا تم اسے سمجھا دو، ورنہ میرے سمجھانے کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔" حارث نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم کہو گے اور میں اسے سمجھا دوں گا، تو عمیر راؤ! میں نے تمہاری باتیں ہی مانی ہوتیں تو

میرے اور تمہارے درمیان 24 سالوں کی دشمنی نہ ہوتی۔" کہتے ہوئے وہ ذرا سا رکا تھا۔

"اور ایک بات اور اسے سمجھانے جس بھی رستے سے آؤ گے ناں پہلے میں ہی ملوں گا۔" حارث کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ غصے سے عمیر کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میز پر پڑا کارڈ اس نے پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔

"اچھا نہیں کر رہے تم......" دونوں بازو میز پر ٹکاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

☆......☆

وہ اس دن کلاس لے کر اسٹاف روم میں آیا تو حائقہ پہلے سے بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

"کیا پڑھاتے رہتے ہیں آپ اتنی دیر مجھ سے تو بمشکل 20 منٹ ہی پڑھایا جاتا ہے۔" وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"بس جی آپ تو پھر آپ ہیں ناں اب میں آپ جیسا تو نہیں بن سکتا ناں۔" حائقہ اس کی بات پر دل کھول کر ہنسی اور دوبارہ چائے کے سپ لینے لگی۔ حارث نے یونہی اس کی طرف دیکھا اور پھر کافی دیر تک نظریں نہ ہٹا سکا۔ کیا تھا اس میں۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ یا شاید بہت کچھ سب کچھ بڑے حق سے اس کے دل میں اتری تھی وہ، اتراتے ہوئے مسکراتے ہوئے اور وہ بس دیکھتا رہ گیا تھا۔ کئی سالوں سے اس کے سینے میں مقید دل کو ایک لمحے میں چرا لیا تھا اس نے اور وہ بس حیرانی سے اسے تکتا رہ گیا تھا۔ اب بھی حائقہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے کچھ پوچھا مگر وہ اس قدر مگن تھا کہ سن نہ سکا۔ دوسری بار کہنے کے بعد حائقہ نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ ایکدم ہوش کی دنیا میں واپس آیا تھا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔" حائقہ تیز لہجے میں بولی تھی۔

"جی...... کیا......؟" حارث کے یوں پوچھنے پر وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"آپ کے ساتھ کوئی پرابلم ہے کیا ان دنوں؟" اس کے پوچھنے پر حارث گڑبڑا گیا۔

"نہیں تو...... کیوں؟" حائقہ آگے کو ہوئی اور بولی۔

"بڑے عجیب سے ہو گئے ہیں آپ ان دنوں، کھوئے کھوئے ایسا لگتا ہے جیسے بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ جاتے ہیں آپ، جیسے ابھی پہنچ گئے تھے۔"

حارث بول نہ سکا۔

"کوئی پرابلم ہے تو شیئر کرلیں، مجھ سے نہ سہی سلمان صاحب سے ہی کرلیں، وہ تو دوست ہیں آپ کے۔" اسے کہتے ہوئے وہ پوائنٹر اٹھا کے باہر نکل گئی۔ حارث نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبا سانس لیا۔

"تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا۔ حارث جاوید......!" اس نے جیسے خود سے کہا۔

"اب تو ملکۂ دل بھی حال دل جاننے لگی ہے۔ کنٹرول حارث کنٹرول......" لیکن خود کو تو شاید وہ کنٹرول کر ہی لیتا مگر دل اور آنکھوں کو کیسے کنٹرول کرتا جو اسے دیکھتے ہی پاگل ہو جاتے تھے۔ اس کی یہ حالت سلمان سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور ایک دن اس نے حارث کو گھیر ہی لیا۔

"جو کرنا ہے ناں کھل کے کرلے، یوں چھپ چھپ کر کرنا زیادہ برا لگتا ہے تو۔" حارث جھینپ گیا۔

"میں نے کیا کیا۔" بولا تو آواز دھیمی تھی۔

"نہیں کیا تو کرے گا، تو نے کون سا رک جانا ہے۔" سلمان ہنسا تھا۔ حارث بھی مسکرا دیا۔

"یہ ہی ہے ناں؟" سلمان نے برآمدے میں ٹیسٹ لیتی حائقہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہے ناں۔'' حارث نے جواباً پوچھا۔

''یہ تو ٹھیک ہے پر تو خود کو بھی ٹھیک رکھ، جہاں دیکھتا ہے آنکھیں پھاڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے، بیٹے ایسے ہی رہا ناں تو چند دن لحاظ کرنے کے بعد تجھے خود ٹھیک کر دے گی۔'' حارث نے ہنستے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

''کیا کروں میں یار؟ اب عادت تھوڑی ناں ہے روز روز پیار کرنے کی جو پتا ہو کہ کیسے کرتے ہیں، پہلی بار ہے ہوتے ہوتے ہی آئے گا۔'' سلمان آگے کو ہوا تھا۔

''پہلی بار...... تو علیزہ سے کیا ہوا تھا۔'' حارث چند لمحے بول نہ سکا۔ پھر ایک لمبا سانس بھر کے سلمان کی طرف مڑا۔

''سلمان اس رات بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے، میں اس کے پیار میں عمیر سے نہیں لڑا تھا۔ اپنی نفرت میں لڑا تھا۔ صرف عمیر کو سبق سکھانے کے لیے میں اس کے قریب گیا تھا مجھے اگر اس سے پیار ہوتا تو آج وہ میرے دل میں زندہ ہوتی۔'' وہ کہتے ہوئے ذرا سا رکا۔

''اب کہاں جا رہا ہے۔'' سلمان بولا تھا۔ ''وہ گھورنا شروع ہو گئی ہے۔ چند لمحے اور یہاں رکا تو بہت کچھ سنا دے گی۔'' حارث ہنستے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆

اس دن رائل اکیڈمی میں پوزیشن ہولڈرز کے لیے فنکشن تھا۔ حارث نے تو جانا ہی نہ تھا سو سلمان اکیلا ہی گیا۔ حمزہ بھی آیا ہوا تھا۔ عمیر کچھ نہ کہتے کہتے بھی سلمان سے کہہ ہی گیا۔

''اور سناؤ تمہاری وہ فزکس جیٹ کیسی ہے؟'' بہت کچھ تھا اس کے لہجے میں جو سلمان جیسا بندہ بھی محسوس کر گیا۔

''تمہاری دعاؤں سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' عمیر مسکرایا تھا۔

''ایک مشورہ دوں؟'' سلمان نے اس سے کہا۔ عمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شادی کر لو شاید تمہاری باتوں میں ذرا نرمی آجائے۔'' عمیر نے ہولے سے مسکرا کے اسے دیکھا۔

''یہ مشورہ تم اپنے دوست کو بھی دینا، اس کی باتیں بھی کوئی ریشم کے دھاگے نہیں ہوتیں۔'' عمیر کا لہجہ نرم نہ ہو سکا۔

''اس کی شادی کا کارڈ تو بہت جلد مل جائے گا تمہیں موصوف آج کل پیار کے مزے لے رہے ہیں۔'' حارث کا ذکر ہی عمیر کو تلخ کر دیتا تھا۔

''ظاہر ہے علیزہ سے پیار اس نے تھوڑی کیا تھا، میں نے کیا تھا، میرا پیار برباد کرنے کے بعد اب اس نے مزے ہی اڑانے ہیں اور آتا ہی کیا ہے اسے سوائے گھٹیا پن کے۔'' عمیر کی آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔

''ویسے کس کی قسمت پھوڑ رہا ہے۔'' سلمان اس کے لہجے پر ہنس دیا۔

''اپنی فزکس جیٹ کی۔'' سلمان کی بات پر وہ کافی دیر تک بول نہ سکا۔ انتہائی برا لگا تھا اسے یہ خبر سن کر۔

''کیا حال ہے سلمان؟'' حمزہ آیا تو سلمان اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عمیر کا دل یکدم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ دھیرے سے اس کے لبوں سے سرگوشی نکلی تھی۔

''حارث جاوید......'' اس کا بدترین دشمن اس کے لیے نفرت کا دوسرا نام اس کے پیار کا غاصب، وہ حارث

کے لیے اپنی پوری زندگی نہ تو اچھا سوچ سکتا تھا نہ بن سکتا تھا۔ نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کے حق میں اچھا ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ علیزہ کے جانے کے بعد تو وہ اسے زہر کی طرح برا لگنے لگا تھا اور دوسری طرف......

''حائقہ......!'' اس کے لبوں سے دوسری سرگوشی نکلی۔

''حائقہ ارشد۔'' وہ پہلے دن سے اسے تکلیف دے رہی تھی۔ اس کی راہ کی رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس کی بادشاہت میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہی تھی۔ اس سے اس کی شہرت چھین رہی تھی۔

''اگر یہ دونوں ایک ہو گئے تو......؟'' اس کے ذہن نے سوال اٹھایا تھا۔

''تو جو ہو گا اچھا نہیں ہو گا، ابھی تو صرف دو اسٹوڈنٹس حارث کی طرف گئے ہیں پھر مزید جانا شروع ہو جائیں گے۔ ابھی تو صرف ایک کارڈ آیا تھا گیٹ ویل سون کا، پھر رفتہ رفتہ اس کی دراز بھی بھر جائے گی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ چھین لے گی وہ......'' آنے والا وقت اسے خوب ڈرا رہا تھا۔

''نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' عمیر کے ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

''میں اس بار حارث کو کچھ چھیننے نہیں دوں گا بلکہ......'' علیزہ کا چہرہ اس کی نظروں میں آگیا۔

''بلکہ اس بار میں اس کا پیار چھینوں گا۔ جو درد تین سال پہلے اس نے مجھے دیا تھا اس بار میں اسے دوں گا اور حائقہ۔'' اس کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

''بس بہت ہو گیا۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں ہے مجھ میں سوری۔'' کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا کچھ اور ہی ہو گیا۔

☆......☆

بائیک ایک طرف کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا۔ ہر کلاس سے پڑھانے کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ کچھ سوچ کر اس نے حارث کا نمبر ملایا اور سیل کان سے لگاتا دروازے کی طرف آگیا۔ ابھی پہلی بیل ہی گئی تھی کہ کوئی پیچھے سے اس سے ٹکرا گیا۔ کال ڈس کنیکٹ کرتا وہ ہڑبڑا کے پیچھے مڑا تھا۔

''اوہو، یہ کوئی جگہ ہے کھڑے ہو کے فون کرنے کی۔'' پھسل کے ناک پر آیا چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے حائقہ نے اسے لتاڑا۔

''سوری......سوری......'' وہ کہہ نہ سکا کہ پیچھے سے تو آپ آئی ہیں۔ وہ گزر کے آگے جانے لگی تو پھر بول پڑا۔

''آپ حائقہ ارشد ہیں؟'' حائقہ ایکدم مڑی تھی۔

''جی فرمائیں۔'' وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔ وہ بھی ہولے سے مسکرا دیا اور بولا۔

''حمزہ مغل۔'' شرم اور شرمندگی نے ایک ساتھ حملہ آور ہو کے اسے کچھ بولنے نہ دیا حمزہ نے یہ منظر کھل کے انجوائے کیا تھا۔

''تو دیکھ لیا؟'' اس نے پوچھا۔

''مطلب؟'' حمزہ حیران ہوا۔

''مطلب مجھے ہی دیکھنے آئے تھے ناں تو دیکھ لیا۔'' اب کے حمزہ کھل کے ہنسا تھا۔ حائقہ بھی مسکرا دی۔ تبھی حارث اندر داخل ہوا۔ حائقہ یونہی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''تم یہاں...... خیریت!'' حارث نے اس سے گلے ملتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں کچھ دیکھنے آیا تھا۔" وہ بولا حارث اسے اسٹاف روم میں لے آیا۔ سلمان بھی وہیں تھا۔
"کیا دیکھنے آئے تھے؟" حارث کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
"تم لوگوں کی ملکہ فزکس کو۔" حارث ایک دم آگے کو ہوا۔
"کیوں خیریت؟" حمزہ مسکرایا۔
"آئی ایم گوئنگ ٹو بی انگیجڈ ود ہر (میری اس سے منگنی ہونے والی ہے)" حارث کا چہرہ یکدم دھواں دھواں ہوا تھا۔ سلمان بھی چپ رہ گیا۔
"تصویر دیکھنے سے بہتر یہ لگا کہ ڈائریکٹ ہی دیکھ آؤں سو......" حمزہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ حارث اسے دوبارہ دیکھ بھی نہ سکا۔
"میں آتا ہوں ابھی۔" چند لمحوں بعد وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ حمزہ کچھ دیر سلمان سے باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔ سلمان اوپر آیا تو وہ ریلنگ پر دونوں بازو لگائے کھڑا تھا۔ سلمان اس کے برابر آ کے کھڑا ہو گیا۔
"میں ٹھیک کہتا تھا ناں سلمان کہ میری قسمت میں صرف کوشش کرنا لکھا ہے۔ کسی بھی چیز کا حاصل ہونا نہیں لکھا۔ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود بابا کا پیار نہیں مل سکا۔ آج تک ان کے گلے لگنے کے لیے ترستا ہوں میں، کوشش کے باوجود اپنی پوری اکیڈمک لائف میں ایک بار بھی پوزیشن نہ لے سکا، تین سال سے بھرپور کوشش کے باوجود اپنی اکیڈمی میں 100 بچے بھی پورے نہیں کر سکا، تین سالوں میں اسے ایک بھی پوزیشن نہیں دلوا سکا اور اب......" سلمان کو لگا اس کی آواز بھرا رہی تھی۔
"اور اب حائقہ پیار کرنے کی کوشش تو بہت کی مگر......" اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا۔
"پہلی بار کوئی اتنا اچھا لگا تھا یار! وہ پاس نہیں بھی ہوتی تھی تو پاس ہی لگتی تھی، پتا نہیں میرے اندر کہاں کہاں اتر گئی ہے وہ۔" سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"حارث یار! حمزہ سے بات کر لیتے ہیں۔ اسے کون سا تیری طرح پیار ہوا ہے بھلا۔" حارث نے ایک دم اس کی بات کاٹی۔
"پاگل ہو گیا ہے کیا...... آنکھیں دیکھی تھیں اس کی جب بتا رہا تھا ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رنگ برنگ ہوا پڑا تھا اس کا چہرہ، لبوں پہ مسکراہٹ دیکھی تھی اس کے ایویں نہیں تھی وہ یہاں کا موسم بدلتا ہے تو ہی ایسی مسکراہٹ پھیلتی ہے ہونٹوں پر، سارا پتا ہے مجھے۔" حارث دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"تو پھر اب کیا کرے گا۔" سلمان نے پوچھا۔
"وہی جو ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ جو ہر کوشش کے باوجود میری قسمت میں لکھا ہے صبر......" حارث آنکھوں کے گوشوں میں آیا پانی انگلی کی پور سے جھٹکتے ہوئے بولا تھا۔ "اور ویسے بھی تنگ آ گیا ہوں میں یہ زبردستی چھیننے کا کام کر کر کے پہلے عمیر سے چھینا اب حمزہ سے چھین لوں، نو نیور۔" وہ کہتے ہوئے نیچے جانے کی طرف بڑھا۔ آج شاید پہلی بار اس نے تسلیم کیا تھا کہ واقعی اس نے عمیر سے علیزہ کو چھینا تھا زبردستی وہ سیڑھیوں کے قریب تھا جب سلمان کی آواز نے اسے روک دیا۔
"آج حمزہ کی جگہ عمیر ہوتا تو کیا پھر بھی تو یونہی کرتا؟" حارث اپنی جگہ تھم سا گیا۔
"نہیں ناں! تب تو جاگ جاتی تھی تیرے اندر وہ مشہور زمانہ نفرت، تب تو تجھے عمیر کو قتل کر کے بھی حائقہ کو چھیننا پڑتا تو تو چھین لیتا، ہے ناں۔" حارث نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں مگر آج حمزہ کی جگہ عمیر نہیں ہے۔" کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر گیا۔ ایک ہفتے بعد دونوں کی منگنی ہو گئی۔ حارث ٹھیک طرح سے ماتم بھی نہ کر سکا۔ سلمان اسے بمشکل کھینچ کھانچ کے تقریب میں لے کر آیا تھا۔ حمزہ کی آنکھوں سے چھلکتی وارفتگیاں......اور حائقہ کے لبوں پر پھیلتی شرمیلی مسکراہٹ وہ سو سو بار مر رہا تھا اور سو سو بار جی رہا تھا۔
"بہت مبارک ہو۔" اپنے اندر کے ہر طوفان کو ایک سادہ سی مسکراہٹ میں چھپا کے اس نے حمزہ کو گلے لگایا تھا۔
"آپ کو بھی۔" حائقہ کو کہتے ہوئے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا مگر یہ بھی تو اس کا فن تھا اندر چاہے آگ لگی ہوتی، باہر سے پانی کی طرح پرسکون نظر آتا تھا (سوائے عمیر کے) اب بھی اس نے اپنے دل میں موجزن بے تحاشا چاہت کو آنکھوں سے چھلکنے ہی نہ دیا۔ پلکوں کے پیچھے ہی کہیں مقید کر لیا پتھر کی طرح سخت ہو گیا اتنا کے رات کا اندھیرا اور حائقہ کی بے پناہ یادیں بھی نہ پگھلا سکیں۔ سرد رات کے کاندھے پر سر رکھ کے ایک آنسو بھی نہ بہایا اس نے سب کچھ اندر ہی بند کر لیا۔ عمیر ان دنوں لاہور گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹس سے پہلی خبر یہ ہی ملی۔
"سر! آپ کو پتا ہے سر حمزہ کی منگنی ہو گئی ہے۔" عمیر کے لیے خبر نئی تھی۔
"اچھا......! واؤ......" اسے خوشی ہوئی۔
"سر گیس کریں کہ کس سے ہوئی؟" اسٹوڈنٹس سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔
"کس سے ہوئی ہے بھئی۔" عمیر مسکرایا تھا۔
"میم حائقہ سے؟" عمیر کا ایک دم سے منہ کھل گیا۔ چند لمحے بول نہ سکا۔ پھر ہولے سے ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔
"کاش میں تمہارا چہرہ دیکھ سکتا حارث جاوید کاش......" اس کی ہنسی ہی بند نہ ہو رہی تھی۔

☆......☆

آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس دن حارث سے ملنے آ ہی گیا۔ سلمان اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ کیوں آیا ہے؟
"عمیر خدا کا نام ہے یار! وہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کے زخموں پر مزید نمک نہ چھڑک پلیز۔" عمیر اس کی بات سن کے مسکرا دیا۔
"سوری یار! مجھے موقع گنوانا نہیں آتا۔" کہتے ہوئے وہ اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا حارث وہیں تھا اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"میں نے سوچا اس بار صرف کارڈ سے کام نہیں چلے گا سو خود ہی آ گیا۔ کیسی طبیعت ہے اب؟" عمیر کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ نشتر تھے جو حارث کے آر پار ہو گئے۔
"تمہیں لگتا ہے میں تمہیں اپنی طبیعت بتاؤں گا۔" حارث سرد لہجے میں بولا۔
"نہ بتاؤ، وہ تو تمہیں دیکھ کے ہی پتا چل گئی۔" حارث بول نہ سکا۔
"ویسے تقدیر نے پہلی بار میرا یوں ساتھ دیا ہے ابھی تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچنے سے پہلے ہی حمزہ نے کر دیا۔ واقعی دوست ہو تو حمزہ جیسا۔" حارث ایک دم آگے کو آیا۔
"صرف دل ٹوٹا ہے۔ مر نہیں گیا ہوں جو اتنا خوش ہو رہے ہو۔" عمیر چپ رہا۔

"اور اگر میں مر بھی گیا ناں تو بھی تم خوشیاں نہیں منا سکو گے کیوں کہ تمہیں مار کے ہی مروں گا۔" عمیر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے پھر مار کے دکھاؤ۔" مسکرا کے کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا حارث ٹیبل پر ہاتھ مار کے رہ گیا۔

☆......☆

آخر عمیر کو دل کے کسی گمنام گوشے میں دفن کر کے میں نے حمزہ سے منگنی کر لی۔ شادی عارش کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے بعد ہونا تھی مگر حمزہ منگنی کے بعد ایک ماہ بھی صبر نہ کر سکا۔

"ایک ریکوئسٹ کروں تم سے مانو گی؟" اس رات فون پر بولا تھا۔

"بولیں۔ ماننے والی ہوئی تو مانوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"شادی کر لو پلیز۔" میں اس کی بات پر ایک دم خاموش ہوئی تھی۔

"پلیز یار! تھوڑا سا تو ترس کھا لو۔" حمزہ کا لہجہ ہی فقیروں جیسا ہو گیا۔

"جب تک تم نہیں تھیں تو نہیں تھیں بٹ اب نہیں رہا جاتا اکیلے مجھ سے تم جو چاہے کرنا، جیسے چاہے کرنا اگر مگر بھی نہیں کروں گا تمہارے کسی معاملے میں پرامس لیکن میری یہ آزمائش ختم کر دو پلیز کہ تم میری ہو مگر پھر بھی میری نہیں ہو۔" مجھے اس کی تقریر پر ہنسی آ گئی۔

"جتنا مرضی ہنس لو مگر مان جاؤ پلیز۔" اور حمزہ کے تقاضے دن بدن بڑھتے گئے۔ اس کی والدہ کے آئے روز چکر لگنا شروع ہو گئے۔ عارش کا ایف ایس سی کا رزلٹ آنے میں ابھی چار ماہ تھے اور پھر ایڈمیشن ہوتے ہوتے دو تین ماہ اور لگ جاتے۔ حمزہ تو اب ایک پل کے لیے بھی اکیلا رہنے کو تیار نہیں تھا۔ آخر کار اس کی محنت رنگ لے آئی۔ اگست میں شادی فکس ہو گئی۔ حمزہ کے بقول یہ بھی اس پر ظلم ہی تھا۔ تیاریاں ہوتے ہوتے پتا بھی نہ چلا اور اگست آ گیا۔ میرے نکاح سے ایک ہفتہ پہلے میٹرک کا رزلٹ آیا۔ میں اماں کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھی جب حارث کا فون آیا۔

"جلدی اکیڈمی آئیں، جلدی۔" میں ہیلو...... ہیلو کرتی رہ گئی مگر اس نے کال کاٹ دی۔ 10 منٹ میں، میں اکیڈمی پہنچی تھی۔ حارث نے مٹھائی کی پلیٹ میرے آگے کی۔

"کیا ہوا ہے۔" میں اب تک حیران تھی۔

"اس بار میٹرک کا ٹاپر ہماری اکیڈمی کا ہے۔" میں حیران رہ گئی۔ حارث کی خوشی اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

"حائقہ جب سے یہ اکیڈمی ٹوٹی تھی تب سے لے کر آج تک اس کی کوئی ایک پوزیشن بھی نہیں آئی۔ پانچ سال بعد آج پہلی بار یہاں سے کسی نے ٹاپ کیا ہے۔ آج مجھے میری کوششوں کا صلہ ملا ہے اور اس میں بہت بڑا حصہ آپ کا ہے۔" حائقہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ ٹاپ اس بچے نے کیا تھا جو رائل سے یہاں آیا تھا اور رزلٹ کے صرف دو دن بعد رائل سے 16 بچے ہماری اکیڈمی میں آ گئے۔

☆......☆

"سر جی! آپ کے لیے ایک ڈبہ آیا ہے، میں نے اسٹاف روم میں رکھوا دیا ہے۔" چپراسی نے اسے کلاس سے نکلتے دیکھ کر اطلاع دی وہ سیدھا اسٹاف روم آیا۔ ڈبہ بند تھا اس نے کھولا اور Get well soon کے سولہ کارڈز اور ساتھ مٹھائی کا ڈبہ جس میں اینٹی ڈپریشن گولیاں بھی تھیں۔ وہ کھول گیا۔ تبھی اسے حارث کی کال آئی۔

غصے کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں خود کیوں نہیں آیا۔ ہے ناں؟ تو کچھ ایسا ہے عمیر راؤ کہ انسان پر اتنا بوجھ ڈالنا چاہیے جتنا وہ برداشت کر سکے۔ تمہاری اوقات بھی بس اتنے کی ہے جتنا میں نے ڈالا ہے اس سے زیادہ پر تمہیں ویسے ہی کچھ ہو جانا تھا۔" حارث کی آواز اسے آگ لگا گئی۔ غصہ اتنا شدید تھا کہ اس سے بولا ہی نہ گیا۔

"مجھے پتا ہے مٹھائی تو تم کھاؤ گے نہیں مگر یہ ٹیبلٹ ضرور کھا لینا جانی! کیونکہ یہ تو بس شروعات ہے ابھی تو تمہیں بہت کچھ سہنا ہے۔ برداشت کرنا ہے سو......" حارث ہنستے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کرنے لگا تھا مگر پھر فوراً بولا۔

"اور سنو! وہ بے شک میرے دل سے چلی گئی ہے مگر میری اکیڈمی سے نہیں گئی اور تم جانتے ہو کہ وہ میرے دل میں رہے یا نہ رہے اس سے تمہیں فرق نہیں پڑتا، لیکن اس کے میرے اکیڈمی میں رہنے سے تمہیں فرق پڑتا ہے اور میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔" حارث کی ہنسی اسے تپائے جا رہی تھی۔

"جیت کوئی چیز نہیں ہوتی عمیر، چانس ہوتی ہے۔ کبھی تمہارے پاس کبھی میرے پاس۔" حارث نے کال ڈس کنیکٹ کی تھی۔ عمیر کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا موبائل اس نے پوری قوت سے سامنے دیوار میں دے کر مارا، پھر ہاتھ مار کے میز پر سے ڈبہ اور کارڈز ادھر ادھر گرائے اور خود دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کے جھکا آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے میز پر رکھے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

"بس بہت ہو گیا۔" اس نے خود سے کہا تھا۔ اس کا خدشہ بالکل درست تھا۔ کل صرف دو اسٹوڈنٹس اس کی اکیڈمی چھوڑ کر گئے تھے۔ آج 16 چلے گئے تھے اور آنے والے کل میں شاید پوری اکیڈمی ہی خالی ہو جاتی۔ آج ان کی ایک پوزیشن آئی تھی۔ کل شاید ایک سے زیادہ آ جاتیں۔

"نہیں حارث! اب بہت ہو گیا۔ ٹھیک کہا تم نے کہ انسان پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے اور میں...... واقعی میری اوقات تو اس کو سہنے کی بھی نہیں ہے۔" اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا تھا۔

"اور اب میں سہوں گا بھی نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے وہ درد سہنے کی جو تم تین سال سے سہہ رہے ہو مجھے تمہاری طرح اپنی درازیں ان کارڈز سے نہیں بھرنی، پہلے بھی جب تم اپنی اوقات سے باہر ہوتے تھے تو میں ہی تمہیں واپس لاتا تھا۔ اب بھی میں ہی لاؤں گا۔" اس کے ہونٹ بھی کانپنے لگے تھے۔

"رہ گئی حائقہ، تو بہت اڑ لیا اس نے بہت من مانیاں کر لیں، بہت جشن منا لیا اپنے عروج کا، اب میں اس کا زوال بنوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا تمہیں حائقہ ارشد......" آج اسے پہلی بار حائقہ سے حارث جیسی نفرت محسوس ہوئی تھی۔

"بہت اچھا ہوا جو تم حمزہ کی ہو گئیں۔ کیونکہ حارث سے شاید مجھے زیادہ لڑنا پڑتا۔" وہ ایکدم کرسی پر بیٹھا تھا۔

"تم نے غلط کہا حارث! جیت موقع نہیں ہوتی، چیز ہوتی ہے، جو ہمیشہ سے میری تھی اور مرتے دم تک میری ہی رہے گی۔ نہ یہ تمہاری تھی اور نہ ہی میں ہونے دوں گا۔" کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔

☆......☆

"حاری! تیرا فون بج رہا ہے۔" میں چھت پر تھی جب اماں نے نیچے سے آواز لگائی۔ ظہر کی اذانیں شروع

ہوگئی تھیں۔ آج رات کو میرا نکاح تھا۔ فنکشن چونکہ ہال میں رکھا گیا تھا اس لیے گھر میں مہمانوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ اماں کی آواز سن کے میں بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ سو فیصد یقین تھا۔ حمزہ کی کال ہوگی تبھی بغیر دیکھے اٹینڈ کرلی۔

''توبہ ہے حمزہ اب کم از کم چھ سات گھنٹے تو صبر کرلیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اتنے مہینوں سے صبر ہی تو کر رہا ہوں۔'' میں ایک دم چپ ہوئی تھی۔ وہ حمزہ کی آواز نہیں تھی اور جس کی تھی وہ ابھی اتنا پرانا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں پہچان نہ پاتی۔

''آج اس صبر کا صلہ دے ہی دو، آجاؤ۔'' وہ مجھے بلا رہا تھا۔ میں سن کھڑی رہ گئی۔

''کیوں؟'' حالانکہ مجھے نہیں پوچھنے چاہیے تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہیے تھا۔ اس کی آواز پہچانتے ہی کال ڈس کنیکٹ کردینی چاہیے تھی مگر...... شاید وہ اب بھی میرے دل میں کہیں زندہ تھا۔

''کیونکہ بے شک میں دیر سے سمجھا مگر سمجھ گیا کہ اس دن میں نے تمہاری آنکھوں میں جو کچھ دیکھا۔ وہ صرف میرا خیال نہیں تھا، سچ تھا۔'' اس کا اعتراف میرے دل میں اتھل پتھل مچا گیا۔ میں اسے انکار نہ کرسکی۔ کہہ نہ سکی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سب جھوٹ ہے۔ فون بند نہ کرسکی۔

''آؤ گی ناں۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ آج رات کو میرا نکاح ہے۔ میں نہیں آؤں گی۔'' اب کے میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔

''حائقہ! میں تمہارا پیار زندہ کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''عمیر میں نہیں آؤں گی۔'' میں نے خود کو مضبوط کیا تھا۔

''اور اگر میں کہوں کہ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تو......'' اس نے پوچھا تھا۔

''تو بھی نہیں آؤں گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

''اور اگر میں کہوں کہ تم نہ آئی تو شام کو میں آجاؤں گا۔ عارش کا جنازہ پڑھنے۔'' مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

''عارش...... کہاں ہے عارش؟'' میں ایک دم پریشان ہوئی تھی۔

''میرے پاس۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

مجھے اب بھی یقین نہ تھا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ عارش تو......'' عارش ابھی تو یہیں تھا۔

''اماں...... اماں...... عارش کہاں ہے؟'' میں فون کان سے لگائے اماں کو آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی تھی۔

''عارش کہاں ہے۔'' اماں کچن میں تھیں۔

''ابھی باہر گیا ہے کسی کے ساتھ کیوں کیا ہوگیا ہے۔'' اماں نہ جانے کیا کچھ پوچھ رہی تھیں۔ میں فون کان سے لگائے سن کھڑی رہ گئی۔ عمیر مسلسل ہنس رہا تھا۔

''اب آیا یقین اگر نہیں آیا تو لو یہ سن لو۔'' عارش کی درد بھری چیخیں مجھے دہلا گئیں۔

''عمیر پلیز! خدا کے لیے اسے کچھ مت کہو پلیز۔'' میرا دل ایک دم تڑپ گیا۔

''تو پھر کب تک آرہی ہو تم؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''عمیر میں کیسے آؤں۔ شام کو میرا نکاح ہے۔ تم آخر چاہتے کیا ہو کیوں کر رہے ہو یہ۔'' میری بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ عارش کی ہولناک چیخیں پھر بلند ہوئیں۔

''عمیر رکو عمیر رک جاؤ پلیز۔'' میں نے بمشکل خود کو رونے سے روکا تھا۔

''پانچ منٹ تک نہ آئیں تو...... جوان بھائی کی لاش پر رونے کی تیاری کرلینا۔'' سرد لہجے میں کہتا وہ فون بند کرگیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کروں۔ اماں شاید چھت پر تھیں ابو جی پتا نہیں کہاں تھے۔ عارش کا نمبر ملایا تو بزی جا رہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے چادر اوڑھی اور کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر باہر نکل آئی اور یہی میری غلطی تھی آنسو بار بار آنکھوں سے باہر آرہے تھے۔ جب میں رائل اکیڈمی میں داخل ہوئی تو سانس بری طرح پھولا ہوا تھا، پاگلوں کی طرح میں ہر کمرے میں عارش کو ڈھونڈنے لگی۔

''میں جانتا تھا کہ پیار کے نام پر پگھل تو جاؤ گی مگر موم کی طرح پگھل کے بھی بہہ گئی نہیں۔ وہیں جم جاؤ گی۔ اس لیے بہنے کے لیے راستہ بنانا ضروری تھا۔'' عمیر کی آواز پر میں ایکدم مڑی۔

''کہاں ہے عارش؟'' میں تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی اور اندر آتے ہی جیسے سن ہوگئی۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرا دل مسل کے رکھ دیا ہو۔ عارش کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ شاپر سے لپیٹ کے مضبوطی سے باندھا ہوا تھا اور چہرے سے خون رس رس کے گردن پر بہہ رہا تھا۔ شرٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور خون سے رنگین تھی۔ دو جلاد صفت انسان اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے ایک کا پستول عارش کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں بالکل بند تھیں وہ شاید بے ہوش تھا۔ میں روتے ہوئے اس کی طرف بڑھی تھی مگر عمیر نے مجھے بازو سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔

''عمیر! تمہیں جو چاہیے لے لو۔ جو چاہتے ہو مجھ سے کہو مگر اسے چھوڑ دو پلیز اسے کچھ مت کہو۔ میں بلک بلک کر رو دی تھی۔ عارش کی گردن سے بہتا خون دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تو آدھا حصہ تھا میرا۔ آدھا وجود...... اسے یوں خونم خون کیسے دیکھ سکتی تھی میں۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے تم سے۔ بس وہ چھوٹا سا سچ جو اس دن تمہاری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ آج زبان سے بول دو۔'' عمیر نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''زیادہ کچھ نہیں۔ بس بھیگی آنکھوں کے ساتھ میرے پاس آکر ایک بار آئی لو یو بول دو۔ اپنی بانہوں کا ہار ایک بار میرے گلے میں ڈال کر کہہ دو کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔'' وہ مجھ سے میری زندگی مانگ لیتا، میری سانسیں مانگ لیتا، قسم خدا کی میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے دے دیتی مگر وہ مجھ سے میرا غرور مانگ رہا تھا۔ میری عزت مانگ رہا تھا۔ حمزہ کا حق مانگ رہا تھا میں کیسے دے دیتی۔

''کیوں کر رہے ہو یہ سب؟'' میں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

''کیونکہ تم نے مجھے مجبور کردیا ہے یہ سب کرنے پر، سمجھایا تھا ناں میں نے تمہیں کہ باز آجاؤ۔ میرے رستے میں مت آؤ، پر تم نہیں سمجھیں، اپنے بیٹے کے لیے یہ گڑھے خود کھودے ہیں تم نے، اب گرو گی بھی خود ہی۔'' عارش کو شاید ہوش آیا تھا مگر اس کے پیچھے کھڑے اس جلاد نے اس کے سر میں پستول ماری، عارش کی چیخ مجھے تڑپا گئی۔

''آئی لو یو، آئی لو یو سو مچ......'' میں تین چار بار کہتے ہوئے اس کے قریب آئی تھی عمیر ہولے سے ہنسا ایک

نظر عارش کو دیکھتے ہوئے میں نے ہولے سے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بار پھر عارش کی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے ایک دم دونوں بازو اس کے گلے میں ڈالے۔

''آئی لو یو۔'' مجھے ٹوٹ کے رونا آیا تھا۔ عمیر نے ہولے سے میرا چہرہ اونچا کیا۔ وہ مسکراتی نظروں سے مسلسل مجھے دیکھ رہا تھا۔ بہت آہستگی سے اپنے دونوں بازو میرے اردگرد باندھتے ہوئے اس نے مجھے مزید قریب کیا تھا۔ مجھے اس کی سانسوں کا شور سنائی دینے لگا۔

''پھر کہو......'' اس نے ہولے سے سرگوشی کی۔

''آئی لو یو، آئی کانٹ لیو ود آؤٹ یو (میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی)'' ہولے ہولے مسکراتے ہوئے اس نے دھیرے سے اپنے لبوں سے میرے لبوں کو چھوا تھا اور پھر چند لمحوں بعد مجھے آزاد کر دیا۔

''جاؤ لے جاؤ عارش کو۔'' وہ بولا۔ میں نے تیزی سے عارش کے سر سے رسی کو کھولتے ہوئے وہ شاپر اتارا تھا اور...... بے یقینی کی انتہا کو چھوتے ہوئے میں نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ کھل کے ہنس رہا تھا۔

''مانا کہ میں بہت ظالم ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ اپنے فیورٹ اسٹوڈنٹ کو ہی موت کے گھاٹ اتار دوں۔ نفرت تم سے ہے تمہارے بھائی سے نہیں۔'' وہ عارش نہیں تھا۔ عارش وہاں آیا ہی نہیں تھا اسے تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں تھا۔ عمیر جیت چکا تھا۔

☆......☆

''حاری کہاں گئی تھی بغیر بتائے؟'' میں جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ اماں تیر کی طرح میری طرف آئی تھیں۔

''وہ سامنے والی آنٹی نے بلایا تھا۔ کاغذ پڑھوانے تھے کوئی انہوں نے۔'' میں ہولے سے کہتے ہوئے کمرے میں گھس گئی پتا نہیں انہیں یقین آیا کہ نہیں خود ہی بول بول کر چپ ہو گئیں میرے پورے وجود میں خاموشیاں اتر رہی تھیں ہر آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ چند لمحوں میں جو کچھ ہوا اس کا مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا تو کوئی دوسرا کیسے کرتا۔ اچانک مجھے باہر عارش کی آواز سنائی دی۔ میں تیر کی طرح باہر آئی تھی۔ عارش اماں کے پاس کھڑا کوئی بات کر رہا تھا۔ ایک خراش تک نہیں تھی اس کے چہرے پر مسکراتا ہوا۔ خوش باش، ہر چیز سے بے خبر۔ میں بوجھل دل کے ساتھ واپس اندر آ گئی۔ ہر گزرتا لمحہ میرے دل کی دھڑکن بڑھاتا جا رہا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا مگر کب ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ یہ بالکل نہیں پتا تھا، چار بجے بیوٹی پارلر والی آ گئی، مجھے تیار کرتے ہوئے نہ جانے کیا کچھ بولتی رہی۔ میرے پلے ایک لفظ نہ پڑا۔ جیسے ہی بیرونی دروازے پر دستک ہوتی۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آ جاتا۔ بارات نے دس بجے آنا تھا تقریباً سات بجے کے قریب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی، شاید عارش دروازے تک گیا تھا ابو جی ہال جانے کی تیاری میں تھے۔

''کون آیا ہے؟'' ابو جی نے بلند آواز میں پوچھا تھا۔

''سر حمزہ آئے ہیں۔'' عارش کی مدھم سی آواز مجھ تک پہنچی تھی۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ ہاتھوں کی انگلیاں تک لرزنے لگیں۔ حمزہ کیوں آیا تھا۔ میں نے خود سے ایسے پوچھا جیسے مجھے کچھ پتا ہی نہ تھا۔

''حائقہ کہاں ہے؟'' اس نے شاید عارش سے ہی پوچھا تھا۔

''کیا بات ہے بیٹا! خیریت؟'' اماں پریشانی سے بولیں تھیں۔

''حائقہ کہاں ہے؟'' اس کی سرد آواز دوبارہ مجھ تک پہنچی تھی۔

''اندر ہے۔'' کہتے ہوئے اماں اسے اندر لے کر آئیں۔ میری ٹانگوں میں اٹھ کے کھڑا ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا موبائل میری گود میں پھینکا۔ میں اندر تک کانپ گئی۔

''میں دوسروں کا سنا اور کہا دونوں جھٹلا سکتا ہوں مگر اپنی آنکھوں کا دیکھا کیسے جھٹلاؤں حائقہ؟'' اس کے سرد الفاظ میری روح کے اندر تک اتر گئے۔ ابو جی نے میری گود سے موبائل اٹھایا تھا۔

''آئی لو یو، آئی کانٹ لیو ود آؤٹ یو۔'' مجھے میری ہی بھیگی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ ابو جی بے یقینی سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

''صرف دو چیزیں حائقہ بالکل سچ سچ......'' وہ کہتے ہوئے میرے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔

''میری طرف دیکھو۔'' اس نے میرا جھکا ہوا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ میری دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انگلیاں لرز رہی تھیں۔

''تم آج عمیر کے پاس گئی تھیں؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا تھا۔ میں بول نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ لیتا کہ تم نے یہ سب کیوں کیا مگر اس نے پوچھا بھی تو کیا۔

''صرف ہاں یا ناں۔'' اس نے میرے لرزتے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں مقید کیا تھا۔ میں نے بمشکل نظر اٹھا کے اسے دیکھا امید کا ایک جہان بسا تھا اس کی آنکھوں میں۔

''نہیں گئیں ناں تم آج اس کے پاس، نہیں ملیں ناں تم اس سے ہے ناں جھوٹ ہے یہ سب۔ کچھ نہیں کہا ناں تم نے اس سے جھوٹ بکواس ہے ناں یہ سب۔ ہے ناں حائقہ۔ جھوٹ ہے ناں۔ تم نہیں گئیں تھیں اس کے پاس......'' حمزہ کی آنکھوں کے سوال بڑھتے جا رہے تھے میں نے ہولے سے لبوں کو کھولا حمزہ کا سارا وجود متوجہ ہو گیا۔ میں نے ایک نظر اپنی اماں پر ڈالی۔ پھر ابو جی کو دیکھا عارش کو دیکھا اور حمزہ کو دیکھتے ہوئے دوبارہ نظر جھکا لی۔

''ہاں گئی تھی۔'' حمزہ کے ہاتھوں کی گرفت ایک دم میرے ہاتھوں کے گرد کمزور پڑی تھی۔

''حائقہ......!'' ابو جی کے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔ میں دوبارہ حمزہ کی آنکھوں میں دیکھ نہ سکی۔

''تم نے یہ سب کہا ہے عمیر سے؟'' پھر مشکل سوال۔ اس بار مجھ میں ہاں کہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ حمزہ نے ایکدم میرے ہاتھوں کو آزاد کیا تھا۔ چند لمحے وہ یونہی زمین پر بیٹھا رہا جیسے اٹھنے کی ہمت جمع کر رہا ہو اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں نے یہ کیوں کیا؟'' میں نے بمشکل ہمت جمع کر کے اس سے پوچھا تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی رک گیا اور ہولے سے مڑا، میں نے اب بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

''تم نے یہ سب کرنے سے پہلے مجھ سے نہیں پوچھا تو میں سب کچھ ہو جانے کے بعد کیوں پوچھوں۔'' حمزہ کا لہجہ انتہائی ٹوٹا ہوا تھا۔ دونوں آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتا وہ دروازہ پار کر گیا۔ ابو جی نے ایک دم مجھے جھنجھوڑا تھا۔

''حاری! کیوں کیا تو نے یہ سب؟ کیوں......؟'' ابو جی رو رہے تھے۔

''اگر اس سے ہی شادی کرنی تھی تو کہہ دیتی۔ میں اسی سے کروا دیتا۔ پر یہ سب تو نہ کرتی۔'' ابو جی روتے ہوئے زمین پر بیٹھے تھے۔ میں نے تڑپ کے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا۔

''ابو جی! میری بات سنیں میں نے یہ سب......'' ابو جی نے مجھے زور سے دھکا دیا۔

''اس سے تو بہتر تھا حاری کہ تو مجھے زندہ درگور کردیتی۔ اپنے ہاتھوں سے میری قبر بنادیتی مگر یہ سب نہ کرتی۔ میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیا کہوں گا ان سب لوگوں کو جو بارات کے انتظار میں وہاں ہال میں آئے ہوئے ہیں۔'' ابو جی سر پر ہاتھ مار مار کے رو رہے تھے۔ اماں کو عارش نے دونوں کندھوں سے تھاما ہوا تھا۔

''تو نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا حاری! کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بول! کیوں کیا ایسا؟ بول......!'' ابو جی کو جیسے ایک دم قہر چڑھا تھا۔ انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دینے شروع کردیے۔

''حاری مجھے پتا ہوتا تو یوں میری عزت کا جنازہ نکالے گی تو میں تجھے پیدا ہوتے ہی دفنا دیتا۔'' ابو جی نے میرے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کردی تھی گھر میں بس اِکا دُکا رشتہ دار ہی تھے زیادہ تر لوگ ہال چلے گئے تھے۔

''بھائی جی! چھوڑیں اسے چھوڑ دیں مرجائے گی۔'' ابو جی نے تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکالتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔

''آج اسے مار کے ہی جاؤں گا میں۔'' ابو جی جوتا لے کر مجھ پر برس پڑے۔ عارش کبھی اماں کو سنبھالتا تو کبھی ابو جی کا ہاتھ روکتا۔

''حاری! تو نے میرے منہ پر کالک مل دی، تو نے مجھے زندہ درگور کردیا۔'' میرے ماتھے اور ہونٹ سے خون نکل آیا تھا۔ ایک بار بھی میں نے ابو جی کا برستا ہوا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کی۔ اتنا تو حق بنتا تھا ان کا۔ میرے چہرے اور بازوؤں پر جابجا نیل کے نشان پڑ گئے تھے۔ دوپٹہ نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ آخر ابو جی مار مار کے تھک گئے تو جوتا ایک طرف پھینک دیا اور خود چارپائی پر گر گئے۔ اماں مسلسل ہچکیاں بھر رہی تھیں۔

''اس سے تو بہتر تھا اسے پیدا ہوتے ہی مار دیتی تو آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ پورے شہر کے سامنے اس نے میری عزت رول دی۔ کیا کہوں گا میں لوگوں سے کہ بارات کیوں نہیں آئی؟'' ابو جی بے بسی سے رو رہے تھے۔

''اماں! میری بات تو سن لیں۔'' خون تھوکتے ہوئے میں نے ہولے سے کہا تھا۔ اماں نے ایک دم خود کو عارش کے بازوؤں سے چھڑوایا اور میری طرف آئیں۔ دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑا اور دبا دیا۔

''جان چھوڑ دے میری، کاش یہ کام میں تیرے پیدا ہوتے ہی کرلیتی۔'' اماں نے پوری قوت سے میرا گلا دبایا ہوا تھا۔ میری آنکھیں ابل آئیں سانس ایک دم بند ہوگیا۔

''اماں چھوڑیں اسے۔'' عارش نے بمشکل میرا گلا ان کے ہاتھوں سے چھڑوایا تھا۔ میں کھانستی ہوئی دیوار کے ساتھ گر گئی۔

''ابو جی! لوگوں سے کیا کہنا ہے؟'' عارش نے ہولے سے پوچھا تھا۔

''یہ ہی کہ ہماری اولاد ہی نہیں تھی۔ یہ سڑک کنارے پڑی ملی تھی۔ نہ جانے کس کا خون ہے۔ منہ کالا کرتے پکڑی گئی بس......'' ابو جی مجھے ٹھوکر مارتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں بے یقینی سے عارش اور اماں کو دیکھتی رہ گئی۔ ماتھے سے بہتا خون میرا پورا چہرہ رنگین کررہا تھا۔ رشتے دار خواتین اماں کو باہر لے گئیں۔ عارش میرے قریب آ کے رکا تھا۔

''عارش! میں نے یہ سب تمہارے لیے......'' عارش نے میری بات کاٹ دی۔

''حاری! بس کر بس کردے، تجھ میں غیرت ہوتی ناں تو اب تک مرچکی ہوتی۔'' عارش کہتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ ایسے ہوتا ہے بھلا۔ اولاد پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک والدین پر اندھا دھند اعتماد کرتی ہے اور والدین ایک لمحے کا بھی اعتبار نہیں کرپاتے، میں اپنے ابو جی کا خون تھی، ان کا مان تھی۔ ان کا بھروسہ تھی۔

(جاری ہے)

صدف سعد

روداد کی ڈائری

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

محسن نقوی کی نظم

سنو
بہت سی
ڈگریاں لے کر
ہنر پہ دسترس پا کر
کسی مفلس کا دردِ دل
اگر اُس کی آنکھوں سے
پڑھنے سے قاصر ہو
تو جاہل ہو

ریما نور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی خوب صورت نظم

کبھی رنگ بھرے لمحے
یہ پھول اور کلیاں
فضا میں بکھری گھٹائیں
یہ رات جگنوں کی ہوائیں
یہ میرا دل، تیرا گھر بنا
میرے وجود سے اُٹھتی
تیرے خیال کی باتیں
یہ صندلیں بدن کی
آنکھوں لبھاتی ہوئی معصوم ذات
میرے دل کی کلی تم پر مرمٹی
کبھی خوشیاں میرے من کی
میرے دلی جذبات
اور میری جان پیار کے تمام رشتے
تیرے نام

روشنی فاطمہ کی ڈائری سے

ایک نظم

چھوٹی سی زندگی ہے
ہر بات میں خوش رہو
جو چہرہ پاس نہیں
اس کی آواز میں خوش رہو
کوئی روٹھا ہو تم سے
تو اس کے اس انداز میں خوش رہو
جو لوٹ کے نہیں آنے والا
ان لمحوں کی یاد میں خوش رہو
اپنی خوشیوں کا انتظار مت کرو
دوسروں کی مسکان میں خوش رہو
کیوں تڑپتے ہو ہر پل کسی کے ساتھ کو
کبھی اپنے آپ میں بھی خوش رہو
چھوٹی سی تو ہے زندگی ہو، ہر حال میں خوش رہو

مہرین کنول کی ڈائری سے

پروین شاکر کا کلام

ان دنوں میری
اپنے آپ سے بول چال بند ہے
میرے اندر ایک بانجھ غصہ

پھنکارتا رہتا ہے، نہ مجھے ڈستا ہے
نہ میرے گرد اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے
نینوا کی سرزمین ایک بار پھر سرخ ہے
فرات کے پانی پر
ابن زیاد کے طرفداروں کا ایک بار پھر قبضہ ہے
زمین اور آسمان
ایک بار پھر شش ماہے کا لہو وصول کرنے سے
انکاری ہیں اور
میرے چہرے پر
اب مزید لہو کی جگہ نہیں
فاتح فوج روشنی اور آگ کے فرق کو نہیں سمجھتی
صحرا کی رات کاٹنے کے لیے
انہیں الاؤ کی ضرورت تھی
سو انہوں نے میرے کتب خانے جلا دیے
لیکن میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی
میرے بالوں میں سرخ اسکارف بندھا ہے
اور
میرے گلاس میں کوکا کولا ہنس رہا ہے
میرے سامنے ڈالر کی ہڈی پڑی ہوئی ہے

مہوش جواد کی ڈائری سے

مرزا جاذب کا کلام

دیدہ و دل فراش کرتا ہوں
گویا خود کی تراش کرتا ہوں
رات بھر اک تیرے تصور سے
فکر سے بود و باش کرتا ہوں
پہلے اک تیری تمنا تھی مگر
اب میں اپنی تلاش کرتا ہوں
اور تیری الفت میں آج کل جاذب
ہر ہر رسم پاش پاش کرتا ہوں

مصباح مسکان رؤف کی ڈائری سے

ایک خوبصورت کلام

رم جھم برستی بارش میں، جب پنچھی چہچہاتے ہیں
بادِ صبا کے سنگ جب پتے لہلہاتے ہیں
کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں
ٹھنڈی ہوا سنگ بارش کے
یادیں بچھڑوں کی لاتی ہیں
یاد آتے ہیں اُن سنگ بیتے وہ پل حسین
دل اُداس ہو جاتا ہے آنکھوں میں جل تھل ہو جاتی ہے
یہ یادیں بچھڑے اپنوں کی من میں آگ لگاتی ہیں
لے آئے کوئی واپس بھی مسکان
وہ بیتے لمحے، بچھڑے دوست، وہ پل حسین
رم جھم برستی بارش میں کچھ دوست، بہت یاد آتے ہیں
ہم کو بے چین کر جاتے ہیں
رم جھم برستی بارش میں

کرن ناز کی ڈائری سے

پروین شاکر کی غزل

الزام تھا دیے پہ نہ تفسیر رات کی ہم نے تو
بس ہوا کے تعلق سے بات کی
ہر صبح جب کہ صبح قیامت کی طرح آئے
ایسے کون ہو گا جو سوچے ثبات کی
تکلیف تو ہوئی مگر اے ناخن ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی
زنجیر ہے جزیرہ ہے یا شاخ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت ہے بات کی
مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تنہا کٹی وہ عمر جو تیرے سات کی
پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی ایک ایک گھات کی

......☆......

اشعار

مریم ماہ منیر ——— لاہور
تم کو دیکھوں یا پھر چاند دیکھوں
بات تو ایک ہی ہے گر تم سمجھو

ریما نور رضوان ——— کراچی
کسی نے عجیب سوال کر ڈالا
مرتے تو مجھ پر ہو تو پھر جیتے کس کے لیے ہو

سدرہ شاہین ——— خانیوال
کھلونے ٹوٹ جانے پر بہت روتی تھی بچپن میں
مگر اب دل جو ٹوٹا ہے تو آنسو کیوں نہیں بہتے؟

ریمل آرزو ——— اوکاڑہ
پھر پیاس اتری ہے بستیوں میں
گفتگوئے فرات کی جائے

دھنک ناز ——— کراچی
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
لوگ تسخیر بھی ہو سکتے ہیں
لفظ دل سے ادا کرے کوئی

صبا سحر ——— ہارون آباد
اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا حد سحر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

حنا علی ——— سیالکوٹ
ہماری شرط وفا یہی ہے وفا کرو گے وفا کریں
ہمارا ملنا ہے ایسا ملنا، ملا کرو گے ملا کریں گے
یہ پوچھنا کیا کہ خط لکھو گے؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں
تمہاری مرضی پر منحصر ہے لکھا کرو گے لکھا کریں گے

نوشین مدثر ——— لاہور
دل سلگتا ہے میرا سرد رویے سے تیرے
دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
جیسے تو حکم کرے دل میرا ایسے دھڑکے
یہ گھڑی تیرے اشاروں سے ملا رکھی ہے

امبرین حیدر ——— اسلام آباد
کیسی محبت کیسی چاہت ہم پر سب روشن تھا
یونہی ذرا سا شوق ہوا تھا آؤ دل برباد کریں

رابعہ منیر ——— سرگودھا
چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے گزر گئے
نشہ محبتوں کا اترنے نہیں دیا
اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے عدیم اس کو مکرنے نہیں دیا

مریم نواز ——— فیصل آباد
ایسے رہا کرو کہ لوگ آرزو کریں
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

شمائلہ ملک ______ کراچی

کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تیرا تھا
دور ہونے پر بھی اعتبار تیرا تھا
نجانے کیوں بے رخی تو نے ہم سے کی
کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی طلب گار تیرا تھا

روشنی فاطمہ ______ کراچی

اہل نظر کے بخت میں کس نے یہ لکھ دیا
رہنا کسی کے ساتھ محبت کسی کے ساتھ
ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

سحرش نور ______ گجرات

بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ کٹ نہ جائیں بے تابی کے راستے
آنکھوں نے تیری راہوں سے ہٹ کر نہیں دیکھا

کرن ناز ______ کھاریاں

ملو کہ آج کوئی بات روبرو کرلیں
یہ کیوں ہوئیں دوریاں کچھ اس پر گفتگو کرلیں
کریں گے پھر سے زیارت تمہارے چہرے کی
کہ پہلے آنکھوں کو اشکوں سے باوضو کرلیں

ارم سرفراز ______ لاہور

مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم ہے
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

صدف سحر ______ کمالیہ

اک محبت ہے بدگمان ہونا
اک حقیقت ہے داستان ہونا
تو جو آئے تو بات بنتی ہے
ورنہ عمروں کا رائیگاں ہونا

عینی سید ______ ملتان

وصال میں بھی وہی فاصلے سراب کے ہیں
کہ اس کو نیند مجھے رت جگے کی عادت ہے
تیرا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے

فریال ______ لاہور

کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی
کوئی ہو بھی تو ذرا چاہنے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جاسکتی

نمرہ علی ______ کوئٹہ

بھری پُری میری دنیا میں اک مدت سے
کسی کی اتنی کمی ہے کہ کچھ نہ پوچھو تم
وہ زخم پایا کہ جس کی مثال مشکل ہے
وہ مات اب کے ہوئی ہے کہ کچھ نہ پوچھو تم

زرش ______ پشاور

یہ بھی دن ہیں اس سے پل دو پل ملنا ناممکن ہے
وہ بھی دن تھے کٹ جاتی تھیں راتیں پوری باتوں میں
میں اور تم سے پہنچ گئے آپ جناب کے صیغوں میں
رفتہ رفتہ اتر آئی ہے کیسی دوری باتوں میں

ثناء حیات ______ کراچی

معین جس کے لیے ہم نے سب حدیں توڑ دیں
اسی نے آج کہا ہے اپنی حد میں رہو

......☆......

نورین ملک

اس ماہ میں

اس ماہ میں

فرمودات حضرت علیؓ

☆ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے حکمت خواہ منافق سے ملے لے لو۔

☆ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

☆ جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو۔

☆ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے سے بچو۔

☆ گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کردیتا ہے۔

☆ سب سے بہترین لقمہ وہ ہوتا ہے جو اپنی محنت سے کمایا جائے۔

☆ جو شخص پاک دامن عورت پر تہمت لگاتا ہے اسے سلام مت کرو۔

☆ ہمیشہ سچ بولو تاکہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

☆ موت کو ہمیشہ یاد رکھو موت کی آرزو بھی نہ کرو۔

ملک جواد نواز قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اس ماہ کے اقتباس

کہتے ہیں کہ جب کوئی اپنا بہت عزیز بہت پیارا بچھڑ جائے تو انسان اپنے جینے کے جواز زندہ رہنے کے بے معنی سہی لیکن بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے تاکہ اگر کبھی وہ بچھڑ جانے والا مل جائے تو ان سے زندگی کا جواز نہ مانگے اور اگر مانگے تو وہ جھٹ سے کہیں کہ تیری یادیں تھیں کچھ نشانیاں کچھ وعدے کچھ ذمہ داریاں تھیں جن کو نبھانے کے لیے جینا پڑا...... مجبوری تھی سمجھا کرو جس طرح تمہیں بچھڑ جانے کی مجبوری تھی اسی طرح ہمیں زندہ رہنے کی مجبوری تھی۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور مروت ہمیشہ انسان رشتوں سے نبھاتا ہے اپنے گہرے اور عزیز رشتوں سے اور رشتے نبھانا آسان بھی نہیں ہوتا۔

نبیلہ عزیز کے ناول "ایسا اہلِ دل ہو" سے اقتباس

فرح ناز محمد رفیق۔ کراچی

زندگی کا اصل راز

نماز کے دوران غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوسی یا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں دراصل انسان کا دل ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں امیر کبیر بھی چلتے ہیں غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں، خوب صورتوں اور بدشکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے۔ نیکوکاروں، پارساؤں اور دین داروں کے

علاوہ کافروں، مشرکوں، مجرموں اور گناہ گاروں کے لیے بھی یہی شاہراہ عام ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ اس شاہراہ پر ٹریفک بھی خود بخود آئے اسے خاموشی سے گزر جانے دیا جائے اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو دل کی سڑک پر خود پہیہ جام ہو جانے کا شدید خطرہ ہے اس راستے کا ٹریفک سگنل صرف سبز بتی پر مشتمل ہے اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کے علاوہ یا نماز کے اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی زندگی کا اصل راز یہ ہی ہے۔

(قدرت اللہ شہاب)

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کی خوبصورت بات

ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو۔

(خلیل جبران)

صبا سحر۔ ہارون آباد

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ خاتون نے ایک کوٹ پسند کیا اور سیلز گرل سے بولی۔ اگر میرے شوہر کو یہ کوٹ پسند آیا تو کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ اسے واپس لینے سے انکار کر دو گی۔

☆ بیوی نے شوہر سے کہا۔ ''تمہارا کہنا ٹھیک ہے کہ میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرتی ہوں اس کے علاوہ کوئی فضول خرچی بتاؤ۔''

☆ ''میری بیوی دنیا کی بہترین عورت ہے۔'' ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ''اور یہ میری واحد رائے جس سے میری بیوی بھی متفق ہے۔''

☆ ایک امریکی لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ ''مجھے تمہارا نیا بوائے فرینڈ پسند نہیں آیا۔'' سہیلی نے فوراً کہا۔ ''شکر خدا کا۔''

☆ باپ۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی ایک گدھے کے ساتھ زندگی گزارے۔'' شادی کا خواہش مند لڑکا۔ ''اسی لیے تو میں اسے یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔''

نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کی کرنیں

☆ رشتے بنانا کوئی مشکل نہیں انہیں نبھانا مشکل ہے۔

☆ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جذبے سچے ہونے کے باوجود خلوص اور محبتوں کے عوض انسان کو کچھ نہیں ملتا۔

☆ فتح امید سے نہیں علم اور خدا پر اعتماد سے ملتی ہے۔

☆ وقت، خوشبو اور ہوا کبھی قید نہیں ہو سکتے مگر کیش ہو سکتے ہیں۔

☆ جو باتیں دل سے نکلتی ہیں دل میں جگہ بنا لیتی ہیں۔

☆ سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ میں حوصلہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے کچھ نہیں کھویا۔

☆ لوگوں کے آگے جھکنے سے ان سے مایوس ہونا بہتر ہے۔

☆ حقیقی خوب صورتی کا سرچشمہ ہمارا دل ہے اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھیں کچھ نہیں کر سکتیں۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

......☆......



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا: ''لوگو! قسم ہے اللہ کی مجھے تمہارے بارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔''

ایک آدمی نے کہا: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا: ''تم نے کیا سوال کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے کیا وہ خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار میں جو سبزہ اگتا ہے اس سے جانور اپھارے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے مگر وہ چرنے والا جانور (بچ جاتا ہے) جو کھاتا ہے پھر جب اس کی کوکھیں بھر جاتی ہیں تو دھوپ کی طرف منہ کر کے گوبر اور پیشاب کرتا ہے پھر جگالی کرتا ہے اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اسے اس میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھاتا رہتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔'' (صحیح بخاری)

سیدہ نورین۔ کراچی

اقوال

☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلا نہیں لیتا۔

☆ حسد کرنے والا موت سے پہلے مر جاتا ہے۔

☆ خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا کہ غم۔

☆ اذان کے وقت خاموش رہو تاکہ موت کے وقت کلمہ نصیب ہو۔

☆ جس کا نفس اس کے قابو میں ہے وہ مومن ہے۔

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

☆ دنیا کو جیتنا چاہتے ہو تو آواز میں نرمی پیدا کرو۔

☆ محبت کی آزمائش محبت کی توہین ہے۔

☆ خوب صورتی ہمیشہ پرخلوص دل اور نرم زبان سے چھلکتی ہے۔

☆ کسی کو اتنا وقت نہ دو کہ وہ تم کو بوجھ سمجھنے لگے۔

صبا سحر۔ ہارون آباد

توبہ

خدا شناسی اور فقر درویشی کے نقالوں نے دنیا میں کیسے کیسے لوٹا ہوگا، کون جانتا ہے اس راہ میں

فریب خوردہ لاکھوں افراد شیطان کے مکر کا شکار ہیں مگر صرف ایک توبہ صرف ایک سچے دل سے توبہ دل و دماغ صاف چمکدار پاک اور وقتِ پیدائش جیسا نیا نکور بنا دیتی ہے اور وہی توبہ آئندہ زندگی کی سنگ میل بن جاتی ہے۔

دھنک ناز۔ کراچی

واصف علی واصف کہتے ہیں

☆ انسان عمل کے لیے علم حاصل کرتا ہے لیکن جوں جوں علم پھیلتا ہے عمل کے مواقع سمٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا حصول علم ہے اور یہ عمل اس کو فرائض کی بجا آوری کے عمل سے بہت دور کر دیتا ہے۔ سڑک کے کنارے کمرے میں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا جو سڑک پر سے گزر رہی ہے۔

☆ کچھ لوگ حقیقت کو تلاش کرتے ہیں۔ دراصل یہ تلاش نہ ختم ہونے والی تلاش ہے۔ دراصل محدود کا لامحدود کے لیے سفر کسی بیان میں نہیں آسکتا۔ قطرے کے قلزم آشنا ہونے کے لیے کن مراحل سے گزر رہے ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر یہ مقامات اور مراحل گزرتے ہیں۔

☆ ہر چیز انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکا پھر وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

☆ جو لوگ دنیاوی اشیاء اور ضروریات کے حصول کے لیے مضطرب ہیں وہی دراصل تکلیف میں ہوتے ہیں۔

☆ تنہائی کے مسافر بیمار روحوں کی طرح اذیت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

☆ رفاقتوں کے فیض اعتماد کے دم سے ہیں بداعتماد انسان نہ کسی کا رفیق ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی حبیب، بداعتمادی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انسان کو ایسا کوئی انسان نظر نہیں آتا جس کی تقرب کی وہ خواہش کرے اور نہ ہی وہ خود کو کسی کے تقرب کا اہل سمجھتا ہے۔

نور بانو۔ کوئٹہ

سنہری حروف

❖ پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔

❖ بہترین آنکھ وہ ہے جو حقیقت کا سامنا کرے۔

❖ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور آسان کام دوسروں پر تنقید کرنا ہے۔

❖ نفرت دل کا پاگل پن ہے۔

❖ انسان زندگی سے مایوس ہو تو کامیابی بھی ناکامی نظر آتی ہے۔

زارا صدف قمر۔ کراچی

بچپن

کیوں نہ اس گزرے ہوئے پل کو ہی دیکھ لیں جس میں زندگی چمکتے جھلملاتے ستارے کی مانند مگر پُرفریب سی تھی۔ خواہشات اور آرزوئیں تو اس وقت بھی بہت تھیں مگر ان کے پورا ہونے اور نہ ہونے کا احساس اتنا زیادہ شدت آمیز نہ تھا نہ دیرپا مسکراہٹیں تو آج بھی مل ہی جاتی ہیں مگر وہ لمحات تو تھے ہی مسکراہٹوں کے جو مسکراہٹ ملتی دل تک اثر کرتی جو بات ملتی صحیح لگتی۔ اس وقت دوریوں کا احساس فاصلوں کی بنیاد پر کیا جاتا رہا اور جب نزدیکیاں ملتیں تو بھی دوریاں برقرار رہتیں۔ حرارت اس قدر نہ تھی کہ حالات کی برف سے پگھل کر ڈھکے ہوئے احساس نمودار ہو کر دل کی آنکھ کے سامنے آسکتے۔

اچھا تھا کہ اس وقت تنہائیوں سے آگاہی نہ تھی کہ تنہا ہو کر بھی خود کو تنہا نہ سمجھتے تھے سوچیں صرف محدود تھیں مگر ان کا انجام غیر محدود کسی سے جدا ہو کر ملن کی خواہش کم کم ہی تھی، آنسو آنکھوں ہی سے ٹپکتے تھے مگر دل تک رسائی کچھ بھی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو دماغ سے بالاتر ہو کر چاہتیں عارضی تھیں اور دکھ پل بھر کے لیے ہی ہوتے۔ اب کہ بالعکس روشنیاں زیادہ مسرت آمیز تھیں اور اندھیروں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اب کے بجائے کچھ اور نہیں تو زندگی کا ایک ہی روپ تھا جس میں زمانے نے رنگ بھر لیے اور وقت کے ساتھ ساتھ مختلف رنگوں میں ڈھلتا گیا۔

غرض کہ وہ پل بھی گزر گیا اور جو کچھ اب ہے آنے والے پل میں وہ بھی نہیں رہے گا۔

ملک جواد نواز۔ ڈیرہ اسماعیل خان

زندگی کی حقیقت

زندگی سمندر کی طرح وسیع ہے جس کا دور دور تک کوئی سرا نظر نہیں آتا اور سمندر کی طرح گہری ہے۔ جس کو ناپنے میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ عظیم انسان وہ ہے جو مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور کئی مدتیں گزار کر اس کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اس کی گہرائی کو ناپتا ہے اور اس میں پوشیدہ ہیرے جواہرات حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سطح کو ہی سب کچھ جان کر اس کی لہروں سے الجھتے الجھتے اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں اور آخر میں ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

پاگل نہیں

لڑکی اپنے نابینا عاشق سے۔

"کاش! تمہاری آنکھیں ہوتیں تو تم میرے حسن کو دیکھتے۔"

لڑکا: "اگر تم خوب صورت ہوتیں تو کیا آنکھوں والے تمہیں میرے لیے چھوڑتے؟"

اندھا ہوں پاگل نہیں۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

نمک پارے......!

☆ کچھ لوگ خطوط کی طرح ہوتے ہیں جن کو بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا اور دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہیں۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستے مل جاتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ چائے کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈالے بغیر پتا نہیں چلتا کہ ان کا اصل رنگ کیا ہے۔

☆ زندگی ایک ایسا سایہ دار درخت ہے جس کو سانس کی آری مسلسل کاٹ رہی ہے نہ جانے کب کیا ہو جائے۔

☆ اگر ہم کسی سے پیار کرتے ہیں تو یہ ہمارا ذاتی فعل ہے اگر جواب میں وہ بھی ہمیں اتنا ہی پیار دے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔

☆ کسی کو پانے کی تمنا مت کرو بلکہ خود کو اس قابل بناؤ کہ لوگ تمہیں پانے کی تمنا کریں۔

☆ دوست بنانے سے قبل اپنے دل میں ایک قبرستان بنا لو تاکہ دوست کی برائیاں دفن کر سکو۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے دل میں اتر کر اس کے دکھ کا اندازہ کر سکے۔

☆ انسان کی شخصیت اتنی گہری ہونی چاہیے کہ اندر کا حال کوئی نہ جان سکے۔

ایس امتیا احمد۔ کراچی

......☆......

ذرا پیار سے کہنا

نیا برس

اب کے جو نیا برس آئے گا
ساتھ غموں اور خوشیوں کی
سوغات لائے گا
کہیں خوشیوں کی برأت تو
کہیں غموں کی برسات ہوگی
کہیں وصل کے اُجالے
تو کہیں ہجرت کی رات ہوگی
اس برس بھی آنسوؤں کو
موتیوں میں پرونا ہوگا
نا چاہتے ہوئے بھی
کچھ لوگوں کو کھونا ہوگا
نئے برس ہم انتظار کے
نئے دیپ جلائیں گے
گزری یادوں کی
خوشبو سے سحر
دل کی دنیا
مہکائیں گے

شہلا گل سحر صالح

اچھی لگتی ہو

تم مجھ کو اچھی لگتی ہو
تم دل کو اچھی لگتی ہو
مانا کہ تمہیں میں نے دیکھا نہیں
پھر بھی اپنی سی لگتی ہو
میرے دل کو پیاری بہت لگتی ہو
کسی خواب نگر کی شہزادی
کسی مست نگر کی ملکہ
کسی سیپ میں بند موتی جیسے
کسی خواہش کی شدت ہو جیسے
تم اتنی ہی دلاری لگتی ہو
تم جان سے پیاری لگتی ہو!

مریم ماہ منیر

محبت

محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی
ہزاروں رنگ ہیں اس کے
عجب ہی ڈھنگ ہیں اس کے
کبھی صحرا کبھی دریا
کبھی جگنو کبھی آنسو
ہزاروں روپ رکھتی ہے
بدن جھلسا کے جو رکھ دے
کبھی وہ دھوپ رکھتی ہے
کبھی بن کے یہ اک جگنو
شب غم کے اندھیروں میں
دلوں کو آس دیتی ہے
کبھی منزل کناروں پر
پیاسا مار دیتی ہے
اذیت ہی اذیت ہے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی

فرزانہ شوکت

بے وفا

تم بے وفا نہیں ہو
کیسے یقین کروں میں
ہاں
تم بے وفا نہیں ہو
اپنا بنا کر
دل میں بسا کر
وعدے کر کے قسمیں کھا کر
چھوڑ گئے ہو
تنہا کر کے
نئے ہمسفر کے ساتھ
نئی منزلوں پر
نئے راستوں پر
پھر بھی
تم کہتے ہو
میں بے وفا نہیں ہوں

نگہت اکرم

غزل

مچا دو دیر و حرم میں ہلچل وفا کا اپنا دکھا کے آنچل
خلوص دل سے دعائیں کر لو
ہمارے حق میں اٹھا کے آنچل
تمہارے دم سے ہیں رونقیں یہ
تمہارے جلووں سے ہیں اُجالے
اندھیرا محفل میں کر نہ دینا تم
اپنے رخ پہ گرا کے آنچل
ذرا تو سوچو کہ ہو گا کیا اب
وہ دل کی بے تابیوں کا عالم
کسی کی کیوں جان لے رہے ہو
یوں اپنے منہ میں دبا کے آنچل
ہماری منزل ہے جستجو میں بھٹکتے رہنا تمہاری خاطر
فریب دیتے رہو ہمیں تم ہوا میں اپنا اڑا کے آنچل
عجیب دلکش تھا وہ نظارہ کہ دیکھ ٹوٹا صبح کا تارہ
گئے وہ اس ناز سے ادا سے
ہمارے ہاتھوں چھڑا کے آنچل
ہمیں یقین ہے کہ روز محشر امتیاز
رب کو منا کے اپنے وہ بخشوا دیں گے
سب خطائیں خدا کے آگے بڑھا کے آنچل

ایس امتیاز احمد

غزل

یہ تو بتا میرے دل کو سکون کب ہو گا
دیوانے ہیں جو دن رات پھرتے ہیں ہم
شام کے گھرے سائے اب تو ڈھلنے لگے ہیں
لوٹ کے اب شہر وفا میں آتے ہیں ہم
تپش تیرے ہجر میں سورج سے بھی زیادہ
ٹوٹے ہوئے دل سے اکثر فریاد کرتے ہیں ہم
ہر پل زمانہ نگاہیں بدلتا ہی رہا ہے
قدم قدم زندگی میں یوں دھوکا کھاتے ہیں ہم
دل سمندر دیکھا نہیں کسی کا ہم نے جاوید
شہر ظلمت میں جی کو لگاتے ہیں ہم

محمد اسلم جاوید

نظم

جو ہنساتے ہیں وہ کبھی کبھی رلا بھی دیتے ہیں

ہاتھوں میں پھول دینے والے
اکثر راہ میں کانٹے بچھا بھی دیتے ہیں
تخت پر بٹھانے والے کبھی کبھی منہ کے بل
فرش پر گرا بھی دیتے ہیں
حوصلہ بڑھانے والے اکثر
حوصلہ گھٹا بھی دیتے ہیں
خلوص دل سے ملنے والے
کبھی کبھی دل دکھا بھی دیتے ہیں
زخموں پر مرہم لگانے والے
اکثر زخموں کو ادھیڑ بھی دیتے ہیں
جن کے بن ایک پل بھی گزارنا
دشوار ہوتا ہے ہاجی
وہ اکثر عمر بھر کی جدائی کا تحفہ
تھما بھی دیتے ہیں

ہاجرہ امین خان ہاجی

نوحہ

اس شہر میں
ایک شور اٹھا
شاعر بے چارہ مر گیا
کیسے ہوا سب نے کہا
بیمار تھا فاقوں سے تھا
پیسے نہ تھے لیتا دوا!
کچھ بھی نہ اس کے پاس تھا
حساس دل گھائل تھی روح
دھچکا لگا اور مر گیا
سب دوڑے اس کے گھر گئے
اور اس کے مردہ جسم کو
کندھا دیا
اور اپنے ہاتھوں سے اسے دفنا دیا
اس شہر میں اس شہر میں
تعزیتی اجلاس ہوئے
سب نے کہا کتنا بڑا شاعر تھا وہ
ہر آنکھ میں آنسو بھی تھے
ہر لب پر اس کا ذکر تھا
اس شخص کی تعریف میں
مضمون بھی چھپنے لگے
ہر صاحب علم و ذکا
اس شخص کی تعریف میں
جتنا بھی کہہ سکتا تھا وہ کہتا گیا
دل کھول کر ہر شخص نے
اس مردہ شاعر کے لیے
پیسہ دیا، تربت بنی، پیسہ لگا
پیسہ کہ جس کی شکل کو
وہ عمر بھر ترسا کیا
زیر زمیں سوئے ہوئے
اس شخص کی بے چین روح
کہنے لگی یہ برملا
زندوں کو کب ہیں پوچھتے
مردوں کو ہم ہیں پوجتے

ریاض حسین قمر

غزل

ابھی یہ سوچنا ہے
مجھے کب سونا ہے
جدائی ہے درمیان ہمارے
کیسے ہوش میں ہوتا ہے
ہونٹوں سے مسکراہٹ خفا ہے
بس یہی رونا ہے
وہ آنکھیں یاد کرتا ہوں
جب ہوتا رونا ہے
وہ زخم دیتا جائے گا

میرا کام سب بھولنا ہے
وہ درد کا سورج ہے
احتیاط سے اسے چھونا ہے
جہاں وفا رہتی ہے ساتھی
وہ صحرا ڈھونڈنا ہے

زبیر پنہیار

نظم

ہے کون جو ہو
پیار سے بیگانہ
نا معلوم ہو جس کو یہ!
پیار ہے کیسا خزانہ
جس نے کیا اسے
اسے بھرنا پڑا یہ ڈنڈ
رہ گیا بن کے
ورثہ پرانا
پچھلے سال کا ہو
جیسے موسم
ٹوٹ جائے دل دل
اپنا
بیدار نہ ہو یہ من
بس کسی کا نہ چلا اس پر
ہے یہ اک پاگل پن

نور الصباء

درد

میں درد کے رستے میں نکلی ہوں
مجھے درد کی منزل کا پتا نہیں
کبھی اشک رکاوٹ ہو جائیں
کبھی خالی دل کا سونا پن!
روح کیسے کب ویران ہوئی
مجھے اس ستم کا پتا نہیں
ہیں زخمی پاؤں اور زخمی وجود
مرہم کہاں سے لاؤں کچھ پتا نہیں
تن من جل کر خاک ہوا
اس درد کی راہ میں نکلی جب
اب عادت اتنی گہری ہے
اس درد کا مجھ کو پتا نہیں

سعدیہ اقبال

نظم

کبھی تو لوٹ کے آؤ
کسی تنہا شام
دل ہو جب اُداس اور تیرے لیے غم خوار
تب چپکے سے تم آ کے
میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دو
اور دھیرے سے یہ کہہ دو
لو میں آ گیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے
صرف تیرے لیے جاناں
اب کے برس یہ عہد ہے
کبھی نہ تنہا چھوڑوں گا
ہمیشہ ساتھ تیرے رہوں گا
اب کے ہیں تیرے سارے
دکھ سکھ ہیں میرے
اپنے سارے غم مجھے سونپ کے
ہو جاؤ بے فکر جاناں
کیونکہ میں لوٹ آیا ہوں
کبھی نہ جانے کے لیے
کاش کہ یہ سب تم کبھی تو کہہ دو مجھ سے
اور کبھی تو لوٹ کے آؤ، کسی تنہا شام

ماریہ یاسر

☆......

سندیسے

عانیہ نیازی ــــــ ربوہ

پیاری اپیا اور تمام پڑھنے لکھنے والوں کو بہت سلام پیار اور ڈھیروں دعائیں۔ اتنے طویل عرصے بعد سندیسے کی محفل میں شرکت اس یقین کے ساتھ کر رہی ہوں کہ آپ سب نے مجھے مس کیا ہوگا (ہے ناں؟) سب سے پہلے آپ سب کو نئے سال کی ڈھیروں مبارک باد۔ خدا کرے کہ یہ سال آپ سب کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے، آمین۔ اب بات ہو جائے ردا کی تو سب سے پہلے میں قمروش آپی اور نائلہ جی کو ان کے ناولز کی کامیابی پر مبارک باد پیش کروں گی کہ بہت خوبی سے دونوں نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ژالے کی شوخی اور شرارت جہاں لبوں پر مسکان سجا دیتی تھی وہیں خرمن کی سنجیدگی و متانت اور حالات کی ستم ظریفی افسردہ کر دیتی تھی اور شازیہ مصطفیٰ جی کی تو کیا بات ہے کہ ان کا کوئی بھی ناول ہو خوب صورت رشتوں اور محبتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ عائشہ ذوالفقار افسانوں میں تو اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہی ہیں کہ ان کے افسانوں کے موضوعات اکثر چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ وہیں ان کے سلسلے وار ناول کا آغاز بھی بڑا دلچسپ انداز سے ہوا تھا مجھے اس ناول کے پہلے پیراگراف کو پڑھ کر یوں لگا کہ واقعی یہی سب تو ہم سب کے خواب اور خواہشیں ہوتی ہیں ویل ڈن عائشہ آپ نے بہت خوب صورتی سے سلسلے وار ناول کا آغاز کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ایک کامیاب ناول ثابت ہوگا۔ فریدہ فرید جی آپ کے افسانے تو ہمیں پسند ہیں ہی کہ سلیس اردو کا مزا لیے دل خوش کر جاتے ہیں مگر آپ کے مکمل ناول نے بھی خوب دل میں جگہ پائی۔ اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد اور ہاں اتنی محبت اور دعاؤں کا بے حد شکریہ کہ آپ مجھے ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ گیتی آپی آپ کے افسانے مختصر مگر ہمیشہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اب بات ہو جائے رواں ماہ کے ردا کی۔ مکمل ناول میں سباس گل جی شامل اشاعت تھیں اور بہت عرصے بعد ان کی تحریر ردا میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آج کل ہر گھر میں رشتوں کے مسئلے اور جہیز کے لالچی لوگ عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک حساس موضوع پر قلم اٹھانے کا شکریہ۔ ناولٹ میں جویریہ بانو نے کیا خوب صورت گاؤں کے کلچر کی منظر نگاری کی اور کیا خوب صورت انسانی جذبات و احساسات کو بیان کیا۔ پارسا کے آخر کے ڈائیلاگ میری آنکھ نم کر گئے۔ بسمہ احمد پہلی بار ردا میں شامل ہوئیں مگر کمال تحریر کے ساتھ ویل ڈن۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی تو سب ہی نے بہت اچھا لکھا۔ خاص کر ایقان علی، نظیر فاطمہ، عائشہ ذوالفقار کے افسانوں میں معلومات، ماریہ یاسر کے افسانے میں مدد کا جذبہ بہت ہی اچھی تحاریر تھیں مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دلچسپ رہے۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

افشاں علی ــــــ کراچی

محبتوں و چاہتوں کی ہواؤں میں دعاؤں کی سرگوشیاں اور مسکراہٹوں کے ہمراہ خوشیاں لیے سندیسے کی پربہار و پررونق محفل میں افشاں بکھیرنے کے لیے افشاں علی حاضر محفل ہے۔ ہردلعزیز صالحہ آپی پیاری سی نورین سمیت میری تمام پیاری پیاری سی قارئین بہنوں کو سلام محبت قبول ہو۔ سال نو کے ہمراہ موسم سرما کا بھی بالآخر آغاز ہو چلا (کراچی میں) ایسے سرد سرد سے موسم اور ٹھنڈی ہواؤں میں گرما گرم سوپ بھاپ اڑاتا کافی کا مگ اور مونگ پھلیوں کے ہمراہ اپنا من پسند ڈائجسٹ ہو تو اس سردے موسم کا بھی مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اب بات ہو جائے جنوری کے سردے موسم میں اپنے من پسند ڈائجسٹ کی۔ روشن و نکھرا نکھرا سا سرورق دل کو بھایا۔ ”گوشہ آگہی“ میں ہمیشہ کی طرح صالحہ آپی کے قلم سے بکھرے موتیوں جیسے الفاظ روشن نظر آئے۔ آپ کے یہ منفرد سے الفاظوں سے سجا گوشہ آگہی ہمیشہ دل کو چھو جاتا ہے۔ محبتوں کا احساس لیے خوب صورت سا ناول ”مجھے چاہت تمہاری ہے“ سباس آپی، بہت اچھا لکھا آپ نے۔ دونوں ناولٹ بھی اپنی اپنی جگہ خوب رہے۔ ”پارسا“ کا کردار بہت پاور فل تھا جب کہ بسمہ احمد نے بھی اچھا لکھا۔ افسانے وہ بھی اتنے سارے اس بار کا سال نو نمبر بلاشبہ افسانہ نمبر رہا۔ ایقان علی کا انداز بیان بہت زبردست لگا۔ ان کا افسانہ ”روایت ہے“ مختصر مگر جان دار لفظوں سے نمایاں نظر آیا۔ منظر کشی سے لے کر الفاظ تک سب بہت اچھے لگے۔ حب الوطنی کے جذبے سے چُور عائشہ ذوالفقار کا افسانہ پڑھ کر پاکستانی ہونے پر فخر کے ساتھ ساتھ اسے گندہ کرنے والوں پر بھی شدت سے افسوس ہوا۔ ”تربیت“ پیاری سی ثناء کنول نے مختصر پیرائے میں بہت اہم سبق دیا۔ واقعی اعتبار اعتماد کی دلیل ہے۔ فرح ناز رفیق آپ نے بھی اچھا لکھا خاص کر آخری پیراگراف۔ دانیہ آفرین کا نام کافی عرصے بعد پڑھنے کو ملا ردا میں۔ مختصر افسانے کے ساتھ مختلف موضوع کے ہمراہ بہت اہم پہلو سے روشناس کرایا آپ نے۔ ایک اچھی تحریر ہمیں پڑھنے کو دی۔ اس کے علاوہ ماریہ یاسر، سعدیہ اقبال، مہرین کنول، حنا اصغر، نظیر فاطمہ بھی نے اچھا لکھا۔ اب بات ہو جائے اس ناول کی جو کافی ماہ تک ردا کی جان بنا رہا اور پھر اختتام پذیر ہو چلا۔ محبتوں و چاہتوں سے گندھی پیار کی برسات میں بھیگی خوب صورت کرداروں سے تجی منفرد سی تحریر اپنے پیارے سے ٹائیٹل کے ساتھ یادگار نقوش چھوڑتی اختتام پذیر ہوئی اس خوب صورت سے ناول کو اتنے اچھے انداز میں اختتامی موڑ دینے پر نائیلہ طارق آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ جب کہ شازیہ آپی کا ناول بھی خوب جا رہا ہے اور عائشہ ذوالفقار کا نوک جھونک سے بھرا مسکراہٹ لاتا ناول بھی زبردست جا رہا ہے۔ باقی تمام سلسلے خوب رہے۔ سندیسے کی محفل تو ہمیشہ بارونق اور خوب سے خوب تر ہوتی ہی ہے۔ میری تمام بہنیں جو وقتاً فوقتاً مجھے یاد کرتی ہیں ان کی محبتوں، دعاؤں کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ معذرت کے ساتھ کچھ نجی مصروفیت کے باعث اس بار سندیسہ طویل نہیں لکھ پائی ہوں۔ انشاء اللہ اگلی بار سبھی کو مخاطب کرتے ہوئے طویل سندیسے کے ساتھ حاضر محفل ہوں گے تب تک کے لیے اپنی دعاؤں میں ہمیں شامل رکھیے گا!

فرح ناز محمد رفیق ــــ کراچی

السلام علیکم! تمام قارئین کو پیار بھرا اسلام۔ عانیہ، قمروش، نائیلہ، شازیہ، افشاں ہمیشہ کی طرح نام سب کے یاد ہیں مگر لسٹ لمبی ہو جائے گی۔ سب کو بہت سارا پیار تعریفیں کچھ لیٹ بس مگر مصروفیات بھی بہت ہیں تو معذرت کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ نائیلہ صاحبہ یہ مولا جٹ ٹائپ ہیروئن آپ ہی لا سکتی ہیں آپ کی اسٹوری کا نام میرے لیے کچھ یوں ہے کہ جو عارش پر خرمن بیتی وہ عارش ہی جانے اور قمروش خدارا اتنا رومینس لگتا ہے ژالے کا کردار آپ پر پورا اترتا ہے۔ شکر ہے میرے بے ہوش ہونے سے پہلے آپ نے ہاتھ ہلکا کر دیا مگر قسم سے بہت مزہ آیا دل خوش کر دیا۔ شازیہ جی پلیز یہ حسنی کی لڑائی تو کچھ آگے بڑھائیں آپ کا لکھا اشہد کمال جیسا کچھ پڑھنے کو دل بے تاب ہے۔ اب بات کی جائے شمائلہ دلعباد کی تو ویل ڈن

بہت عرصے بعد اتنے لائٹ موضوع پر اتنا اچھا لکھا شاعری سے سجا حسین ناولٹ دل خوش کر گیا ویل ڈن یہ قلم اب رکنے نہیں پائے اس طرح کی کاوش قفس زدہ ماحول میں بادِ نسیم ہوتی ہے ویل ڈن اگین۔ نام لے کر کیا کہیں سب کے انداز منفرد اور بھرپور ہیں میری مصروفیت ہر ماہ اجازت نہیں دیتی مگر ایسا نہیں ہے کہ کچھ بھی چھوڑ دیا جائے ردا کے تو میں اشتہار تک پڑھتی ہوں بیوٹی پارلر کا تو نمبر بھی یاد ہو گیا ہے۔ روشنی فیصل سے پوچھنا ہے کہ آپ ردا کے علاوہ بھی کہیں لکھتی ہیں کیونکہ میرا مطالعہ خاصا وسیع ہے ایسی کوئی ڈائجسٹ نہیں جو ہر ماہ نظر سے نہ گزرتی ہے۔ سو بتائیے گا۔ آخر میں دعاؤں کی طالب ہوں، بہت سارا پیار سب کے لیے۔

گیتی آراء ــــــ کراچی

پیاری آپی اور نورین السلام علیکم بعد از سلام آپ کو، نورین کو اور ردا کے تمام قارئین اراکین اور رائٹرز کو عید میلاد النبیؐ اور نئے سال کی دلی مبارک باد۔ اللہ آپ سب کو ہم کو ایسی ڈھیروں خوشیاں دیکھنا اور گھڑیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔ پیاری آپی! آٹھ جنوری کو نئے سال کا نیا ردا ملا یکدم ہی مرجھائے چہرے پر بہار سی آ گئی۔ نینا اپنے سرخ و سفید حسن و جمال اور گرین سوٹ کے ساتھ دل میں اتر گئیں اور پھر "گوشۂ آگہی" کی سحر انگیز باتوں سے گزر کر آگے بڑھے تو "ردائے جنت" کی دینی باتیں دین کی شمعیں روشن کر گئیں۔ سلسلے وار ناول میں شازیہ، نائلہ اور عائشہ نے مہینے بھر کا انتظار ختم کر کے پھر اگلے ماہ کے لمبے انتظار کے لیے بے تاب و بے چین کر دیا۔ مکمل ناول اور ناولٹ بھی میدان مار گئے۔ افسانوں میں ایقان علی کی "روایت ہے" روایت ہی ٹھہری۔ عائشہ نے "سال نو کی آخری شام" میں ہمارے پاکستان کو اللہ کی بخشی ڈھیروں نعمتوں کو منٹوں میں انگلی پر گنوا دیا، واہ! ماریہ یاسر کو "نئے سال کی نئی صبح" میں نادیہ کا نیو ایئر پارٹی کینسل کر کے غریب کی مدد کو اہمیت دینا اچھا لگا۔ "نیو ایئر پارٹی" مہرین کنول کی "نئی صبح" حنا کی "ہیپی نیو ایئر" اور "تربیت" بھی مختصر اور اصلاحی تحریریں تھیں۔ نظیر فاطمہ کی "نانی کی زبانی" اپنے اندر طنز و مزاح کا رنگ لیے ایک دلچسپ تحریر تھی۔ فرح کی "پاس وفا" خاصی دلچسپ اور منفرد تحریر اپنا تاثر چھوڑے بنا نہ رہ سکی۔ دانیہ کی "روشنی کا ایک نیا سفر" میں چھپا میسج بہت اہم تھا۔ واقعی اگر ہم سب منال کی طرح سوچ رکھیں اور اس کا کردار اپنا لیں تو یہ معاشرہ سدھر جائے۔ "ردا کی ڈائری" میں مہرین کنول، افشاں علی، سیدہ حبیب کا انتخاب اچھا رہا۔ "اس ماہ میں" اور "خوشبو" ہمیشہ کی طرح نمبر ون رہا۔ "ذرا پھر سے کہنا" میں بھی غزلیں نظمیں اچھی رہیں۔ "سندیسے" ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور پرلطف رہا۔ "دوستوں کے نام پیغام" میں فرزانہ حبیب کی شادی کا جان کر دلی خوشی ہوئی۔ ہماری طرف سے آپ کو دلی مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں۔ "کچن" میں تمام پکوان کے ساتھ ساتھ چائنیز سوپ زبردست رہا۔ "سنگھار" کی تمام ٹپس بہترین رہیں۔ خاص کر سردی کے سیزن کے لیے۔

ماریہ یاسر ــــــ کراچی

آداب عرض ہے۔ نورین اور صالحہ آپی امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ردا آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے جو دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے لیے مبارک باد قبول کریں۔ اس ماہ کا رسالہ بھی بہترین تھا۔ سباس گل نے اپنے مکمل ناول کے ذریعے اس میں مزید چار چاند لگا دیے۔ سباس جی میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ آپ کی کہانیاں بلاشبہ بہترین ہوتی ہیں۔ اس بار آپ کا مکمل ناول بہت خوب رہا۔ مجھے بہت ہی پسند آیا۔ بے شک آپ کمال کا لکھتی ہیں، ویلڈن۔ آپ کافی عرصے سے لکھ رہی ہیں جب کہ میں نے ابھی چند ماہ پہلے ہی لکھنا اسٹارٹ کیا۔ اس لیے ابھی ناتجربہ کار ہوں اگر آپ اپنی قیمتی تبصرہ "میری کہانی" کے بارے میں کر دیا کریں تو مزید بہتری ہو سکے گی۔ باقی قارئین سے بھی گزارش ہے کہ

اسی طرح تبصرہ کر کے اپنی قیمتی آراء مجھ تک پہنچاتے رہیے گا تاکہ میں مزید بہتری کر سکوں۔ جویریہ بانو کا ناولٹ بھی بہت خوب تھا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ میری کہانی پسند کرنے پر میں افشاں علی صبا عبدالغنی اور خاص کر گیتی آراء آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

رابعہ افضال خان ــــــ کراچی

ڈھیر ساری محبت، نیک تمناؤں دعاؤں اور خوب صورت سی مسکراہٹ سے سجا سلام صالحہ آپی، نورین ملک اینڈ ردا قارئین و رائٹرز کی خدمت میں حاضر ہے۔ امید واثق ہے کہ آپ تمام لوگ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہم سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں کی سوغات اپنے سنگ لائے اب آتے ہیں تبصرے کی جانب سرورق پر موجود نینا نے فوراً توجہ کھینچ لی۔ "گوشۂ آگہی" اور "ردائے جنت" میں بکھرے موتیوں کو سمیٹتے شازیہ جی کے ناول "تجھ کو مانگوں میں تجھ سے" پر آ کر رکے اور ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی ناول پڑھتے ہوئے ہمارے لبوں پر مسکراہٹ نے پہرہ جمائے رکھا۔ اختتام کی جانب رواں دواں آپ کا ناول بہت زبردست ہے۔ نائیلہ طارق "جو عشق میں بنتی وہ عشق ہی جانے" بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔ چل اڑ جا اب تیری باری عائشہ ذوالفقار کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ بالکل اپنے نام کی طرح سباس گل جی مجھے چاہت تمہاری ہے اتنے زبردست مکمل ناول کے ساتھ ردا میں شامل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "پارسا" جویریہ بانو کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ افسانے کی محفل میں ایقان علی، عائشہ ذوالفقار، سعدیہ اقبال، ماریہ یاسر، مہرین کنول، حنا اصغر، نظیر فاطمہ، فرح ناز رفیق، دانیہ آفرین، حورینہ سعد سب ہی نے بہت اچھا لکھا اور خوب رونق لگائی ہے تعلق اور ہی بسمہ احمد کا ناولٹ بالکل اپنے نام کی طرح تھا۔ "ردا کی ڈائری" سے شہلا گل سحر، افشاں علی کا انتخاب پسند آیا۔ اشعار سب ہی اچھے لگے۔ "اس ماہ میں" ریما نور رضوان کی غزل ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ش سے شوہر" ایس امتیاز احمد نے کیا خوب تبصرہ کیا۔ "خوشبو" میں ہر لفظ ہی خوشبو کی مانند مہکتا ہوا تھا۔ "ذرا پھر سے کہنا" میں سب کی شاعری لاجواب تھی۔ "سندیسے" کی محفل بھی خوب بارونق تھی۔ ڈیئر افشاں علی سندیسے کی پسندیدگی کے لیے جزاک اللہ پیاری ماریہ یاسر افسانے کے ساتھ ساتھ آپ کا تبصرہ بھی ہمیں پسند آیا۔ سوئیٹ سی صبا عبدالغنی میرا سندیسہ آپ کو پسند آتا ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو میری برتھ ڈے یاد تھی۔ میرے ساتھ ساتھ میری سسٹرز کو بھی آپ نے وش کیا قسم سے یار دل خوش ہو گیا۔ فریدہ فرید سندیسے کی محفل سے آپ کہاں غائب تھیں۔ آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ ڈیئر فرزانہ فرزین آپ کو شادی کی ڈھیر ساری مبارک باد اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں عطا کرے، آمین۔ کچن اور سنگھار ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھے۔ گیتی آرا جی کبھی ہم پر بھی نظر کرم فرمائیں۔ سندیسے کی محفل میں سب ہی نے خوب رونق لگائی۔ تفصیلی تبصرے کے ساتھ ثناء کنول اللہ دتہ آپ نے جو کسی اپنے کے نام پیغام لکھا بہت زبردست تھا۔ دل کو چھوتا ہوا آخر میں ردا کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اور نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہی اپنی دوست رابعہ افضال خان کو اجازت دیجیے، خدا حافظ۔"

صباء عبدالغنی ــــــ کراچی

سفرِ ردا کے سنگ چلنے والے خوب صورت، پُرخلوص اور محبت کرنے والے لوگوں اور شہزادیوں کو سلام الفت قبول ہو۔ السلام علیکم، سردیوں نے تو لگتا ہے کہ قسم کھائی ہے کہ شہرِ کراچی میں قدم نہیں رکھیں گی۔ اب اگر جنوری کے ردا کی بات کی جائے تو سرورق اچھا تھا۔ سب سے پہلے "گوشۂ آگہی" سے مستفید ہوئے۔ صالحہ اپیا آپ کی محنت کو نہ سراہنا زیادتی ہے جس طرح آپ، نورین ملک اور ردا کی

پوری ٹیم ردا کو سنوارتی ہے وہ بے شک قابلِ تعریف ہے۔ ردا اسٹاف کا ہر ایک ممبر ہمارے لیے خاص ہے۔ آپی آپ کا، نورین آپی کا اور ردا کے پورے اسٹاف کا بے حد شکریہ جو ہر ماہ ہمارے لیے ردا کو سنوارتے ہیں۔ ''ردائے جنت'' میں آداب کا بیان پڑھتے ہوئے نائیلہ طارق کے ناول کی طرف بڑھے۔ آخری قسط کے ٹائیٹل پر نظر پڑتے ہی حیرانی سی ہوئی۔ یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اینڈ ہو جائے گا۔ اینڈ بہت اچھا تھا۔ خرمن کے لیے عارش کا سرپرائز بے حد دلکش تھا، نائیلہ آپی! اتنے اچھے ناول کی کامیابی پر ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔ شازیہ مصطفیٰ! بلاشبہ آپ بہترین رائٹر ہیں اور آپ کا ناول بھی بہت عمدہ ہے ویلڈن۔ عائشہ ذوالفقار! آپ کی تحریر پسندیدگی کی سند پر براجمان ہے۔ آپ کی کہانی میں آپ کا تجربہ بول رہا ہے۔ یونیورسٹی اور جاب کے حوالے سے اتنا کچھ بغیر تجربے کے لکھنا ممکن نہیں ہے۔ حائقہ ارشد کا کردار اٹریکٹو ہے لیکن پلیز حائقہ کی شادی عمیر راؤ سے مت کروائیے گا، او کے۔ سباس گل! سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے ہمیں اپنی تحریر کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ کہانی بے حد اچھی اور متاثر کن تھی۔ ایک بات نوٹس کی ہے میں نے کہ آپ کی کہانیاں عموماً اعتبار کے حوالے سے ہوتی ہیں (ایم آئی رائٹ)۔ عیسٰی علوی سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی اور رابیل کے کردار نے بھی متاثر کیا، ویلڈن۔ اس ماہ کے دونوں ناولٹ مجھے بہت پسند آئے۔ جوریہ بانو! آپ کی تحریر دو دماغ پر نقش سی ہو گئی ہے۔ خالص گاؤں کا ماحول، کھیتوں کا منظر اور محبت و ایثار کی داستان سے بھرا ناولٹ ہر کسی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ویلڈن۔ اور ہاں اب غائب مت ہو جائیے گا۔ بسمہ احمد! آپ کی تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ مخمل کے نام اور معصوم سے کردار نے ایٹریکٹ کیا۔ آپ کی ردا میں شاید پہلی تحریر ہے اس لیے آپ کو دل سے ویلکم۔ اس بار افسانوں کی لمبی قطار ہماری منتظر تھی۔ ایقان علی! آپ کی تحریر میری نظر میں ٹاپ پر تھی۔ آپ کو تو میں ہر بار سینئر رائٹرز کی لسٹ میں سرفہرست رکھتی ہوں۔ بے شک آپ کی تحاریر قابلِ تعریف ہوتی ہیں۔ عائشہ ذوالفقار! وطن کی محبت سے بھرا آپ کا افسانہ دل کو چھو گیا۔ اگر ہمارے ملک میں برائیاں ہیں تو اچھائیاں بھی موجود ہیں۔ آپ کی اس تحریر کے لیے میں آپ کو بہترین لکھاری کا اعزاز دیتی ہوں۔ سعدیہ اقبال! آپ کی کاوش بہترین تھی۔ ماریہ یاسر! آپ کی یکے بعد دیگرے تینوں افسانوں نے مجھے متاثر کیا۔ ردا میں ہر ماہ اپنی تحاریر کے ذریعے روشنی بکھیرتے رہیے گا۔ مہرین کنول! آپ کا نام ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ افسانوں میں آپ کا نام دیکھ کر ہی تجسس ہوتا ہے کہ اس بار کس طرح کا افسانہ لکھا ہو گا۔ اس بار کی آپ کی تحریر نے متاثر کرنے اور پسندیدگی کی سند حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حنا اصغر! آپ کی ردا میں پہلی شرکت ہے اس لیے آپ کو خوش آمدید۔ آپ کی کہانی بہترین تھی۔ کہانی کا ہر کردار پرفیکٹ تھا ویلڈن۔ نظیر فاطمہ! آپ کو بھی ردا میں خوش آمدید مزاح سے بھرپور آپ کی تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ ویری ویری گڈ۔ فرح ناز! آپ کی تحریر اس بار تھوڑی چینج تھی (یعنی ہر بار کی طرح وطن کے متعلق نہیں تھی)۔ لیکن یہ چینجنگ پسند آئی۔ بریرہ کا معصوم اور مظلوم سا کردار بہت پسند آیا۔ دانیہ آفرین! آپ کی تحریر بے حد خوب صورت تھی۔ آپ کی تحریر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ منال کا کردار بہت اسٹرونگ تھا ایسے کردار ایٹریکٹ کرتے ہیں۔ حورینہ سعد! ردا فیملی میں آپ کو دل سے ویلکم۔ ویسے آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ آگے بھی اپنا سفر ردا کے سنگ جاری رکھیے گا۔ ثناء کنول! بے شک اولاد کی تربیت ماں باپ کا اہم فریضہ ہے۔ آپ کی کہانی اور لفظوں نے سیدھا دل پر اثر کیا اور کہانی تو ہمیشہ وہی اچھی ہوتی ہے۔ جو دل پر اثر کر جائے۔ ''ردا کی ڈائری'' میں شائستہ جواد، مہرین کنول، افشاں علی، فرزانہ حبیب، شمائلہ دلعباد اور شہلا گل سحر کے انتخابات پسند آئے۔ ''اس ماہ میں'' ہر بار کی طرح بہترین تھا۔ ''خوشبو'' میں ایم جے قریشی صاحبہ کی نظم اور دعا بے حد پسند آئی۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سبھی کی شاعری متاثر کن رہی۔ ''سندیسے'' کی محفل ہر بار کی طرح ردا کی دلکشی میں اضافی کرتی نظر آئی۔ افشاں علی! میں آپ سے اور اپنی تمام دوستوں سے ناراض نہیں ہو سکتی لیکن ہاں ایک شرط پر معاف کروں گی۔ Next time نہ سوری، نہ تھینکس او کے۔ ماریہ یاسر! سندیسے میں آپ کی شرکت جاندار تھی اور پلیز ڈونٹ بی فارمل۔ آپ کی تحریر قابل تعریف تھی اس لیے میں نے تعریف کی۔ صبا عبدالغنی کا سندیسہ تو ردا کی جان ہے (ہاہاہا آپ لوگوں کا کیا خیال ہے)۔ رابعہ افضال خان! آپ کے شرارتی انداز نے میرے لبوں پر مسکان سجا دی۔ گیتی آرا! ہم سب دوست کہاں ہیں۔ ہم سب تو فیملی ہیں۔ پیاری کی ردا فیملی سے جڑے ہوئے تو ہیں آپس میں مگر پھر بھی کبھی کبھی اپنی یاد دلانی پڑتی ہے۔ اب بھول مت جائیے گا۔ ''دوستوں کے نام پیغام'' میں سارے پیغام اچھے تھے۔ پیاری فرزانہ حبیب! شادی کی ڈھیروں مبارک باد قبول کیجیے۔ دعا ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ اور ہاں جلدی سے اپنی شادی کا احوال ہم سے شیئر کیجیے۔ صالحہ آپی! آپ سے ایک گزارش ہے کہ فرزانہ حبیب کی شادی کی کلر فل تصویر شائع کیجیے گا۔ نگہت توقیر! آپ کی بہن کو میری طرف سے بھی سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔ عانیہ نیازی! آپ کے اور میرے احساسات Same ہیں کیونکہ میں بھی ایک ادنٰی سی قاری ہوں کوئی رائٹر نہیں پھر بھی ردا کے توسط سے اتنی عزت ملی ہے۔ ویسے کیوں ناں ہم دونوں ردا میں کوئی کہانی لکھ کر تمام دوستوں کو سرپرائز دیں۔ (ہے ناں زبردست آئیڈیا؟) شہلا گل سحر صالح! آپ پچھلے منتھ کہاں غائب تھیں۔ آپ کا پیغام ردا کے نام بہت خوب صورت ہے۔ فریدہ فرید کی طرح میرا بھی خیال ہے کہ ردا فیملی میں آپ کو گل جی کے نام سے پکارا جائے تو بہت اچھا لگے گا۔ رابعہ افضال! اتنی ڈھیر ساری دعاؤں اور چاہتوں کے لیے جزاک اللہ۔ آئندہ بھی پیغام میں یاد رکھیے گا او کے۔ فرزانہ حبیب! بہت خوب صورت پیغام تھا آپ کا۔ اتنے خوب صورت دعائیہ شعر کے لے جزاک اللہ۔ ثناء کنول! آہم آہم اتنی خوب صورت اور رومینٹک غزل کس کے لیے بھیجی ہے بھئی۔ ضرور یاسین بھائی کے لیے ہے ناں؟ ریما نورا! آپ کے لیے تو بس ایک دعا ہے کہ آپ اور آپ کے ہسبنڈ کے بیچ میں پیار اور محبت یونہی قائم رہے، آمین۔ ''کچن'' میں فش کی ڈشز بے حد لذیذ لگیں۔ ''سنگھار'' میں موجود ٹپس بھی بہترین تھیں۔ پیاری دوست و بہن کو دیں اجازت، انشاء اللہ اگلے منتھ پھر ملاقات ہو گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔''

سعدیہ اقبال ــــــ کراچی

السلام علیکم! پیارا ردا اینڈ اسٹاف امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے سب سے پہلے میں ردا اور تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ میری تحریریں ردا کے صفحات کا حصہ بنیں۔ صالحہ جی کا بے حد شکریہ۔ ساتھ میں ایک اور عرضی ہے کہ افسانے تو کافی ارسال کر چکی ہوں اب مجھے مکمل ناول لکھنے کی اجازت دیجیے میں بہت کچھ ردا کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ نورین جی اب جلد میرے ناولٹ کا بھی نمبر لے آئیے اور جتنی بھی شاعری میں نے ردا کو ارسال کی وہ میری خود کی کاوش ہے امید ہے آپ سب کو پسند آئے گی۔ میری دعا ہے خدا پاک ردا کو ترقی مزید کامیابی عطا کرے۔ ردا میرے سکون کا ذریعہ ہے۔ اس کو پڑھتے پڑھتے دنیا سے بیگانی ہو جاتی ہوں۔ صالحہ جی اور تمام اسٹاف کے لیے نیک دعائیں تمنائیں۔ اب اجازت دیجیے، اللہ حافظ۔

......☆......

دوستوں کے نام پیغام

نینا علی کے نام

میری لولی اور پیاری نیناں علی تمہیں تمہاری شادی کی ڈھیروں مبارک باد خدا کرے کہ تم ہمیشہ خوش رہو اپنے پیا کے سنگ اور علی بھائی تمہارے لیے بہترین ہمسفر ثابت ہوں، آمین۔

رامین خالد۔ گجرات

S.R گروپ کے نام

ہاں تو میری چلبلی اور شرارتی فرینڈز کیسی ہو؟ ہوپ سو مزے میں ہو گی اور سردیوں میں ڈرائی فروٹ کے مزے لے رہی ہوں گی۔ جی تو یہ آپ کے گروپ کی سب سے کیوٹ پرسنز تم سب لوگوں کو نیو ایئر کی ڈھیروں مبارک باد دیتی ہے اور ہیپی ویلنٹائن ڈے خوش رہو میرے ساتھ بھی اور میرے بعد بھی ہم سب کا یہ ساتھ سدا قائم رہے اور محبتوں کے یہ سلسلے یونہی رواں دواں رہیں۔

عینی رحمٰن۔ لاہور

اپنے ہسبینڈ کے نام

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں
میرے دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں،
میری دھڑکنیں میری چاہتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں
میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں

تیرا قرض ہے میری زندگی
میری سانسیں تیری امانتیں

جان! آپ کا ساتھ آپ کا پیار میرے لیے زندگی کا حاصل ہے آپ کا ساتھ پا کر مجھے خود پر رشک ہوتا ہے، آپ کے ساتھ میری زندگی مکمل سی ہو گئی ہے۔ آپ کے سنگ یہ میرا پہلا ویلنٹائن ہے اور مجھے اپنے ردا سے زیادہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں لگا۔ آپ سے اپنی چاہت کے اظہار کا خدا آپ کو بہت سی کامیابیاں عطا کرے اور ہم یونہی محبتوں کے سائے میں چلتے رہیں۔

مسز احمد۔ کراچی

زندگی کے نام

یہ جو اک صبح کا ستارہ ہے
زندگی تیرا گوشوارہ ہے
اے مقدر کوئی حساب تو رکھ
کوئی جیتا ہے کوئی ہارا ہے
رفتہ رفتہ یہ ماجرا کھلا
دل کے سودے میں سب خسارہ ہے
کیسی افتاد پڑ گئی آخر
وقت گزرا نہیں گزارا ہے
عشق کے درمیان بھول گئے
کیا تمہارا ہے کیا ہمارا ہے
رنگ بھی کھل رہا ہے چاہت کا

کس نے منظر کو یوں سنوارا ہے
آنکھ بھرنے لگی ہے یادوں سے
شور دریا ہے چپ کنارہ ہے
یہ دبے پاؤں کون آیا ہے
کس کی آہٹ نے پھر پکارا ہے
یہ جو اک صبح کا ستارہ ہے

رابعہ منیر۔ سرگودھا

کسی مہربان کے نام

زندگی کی شاہراہ پر ٹکرانے والے کچھ مسافر ہماری سوچوں کا کچھ حصہ چپکے سے اپنے نام کر جاتے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا پھر یوں ہوتا ہے کہ گزرتے وقت میں کسی کے لہجے کا پیار، گفتگو کی شیرینی، سادگی اور آنکھوں کی چمک ماضی کے دریچوں سے جھانکتی ہے اور اپنے ہونے کا یوں احساس دلاتی ہے کہ ہم خود فراموشی پر سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں کر پاتے اور وقت گزرنے کے بعد ہمیں اس مہربان کی اہمیت اور قدر ہوتی ہے مگر جانے والے کب لوٹ کر آیا کرتے ہیں۔

اقصیٰ کنول۔ کمالیہ

حلیمہ فیاض کے نام

لفظ ''دوست'' سے جو صفات ذہن میں آتی ہیں ان سب کی عمدہ مثال تم ہو۔

ایک سچی مخلص سہیلی ہو تم
نازک سی البیلی ہو تم
ہر اک سے پیار کرتی ہو، ہر سو پیار بکھیرتی ہو
نایاب محبت کی مثال ہو تم
ہماری زندگی کا حصہ ہو تم
اک نہایت پیارا سا رشتہ ہو تم
معصوم مسکان، دلکش انداز، خوب صورت اخلاق
انمول مجموعہ صفات ہو تم

ڈھیر سارا پیار اور دلی تمنائیں اس پیاری کے نام جو پیا کو پیاری ہونے جا رہی ہے۔ ہماری اس خوب صورت سی ہائیٹ اور کیوٹ سی مسکان والی حلیمہ فیاض پردیسی ہونے والی ہے کیونکہ 2016ء میں بالآخر اس کو اس کا پرفیکٹ ہائیٹ میچ مسٹر رائٹ جو مل گیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس کی آنے والی زندگی اور یہ نیا رشتہ اس کے لیے خوشیوں، راحتوں، پیار و محبت سے بھرپور ہو۔ یہ ہمیشہ خوش، ہنستی مسکراتی، شاد و آباد رہے۔ خوشیاں ہمیشہ اس کے قدم چومیں اور پریشانیاں اس کے گھر اور اس کی زندگی سے میلوں دور رہیں۔ اس مخلص اور اچھے اخلاق والی معصوم جذبات سے بھی لڑکی کو اس جیسے ہی پرخلوص اور قدر دان لوگ ملیں جن سے اس کی زندگی سدا مہکتی رہے، آمین ثم آمین۔

مصباح مسکان رؤف، امینہ رؤف۔ جہلم

رضوان جی کے نام

تم ہمسفر، تم ہم راز ہو
میرے جیون کی بہار ہو
میرے جیون کا نکھار ہو
تمہیں پا کر زندگی مکمل ہوئی
تم ہمسفر تم ہی ہم راز ہو

ہسبینڈ صاحب رب العزت تمہیں ہمیشہ صحیح سلامت رکھے، آمین ہماری زندگی خوشیوں سے چاند تاروں سے سجی رہے۔ آمین۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

......☆......



کرسپی چکن

اجزاء

چکن : ایک کلو (درمیانے ٹکڑے کاٹ لیں)
انڈے : دو عدد (نمک مرچ ملا کر پھینٹ لیں)
میدہ : ایک کپ
نمک : حسب ذائقہ
پیپریکا : ایک چائے کا چمچ
خشک ساج : آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ کٹی ہوئی : آدھا چائے کا چمچ
لہسن، ادرک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ
آئل : فرائی کے لیے
سرکہ : دو کھانے کے چمچ
ہلدی پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

ترکیب: چکن کو دھو کر ایک پیالے میں ڈال لیں اس میں نمک، سرخ مرچ، لہسن، ادرک پیسٹ، سرکہ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر خوب اچھی طرح مکس کر کے دس پندرہ منٹ تک ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد گوشت کو چاول چھاننے والی چھلنی میں ڈال کر بیس پچیس منٹ کے لیے رکھ دیں تاکہ گوشت کا سارا پانی نتھر جائے۔ ایک پلاسٹک بیگ میں سیاہ مرچ پاؤڈر، پیپریکا، خشک ساج ڈال کر مکس کریں۔ گوشت کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے پہلے سے گرم آئل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کریں اور گولڈن براؤن ہونے پر نکال کر چکن پیپر پر رکھ کر اضافی تیل جذب کرلیں اسی طرح ایک ایک کر کے گوشت کے تمام ٹکڑوں کو کوٹ کرتے ہوئے ڈیپ فرائی کرلیں۔

فرائیڈ چکن

اجزاء

چکن ونگز : آدھا کلو
کوکنگ آئل : حسب ضرورت
لیموں کا رس : دو چمچ
مرچیں : ڈیڑھ کھانے کا چمچ
نمک : حسب ذائقہ
گرم مصالحہ : آدھا چائے کا چمچ
لہسن اور ادرک کا پانی : دو چائے کے چمچ
اجوائن : چٹکی بھر
تل : ایک چائے کا چمچ
بریڈ کرمز : ایک کپ
انڈے : دو عدد

ترکیب: ونگز کو اچھی طرح دھولیں تاکہ ان پر پر نہ لگے رہ جائیں۔ بعد ازاں تل، بریڈ کرمز اور انڈے کے علاوہ تمام مصالحہ جات لگا کر تقریباً دو سے اڑھائی گھنٹے تک فریج میں رکھ دیں۔ اچھی طرح میرینٹ ہو جائیں تو چولہے پر چڑھا کر کچھ دیر تک پکالیں۔ اس

کے بعد اتار کر ٹھنڈا کرلیں اور ایک ایک کر کے انڈے میں ڈبونے کے بعد بریڈ کرمز لگا کر رکھتی جائیں۔ آخر میں سب ونگز کے اوپر تل چھڑک دیں اور کڑاہی میں ڈال کر فرائی کرلیں۔ مزیدار چکن ونگز تیار ہیں۔

مٹن گرین کڑاہی

اجزاء

بکرے کا گوشت : آدھا کلو
نمک : حسب ذائقہ
لہسن کے جوے : چار سے چھ عدد
ادرک : دو انچ کا ٹکڑا
پیاز : ایک عدد
ٹماٹر چوپ کیے ہوئے : دو عدد
ثابت کالی مرچ : دس سے بارہ عدد
سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ
ہری مرچیں : چار سے چھ عدد
ہرا دھنیا : آدھی گٹھی
سویا (باریک کٹا ہوا) : ایک کھانے کا چمچ
دہی : آدھی پیالی
کوکنگ آئل : آدھی پیالی

ترکیب: ادرک، لہسن، پیاز، کالی مرچ، زیرہ، ہرا دھنیا اور ہری مرچوں کو موٹا موٹا پیس لیں اور اس میں دہی اور نمک شامل کرلیں اس مصالحے سے گوشت کو اچھی طرح میرینیٹ کرلیں۔ دو سے تین گھنٹوں کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑاہی میں کوکنگ آئل کو دو سے تین منٹ گرم کریں اور مصالحہ ملا ہوا گوشت ڈال کر ڈھک دیں۔ شروع میں تین سے چار منٹ آنچ تیز رکھیں۔ پھر درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت اچھی طرح گل جائے۔ آنچ تیز کر کے اتنی دیر بھونیں کہ آئل الگ ہو جائے۔ ٹماٹر اور سویا ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پانچ سے سات منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مٹن کڑاہی کا مزہ دوبالا کرنے کے لیے آپ اسے گارلک بریڈ کے ساتھ پیش کریں۔

فرائیڈ مٹر اور مرچیں

اجزاء

مٹر : ایک پاؤ
سبز پیاز : دو عدد
چینی : ایک چائے کا چمچ
سبز مرچیں : پچاس گرام
تیل : دو کھانے کے چمچ
نمک : آدھا کھانے کا چمچ

ترکیب: مٹر کو چھیل کر صاف پانی میں دھولیں۔ سبز مرچیں کاٹ لیں۔ گھی گرم کریں اور اس میں پیاز، سبز مرچیں ڈال کر پیاز فرائی کریں اب مٹر بھی ڈال دیں۔ تقریباً دو منٹ بعد چینی اور نمک بھی شامل کردیں۔ پانچ منٹ فرائی کریں نہایت لذت آمیز ڈش تیار ہے۔

سبزی کڑاہی

اجزاء

پھول گوبھی : آدھا حصہ
آلو : دو عدد
گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچ
پیاز : ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
ٹماٹر : تین درمیانے سائز کے
ادرک لہسن پیسا ہوا : دو کھانے کے چمچے
ٹنڈے : دو عدد
ہلدی : ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں : چار عدد
زیرہ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ

ادرک : ایک درمیانہ ٹکڑا
گاجر : ایک عدد
توری : ایک عدد
کُٹی لال مرچ : دو کھانے کے چمچے
نمک : حسب ذائقہ
دہی : آدھا پاؤ

ترکیب: ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور پیاز ڈال کر ہلکا گلابی رنگ ہونے تک فرائی کریں، پھر ادرک، لہسن پسا ہوا ڈال کر مکس کریں۔ ایک منٹ کے بعد کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر نمک، کُٹی لال مرچیں، ہلدی، زیرہ پاؤڈر اور گرم مصالحہ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور ساری سبزیاں ڈال دیں۔ مکس کر کے دہی بھی ڈال دیں اور تین چار منٹ تک بھونیں۔ پھر ہرا دھنیا اور کُٹی ہوئی ادرک ڈال کر مکس کریں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر دم پر پکالیں۔ تیار ہونے پر ہری مرچوں، ہرا دھنیا اور کُٹی ہوئی ادرک کے ساتھ پیش کریں۔

پھول گوبھی اور میتھی کی سبزی

اجزاء
پھول گوبھی : ایک کلو
گرم مصالحہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
لال مرچیں : ایک چائے کا چمچ
نمک : حسب ذائقہ
قصوری میتھی : ایک کھانے کا چمچ
تیل : پون کپ
سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ
ادرک (باریک کٹی ہوئی) : دو کھانے کے چمچ
ہلدی : آدھا چائے کا چمچ
ٹماٹر : دو عدد
سبز مرچیں : تین عدد
سبز دھنیا : پون گٹھی

ترکیب: ایک پین میں تیل ڈال کر زیرے کو ہلکا سا فرائی کریں۔ پھر چوپڈ ٹماٹر، میتھی، نمک، لال مرچیں، ہلدی، سبز دھنیا، کُٹی ادرک اور سبز مرچیں ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں۔ پھر کٹی گوبھی اور گرم مصالحہ ڈال کر ڈھک دیں اور ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ گوبھی گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو سبز دھنیا، سبز مرچیں اور کُٹی ہوئی ادرک ڈال کر کھانے کے لیے پیش کریں۔

مکس سبزی کے کوفتے

اجزاء:
آلو : آدھا کلو
شلغم : ایک عدد
پالک : چھ سات پتے
نمک اور سرخ مرچ : حسب ضرورت
ثابت دھنیا اور زیرہ : ایک چائے کا چمچ بھنا ہوا
کوکنگ آئل : حسب ضرورت تلنے کے لیے
مٹر : ایک پاؤ
گاجر : ایک عدد
ہری مرچیں : سات عدد
انڈا : ایک عدد

ترکیب: آلو، مٹر، شلغم کو ابال کر پیس لیں۔ پالک اور مرچیں باریک کاٹ لیں۔ گاجر کو کدوکش کر لیں اور تمام سبزیوں کو ملا لیں۔ پھر اس میں نمک و لال مرچ اور زیرہ ملا دیں۔ سب کو اچھی طرح مکس کر کے درمیانے سائز کے کوفتے بنائیں اور انڈا لگا کر کوکنگ آئل میں ہلکے براؤن ہونے تک فرائی کر لیں۔ پھر سالن والا مصالحہ بھون کر تھوڑا سا پانی ڈالیں اور کوفتے شامل کر کے ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر کے لیے دم دے دیں۔ لیجیے منفرد اور مزیدار سالن تیار ہے

......☆......

شہلا مشائق

سنگھار

داغ دھبوں سے پاک جلد

دھوپ، ناقص خوراک اور خراب صحت چہرے کی جلد کو متاثر کرنے کا سب سے اہم سبب ہیں، انسانی جلد حیرت انگیز حفاظتی ردعمل رکھتی ہے۔ جلد کی گہری اندرونی تہہ میں خلیے میلانین پیدا کرتے ہیں، جب ہم دھوپ میں آتے ہیں تو میلانین کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ عمل جب ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے تو جلد کی بیرونی تہہ میں آ جاتا ہے اور اس سے جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے جلد کو دھوپ سے بچانا چاہیے اور ایسی مصنوعات کا استعمال کرنا چاہیے جو جلد کو دھوپ کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں سن اسکرین کا استعمال انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی سن اسکرین کریم کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان میں کیمیائی اجزاء کی تعداد زیادہ نہ ہو۔ حسن و خوب صورتی کے ماہرین کے مطابق جلد کی حفاظت قدرتی مصنوعات سے کی جائے تو وہ نہ صرف جلد کے دھبوں کو ختم کرتی ہیں بلکہ اسے اندر تک صحت مند بھی بناتی ہیں۔ جلد کے لیے صندل کی لکڑی پر مشتمل سن اسکرین دھوپ سے تحفظ کے لیے مثالی ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جلد کی حفاظت کے لیے دوسرا اہم امر اس کی باقاعدگی سے کلینزنگ ہے۔ سن اسکرین خریدتے وقت ایسے برانڈ کا انتخاب کریں جس میں گلیسرین اور لیموں کا رس بھی پایا جائے، لیموں کے رس پر مشتمل فیس ماسک لگانے سے بھی جلد کی تہہ میں چھپا سارا میل باہر نکل آتا ہے اور جلد تر و تازہ رہتی ہے۔ اسی طرح خراب صحت اور ناقص خوراک بھی چہرے کی جلد کو بے رونق بنا دیتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اچھی خوراک کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ جلد کی قدرتی نمی کے لیے خون میں نمکیات اور وٹامنز کی مقدار برقرار رکھی جائے۔ پھل، کچی سبزیاں اور سلاد وغیرہ جلد کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ دن میں کم از کم تین گلاس جوس جلد کے لیے بہت مفید ہے۔ گاجر، سیب یا مالٹے اور کینو وغیرہ کا جوس جلد کو تر و تازہ اور صحت مند بنانے کے لیے ادویات اور میک اپ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

ہاتھوں کی دلکشی

ہاتھ انسانی جسم کا بہت ہی اہم اور نمایاں عضو ہے جس طرح چہرہ خوب صورت اور تر و تازہ رکھنے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں اسی طرح ہاتھ بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے یہاں کی اکثر خواتین چہرے کی خوب صورتی پر توجہ دیتی ہیں مگر ہاتھوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں جس سے ہاتھوں کی خوب صورتی اور دلکشی برقرار نہیں رہتی اور ہاتھ خشک اور کھردرے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ موسم خواہ گرم ہو یا پھر سرد

ہاتھوں کی حفاظت اور ان کی دیکھ بھال انتہائی ضروری ہے۔ ہاتھوں کے اردگرد تھوڑے سے نیم گرم تیل کی مالش کریں اور پھر اسے اچھی طرح صاف کرلیں تاکہ چکنائی کا نام ونشان باقی نہ رہے پھر ہائیڈروجن پر آکسائیڈ کے تین چمچ، امونیا کے ایک چمچ میں ملائیں اور مکسچر کو روئی کے ٹکڑے سے انگلیوں اور ہاتھوں پر لگائیں دو یا تین منٹ کے بعد ہاتھوں کو دھو کر خشک کرلیں اگر آپ کے ہاتھ خراب ہیں اور آپ ان کو نمایاں کرتے وقت احساس کمتری کا شکار ہورہی ہیں تو تھوڑی سی توجہ سے آپ کے ہاتھ خوب صورت بن سکتے ہیں کیونکہ ہاتھوں کی خراش تراش کی جائے تو ان کی خوب صورتی کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اپنے ناخنوں کو بھی صاف ستھرا رکھیں اور تراشتے وقت سب سے پہلے شفاف بیس کوٹ ناخنوں پر لگائیں جب یہ خشک ہو جائے تو پورے ناخن کو یا تو شفاف یا پھر قدرتی گلابی رنگ کی نیل پالش دیں اور ناخنوں کے صرف سامنے والے سرے پر لگائیں۔ جب یہ خشک ہوجائیں تو قدرتی گلابی رنگ کی نیل پالش استعمال کریں۔ سونے سے قبل اپنے ہاتھوں پر کریم لگائیں۔

ہاتھ اور پاؤں خراب ہونے کی وجوہات

☆ ہاتھوں اور پاؤں کی مکمل صفائی نہ کرنے کی وجہ سے ہاتھوں اور پاؤں میں لکیریں پڑجاتی ہیں۔

تنگ جوتا پہننے سے بھی پاؤں سوج جاتے ہیں اور ان پر نشان پڑجاتے ہیں۔

☆ سردیوں میں ہاتھوں اور پاؤں پر خشکی آجاتی ہے اس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پھٹ جاتے ہیں اور ہاتھوں اور پاؤں کی رنگت کالی پڑ جاتی ہے۔

☆ بار بار دھونے سے بھی ہاتھ خراب ہو جاتے ہیں۔

☆ جوتا ہمیشہ آرام دہ استعمال کریں۔

بال خوب صورت ملائم رکھنے کا طریقہ

☆ کھل سے سر دھوئیں۔ سرسوں کی کھل کوٹ کر رکھ لیں۔ نہانے سے پہلے گرم پانی میں بھگو دیں اور پھر سر میں مل کر پانی سے دھولیں۔ بال نرم ملائم ہوجائیں گے۔

☆ آملے، ہریڑ، بہیڑہ ہم وزن لے کر کوٹ لیں۔ ایک گلاس گرم پانی میں سفوف ڈالیں۔ اس سے سر دھوئیں۔ بال خوب صورت رہیں گے۔

☆ سیکا کائی اور ریٹھے ہم وزن لے کر سفوف بنالیں جن کے بال زیادہ گھنے ہوں وہ یہ سفوف استعمال کریں۔

☆ لیموں کا رس تیل میں ملا کر جڑوں میں مالش کریں۔

☆ کلونجی پیس کر اس کے ساتھ سر دھوئیں۔ بال نرم وملائم ہوجائیں گے۔

چہرے کا میل صاف کرنے کے لیے

جو کے آٹے کے استعمال سے بھی چہرے کا میل صاف ہوجاتا ہے۔ تھوڑے سے آٹے میں چند قطرے زیتون کا تیل اور آدھا چمچہ شہد ملائیں۔ اس میں تھوڑا سا پانی ڈالیں اور پھر اس آمیزے کو چہرے پر خوب مل لینے کے بعد پانی سے منہ کو دھولیں۔ جو کا آٹا بازار سے باآسانی مل جاتا ہے اور آپ گرائنڈر میں ثابت جو پیس بھی سکتی ہیں۔ اس آمیزے میں لیموں کے عرق کے چند قطرے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے بھی میل صاف ہوجاتا ہے۔ ☆☆